فیض احمد فیض کی اردو غزل گوئی

ایک تنقیدی جائزہ

تحقیقی مقالہ برائے ڈی۔ فل ڈگری

شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی

الہ آباد

سنہ ۱۹۹۲ء

نگراں
ڈاکٹر ظل حسنین عابدی
سابق ریڈر شعبۂ اردو
الہ آباد یونیورسٹی

مقالہ نگار
اسامہ جعفری

بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی

تمہارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

فہرست

باب نمبر	عنوان	صفحہ
	ابتدائیہ	۱
۱۔	مختصر سوانح حیات فیض احمد فیضؔ	۲۴
۲۔	فیضؔ کی شاعری کا پس منظر	۴۵
۳۔	اردو غزل کی مقبولیت اور جدید اردو غزل	۹۵
۴۔	فوجی ملازمت اور اس کے اثرات	۱۴۳
۵۔	فیضؔ کی شاعری کے سرچشمے	۱۶۵
۶۔	شعری مجموعوں کا نقد و تبصرہ	۱۹۱
	نقش فریادی	۱۹۱
	دست صبا	۲۱۶
	زنداں نامہ	۲۳۶
	دست تہ سنگ	۲۶۵

باب نمبر	عنوان	صفحہ
	سرِ وادیٔ سینا	۲۸۳
	شامِ شہرِ یاراں	۲۹۹
	مرے دل مرے مسافر	۳۱۶
	غبارِ ایام	۳۳۳
۷۔	فیض کے ہم عصر چند ممتاز غزل گو شعراء	۳۴۵
۸۔	اردو غزل میں فیض کی انفرادیت و مقام	۴۰۹
	منابع و مآخذ	۴۳۹

ابتدائیہ

فیض احمد فیض کا جب بھی دھیان آتا ہے میں ہمیشہ یہی سوچتا ہوں کہ یہ میری بڑی خوش نصیبی ہے کہ مجھے ایسے شاعر کے کلام اور اس کے متعلق بہت ساری باتوں کے مطالعہ کا موقع ملا، جس کی شرافتِ نفس، شرافتِ ذہن، شرافتِ زبان و خیال نے ذہن کو ہمیشہ بے حساب جلا بخشی۔ اسی شاعر کے سبب میں سوشلسٹ تحریک سے بھی متعارف ہوا اور ان حالات میں کہ جب طرح طرح کے تند و تیز طوفان اسی تحریک کے خلاف اٹھتے رہے اور ہمارے ماحول کو تیرہ و تار کرتے رہے، یہ شاعر ہمیشہ بطور ایک مینارۂ نور بن کر ہمارے دل و دماغ کو روشن کرتا رہا۔ مثال کے لیے یہی اشعار ملاحظہ فرمایئے جو صرف شعریت ہی نہیں بلکہ غضب کا شعور، زبردست یقین اور سماج کے گہرے تجربات پر مبنی ہیں، ساتھ ہی اپنے اندر بے مثال نیا سائنٹفک مزاج بھی رکھتے ہیں۔

ستم سکھلائے گا رسمِ وفا ایسے نہیں ہوتا
صنم دکھلائیں گے راہِ خدا ایسے نہیں ہوتا

ہر اک شب ہر گھڑی گزرے قیامت یوں تو ہوتا ہے
مگر ہر صبح ہو روزِ جزا ایسے نہیں ہوتا
رواں ہے نبضِ دوراں، گردشوں میں آسماں سارے
جو تم کہتے ہو سب کچھ ہو چکا ایسے نہیں ہوتا

سائنٹفک، معاشی، سماجی و سیاسی مادّی جدلیاتی و تاریخی شعور اور ایسے تمام مسائل سے وابستہ طرح طرح کے افکار و خیالات کو کیسے اس نے شاعرانہ جذبہ کی زبان بخشی اور ایک پورے دور کی تاریخ اور اس کی سماجی اتھل پتھل کو کیسے اس نے تابع فن کیا یہ یقیناً فیضؔ کی ایک نہایت حیرت انگیز خصوصیت محسوس ہوتی ہے۔ ایسی ساری باتوں کو نظموں تک ہی میں نہیں بلکہ تنگنائے غزل، میں سمو سکنا یقیناً فن و فنکاری کا اعجاز ہے نظم کی وسیع و عریض زبان میں علامہ اقبالؔ نے حادثاتِ عالم کو کامیابی کی معراجِ کمال کے ساتھ گویائی بخشی ہے جس کے بارے میں موصوف نے خود بھی کبھی کبھی اظہار بہ اصرار کیا ہے۔

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینہ ادراک میں ہے

میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
اسی ثمر سے ہے لالہ فام پیدا کر

اقبالؔ کے اس اہم پیام کو فیضؔ نے تہِ دل سے قبول کیا اور اسے مقدور بھر آخری نفس تک آگے بڑھاتے رہے۔

بیشک گہرے تاریخی حادثات اور واقعات کو سمجھ سکنا اور انھیں زبان عطا کر سکنا عظیم شاعر اور پیغمبرانِ ادب کا ہی کام ہے۔ روس میں جب ۱۹۱۷ء میں واقعۂ عظیم رونما ہوا تو دنیا کے حکمراں طبقوں نے جہاں اسے فسق و فجور، چوری ڈکیتی، مظالم و درندگی، مکاری و بدکاری اور فتنہ و فساد وغیرہ پر مبنی و منحصر نظام بتایا وہیں دنیا میں ایسے لوگ بھی رہے جنھوں نے عوامی زبان میں اسے اکتوبر انقلاب، اکتوبر کرانتی اور عظیم اکتوبر انقلاب وغیرہ جیسے القاب سے یاد کیا اور مشہورِ عالم مصنف جان ریڈ نے اسے 'TEN DAY'S THAT SHOOK THE WORLD' کے نام سے جانا اور اس کی اہمیت کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا۔

بہر حال اس وقت دنیا میں کتنے شاعر و دانشور ایسے تھے جو اس واقعۂ تاریخی کی گہرائیوں، پہنائیوں کی اہمیت اور اس کے رموز کو سمجھ سکنے کی صلاحیت و اہلیت رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے معدودے چند ہی تھے اور زبانوں کے مقابل کم عمر اردو شاعری اس لحاظ سے بھی خوش نصیب ہے کہ جہاں اس نے انیسؔ و غالبؔ ایسے آفاقی شاعر پیدا کیے وہیں اس نے اس زمانے میں اقبالؔ ایسا آفاقی شاعر بھی پیدا کیا جس نے اس تاریخی واقعہ کو لبیک کہا۔

آفتاب تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ٹوٹے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

اقبال ایک مقصدی شاعر تھے اقبال کی شاعری مقصدی ہے۔
خود علامہ کے بقول :-

نغمہ کجا و من کجا ساز و سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

بہر حال اقبال نے لیگ آف نیشنس (League of Nations)
حقوق انسانی (Human rights) بین الاقوامی قوانین (Inter national
law) جیسے مسائل کو بھی اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔ ان پر خاصا تبصرہ
بھی کیا، ان کا احساس مندرجہ بالا مضامین و معاملات کے سلسلے میں
یہی تھا کہ :-

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات !

فرنگی چال بازیوں اور جارحیت پر بھی اقبال گاہے بگاہے تبصرہ
کرتے رہے۔ مثال کے لیے ان کا یہی شعر ملاحظہ فرمائیے۔

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

دیئے سے ہمیشہ دیا جلتا رہا اس لحاظ سے حسرت موہانی نے بھی غزل کے دامن کو بہت وسیع کیا۔ جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے انھوں نے اپنے سارے محسوسات، جذبات و خیالات غزل کی صورت میں پیش کیے بطور ثبوت یہ چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

عشق حسرت کو ہے، غزل کے سوا
نہ قصیدہ نہ مثنوی سے غرض

کہتا ہوں مرثیہ نہ قصیدہ نہ مثنوی
حسرت غزل ہے صرف مری جانِ عاشقاں

عشق نے جب سے کہا حسرت مجھے
کوئی بھی کہتا نہیں فضل الحسن

ظلم کے خلاف تیکھا اور بھرپور جہاد حسرت کے خمیر میں تھا۔ چنانچہ وہ اندرونی و بیرونی ظالمانہ طاقتوں اور ان کی مکاری، چالبازی،

سیاسی رہنماؤں کے خلاف ہمیشہ نبرد آزما رہے۔ انھوں نے آزادی کامل کی بات کھل کر کہی اور اس کی تحریک کو وہ برابر آگے ہی بڑھاتے رہنے میں ممد و معاون رہے، چنانچہ انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ انگریزی و امریکی گٹھ جوڑ کے خلاف ہمیں روس کی طرف مائل ہونا چاہیئے اور روس سے ہمدردانہ رویّہ رکھنا چاہیئے۔

غرض ہندوستان کی جنگ آزادی کا یہ سورما ایک طرف تو دہشت گردی اور جبر کے خلاف دہاڑتا اور للکارتا تھا اور دوسری طرف اپنی باتوں کو نرم، نازک اور ہلکے پھلکے انداز میں بھی پیش کرنے پر قادر تھا۔

تصوف آپ کا مذہب سوشیت آپ کا مسلک
مگر اس پر بھی حسرت کی غزل خوانی نہیں جاتی

شاعر انقلاب جوشؔ ملیح آبادی یا بقول خود "جوشؔ اعظم" نے دور کے محسوسات کو اکبرؔ، شبلیؔ و چکبستؔ سے زیادہ ہی محسوس کیا۔ "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب" ایسی نظمیں بھی کہیں۔ اپنی غزلوں میں بھی وہ ایسے ہی احساسات و خیالات کو پیش کرتے رہے۔

اپنی اہانتوں کا کچھ احساس کر سکیں
استادوں میں جذبۂ غیرت کہاں ہے جوشؔ

یہ جنگ کیا ہے ایک مجسم جنون ہے
گلزارِ کائنات کے تھالوں میں خون ہے

جوشؔ سوشلزم کی تحریک کے تا آخر عمر زبردست حامی رہے۔ اس لیے اس تحریک سے متعلق باتوں کو وہ نظم، غزل، غزل مسلسل، غزل غیر مسلسل، اور قطعہ و رُباعیات وغیرہ جیسی سبھی اصناف میں پیش کرتے رہے۔

قطرے کو قلزم کر دکھانے کا جوشؔ کو جو ملکہ حاصل ہے اس کے آگے فیضؔ بھی سر جھکاتے نظر آتے ہیں کہتے ہیں۔

"ان میں خاص قسم کا جو ایک دفور اور ایک خاص قسم کی قدرت کلام ہے اس سے تو مرعوب ہوئے بغیر چارہ نہیں لیکن وہ بہت پُر گو ہیں۔"[1]

سوشلزم کی کامیاب نظریاتی تبلیغ کی تصویریں جوشؔ کے یہاں بھی ملتی ہیں۔ جس واقعہ تاریخی کی طرف ہم نے شروع میں اشارہ کیا تھا اس مضمون پر براہ راست جوشؔ کے یہ اشعار بھی قابل دید ہیں۔

رواں ہے تیغ میری گردنِ غفلت شعاری پر
مرا دل خون ہے مزدور کی فریاد و زاری پر

---

[1] متاعِ لوح و قلم فیضؔ احمد فیضؔ صفحہ ۱۲۰

جھکے ہیں کشتِ دہقاں پر سرے اُمڈے ہوئے بادل

پتاں ہے برق میری گردنِ سرمایہ داری پر

جوشؔ نے موثر و کامیاب غزلیں بھی کافی تعداد میں کہی ہیں۔ ان میں سیاسی ڈھنگ بھی ہے۔ لیکن انقلاب ، سوشلسٹ تحریک ، سائنٹفک شعور کو غزل ایسی سبک گہر صنف میں ڈھال سکنا کیا امر محال ہو جاتا ہے یہ بات بھی غور طلب ہے۔

اس مرحلے میں فیضؔ نہایت نمایاں و ممیز نظر آتے ہیں۔ انھوں نے طبع حسرتؔ سے بھی خاص طور پر استفادہ کیا ہے۔ فیضؔ کا یہ خراج تحسین خود بہت بڑا ثبوت ہے۔ چند شعر "نذر مولانا حسرت موہانی" کے عنوان کی غزل سے درج ذیل ہیں۔

مر جائیں گے ظالم کی حمایت نہ کریں گے

احرار کبھی ترکِ روایت نہ کریں گے

شب بیت گئی ہے تو گزر جائے گا دن بھی

ہر لحظہ جو گزری وہ حکایت نہ کریں گے

یہ فقر دلِ زار کا عوضا نہ بہت ہے

شاہی نہیں مانگیں گے ولایت نہ کریں گے

ہم شیخ نہ لیڈر نہ مصاحب نہ صحافی
جو خود نہیں کرتے وہ ہدایت نہ کریں گے

اردو شاعری میں مارکسی تحریک جسے ہم نے فیض کا عشق قرار دیا ہے محض اس لئے نہیں چلتی رہی کہ یہ فیض یا ان کے جیسے کچھ دیگر سر پھرے شاعروں اور دانشوروں کی چاہت کی بات تھی، نہ ہی صرف اس لیے کہ ان کے محبوب رہنما نے "داس کیپٹل" لکھی بلکہ اس لیے کہ آج بھی ظلم و استبداد اور استحصال ہے، دلو آبادیاتی نظام کا وجود ہے، سخت نابرابری، اتھاہ غربت اور بے مکانی ہے۔ کلچر بے نام ونشان ہو رہا ہے۔ انسان دوستی و کلچر کی مخالف لہریں شباب پر چل رہی ہیں۔ ہٹلریت کے تابعدار جرمن وار منسٹر گوئرنگ نے جو یہ کہا تھا کہ کلچر کا نام آتے ہی میرا ہاتھ پستول کی طرف جاتا ہے اور پروپگنڈا منسٹر گوئبلز نے جو یہ کہا تھا کہ بار بار لگاتار جھوٹ کا پروپگنڈا کر کے اسے ہم 'سچ' ثابت کر دکھائیں گے۔

جوشؔ کے گویا الفاظ ہیں۔

ع اس جھوٹ کو حقیقت کبریٰ کہیں گے لوگ

غرض یہ کہ جب تک یہ بڑی صداقتیں اور بڑی حقیقتیں یعنی سچ اور جھوٹ کی طاقتیں برسر پیکار ہیں اور جب تک غلامی اور آزادی میں ہنگامہ آرائی ہے، جب تلک متواتر سامراجیت کے بادل ہمہ وقت

سروں پر منڈلا رہے ہیں، جب تک اس طرح کے ٹکراؤ (CLASHES) ہیں
یعنی جب تک وحشیانہ ظلم و جبر، بربریت و درندگی باقی ہے اس وقت تک
سوشلزم ایک لازمی حقیقت و ضرورت ہے۔

اس بات کو سمجھنے کے لیے ہمیں اپنی حالیہ عالمی تاریخ پر بھی نظر
ڈالنی ہوگی ایسی فسطائی طاقتوں کو شکست دینے کے لیے کیسے پرولتاریہ
کا ایک معمولی فرزند تک ایک چٹان بن کر کھڑا ہو جاتا ہے اور نازی عدالت
میں اس کے پُرزور الفاظ کیسے ایک مرحلے کے ترجمان ہیں جسے کم و بیش ایک
دنیا کو بھگتنا پڑا ہے۔ دیمتروف کہتے ہیں۔

'I am defending my self as an accused Communist.'

'I am defending my political honour my houenour as a revolutionary.'

'I am defending my communist Ideology and my Ideals'!

'I am defending the content and significance of my whole life. etc'

دیمتروف کے کام کو فیض بھی آگے ہی بڑھاتے ہوئے دکھائی

دیتے ہیں۔ فیضؔ نے استادی کے فرائض بھی ادا کیے لیکن ایک مقصد کے پیش نظر، انھوں نے اردو اور انگریزی میں صحافت نگاری بھی کی تو بھی ایک مقصد کے لیے اور جب براہ راست فوج میں رہے تھے جب بھی ایک مطمح نظر کے لیے جس کی خاطر انھیں افسرانِ بالا کی ڈانٹ ڈپٹ سے بھی دو چار رہنا پڑتا تھا۔ ایک بریگیڈیر نے کڑک کر فیضؔ سے پوچھا۔

" WHAT THE HELL YOU ARE TALKING ABOUT ; ITS ALL POLITICS ; YOU ARE GOING TO POLITICALISE THE ARMY." [1]

اور آخر کار جب وہ مارشل لا کے قیدی بنے اور جیل کی صعوبتیں جھیلیں تو بھی انھوں نے جو کچھ لکھا ایک مقصد ہی کے لیے لکھا۔ جو دیمتروفؔ کے مقصد سے بہت کچھ مماثل تھا، اس لیے راقم الحروف اس نتیجے پر پہونچتا ہے کہ راول پنڈی سازش کیس بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

بہر حال جیل میں رہ کر یا جیل سے باہر رہ کر فیضؔ نے بیشتر اپنے دور کے اجتماعی احوال، اجتماعی دکھ درد کو ہی اپنی شاعری کا محور بنایا۔ جو بار بار بیان کرنے پر بھی حسب دل خواہ بیان کی گرفت میں نہ آپایا۔ مافی الضمیر کی ترجمانی کے سلسلے میں کیسی مشکل پیش آتی ہے اس کی خود فیضؔ نے بھی وضاحت کی ہے۔

---

[1] ہم کہ ٹھہرے اجنبی — ڈاکٹر ایوب مرزا — صفحہ ۶۵

آیئے اب ہم ذرا اس پر بھی نظر ڈال لیں کہ فیضؔ کے مسلے کیا تھے۔ نیز انھوں نے کس طرح کے عصری مسائل کو اپنے فن اور اپنی 'نوائے پریشاں' میں سمونا چاہا۔ برصغیر ہندو پاک کی سماجی حقیقتوں میں سامنتی کیفیت اور اس کے اثرات بھی ایک مخصوص تضاد کی حیثیت رکھتے ہیں جبھی فیضؔ نے یہ کہا تھا کہ :۔

نجاتِ دیدۂ دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

برصغیر ہندو پاک کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ بظاہر سامراجی طاقتوں کے ہٹنے کے بعد یہاں نہ تو خاطر خواہ صنعتی نظام و مزاج، ترقی پا سکا نہ ہی سامنتی اثرات میں کوئی معتد بہ بنیادی کمی آ سکی بلکہ حکمراں طبقوں نے اپنی لوٹ کھسوٹ کے لیے سامراجیت، سرمایہ داری، سامنتی اثرات و توہمات (OBSCURANTISM) اوہام پرستی سے ساز باز کر کے سماجی حقیقتوں کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا۔ نتیجۃً مذہب و ذات پات، علاقائیت و بولی، بھاشا وغیرہ کے نام پر جھگڑے فساد عام ہو گئے۔ فیضؔ نے ان حقائق کو وسیع تر انداز میں دیکھا ہے۔ جبھی وہ جا بجا اس طرح کی تحریریں بھی پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جس سے فطری، تاریخی، عوامی و جمہوری بصیرت میں یقیناً اضافہ ہوتا ہے۔

اب رہی لیلائے سخن کی آبیاری کی بات تو فیضؔ نے اپنے سبھی مجموعوں میں اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ دورِ جدید کی بہت ساری باتوں کا اظہار اور افکار و خیالات کی ترجمانی غزل میں مشکل سے ہوتی ہے۔ لیکن فیضؔ نے یہ کام غزلوں میں بھی خوبی کے ساتھ سرانجام دیا ہے وطن واپس پہنچتے ہی جب وہ قید کر لیے گئے تو اس زمانے کی کیفیت کا اظہار اپنی غزلوں میں وہ یوں کرتے ہیں۔

مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے
منصف ہو تو اب حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے
پیمانِ جنوں ہاتھوں کو شرمائے گا کب تک
دل والو، گریباں کا پتا کیوں نہیں دیتے
بربادیٔ دل جبر نہیں فیضؔ کسی کا
وہ دشمنِ جاں ہے تو بھلا کیوں نہیں دیتے

سکوت اور انتظار کی آئینہ دار غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہوگی
سنتے تھے وہ آئیں گے سنتے تھے سحر ہوگی
کب تک ابھی رہ دیکھیں اے قامتِ جانانہ
کب حشر معیّن ہے تجھ کو تو خبر ہوگی

فیضؔ کی غزل گوئی کے نقوش ابھارنے کے سلسلے میں ان کی دیگر منظومات سے کہیں کہیں مثالیں اس لیے بھی آ گئی ہیں کہ حقیقت عیاں ہو جائے، وگرنہ غزل کے نہاں خانے اور بالخصوص فیضؔ کی غزلیات کے نہاں خانے کی خصوصیات تو بے حد تہ در تہ ہیں۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

ذات پات اونچ نیچ اوہام پرستی (OBSCURANTISM) اور مابعد الطبیعاتی (METAPHYSICAL) طرح کی سوچ سے وہ بہت پرے تھے۔ جبھی انھوں نے اپنے خطوط میں بھی اس پر زور دیا ہے کہ

"بدقسمتی سے میرا مزاج صوفیانہ نہیں ہے اس لیے میں اس عالم مدہوشی سے زیادہ دیر لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔"[1]

نسل پرستی، غیر انسانی رویوں کے تو وہ دشمن تھے ہی، جنگ بازی (WAR MONGERING) جس کے بارے میں البرٹ آئنسٹین کا شدید ردِ عمل یہ تھا کہ جنگ بازوں سے ہم ایسی شدید نفرت کرتے ہیں کہ یہ ہمارے جذبۂ نفرت کے بھی مستحق نہیں، فیضؔ بے جا جنگ بازی کے اس سے بھی

---

[1] صلیبیں مرے دریچے میں — فیض احمد فیضؔ — صفحہ ۹۵

کہیں زیادہ استوار دشمن تھے۔ حکمراں طبقہ بے جا جنگ کو 'War to end all wars' کے لبادے میں جیسے فروغ دیتا ہے، ظاہر ہے کہ فیض اس کے سخت خلاف تھے لیکن شر کے خلاف جنگ کو وہ جائز سمجھتے تھے۔ اسی بناء پر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے کلام میں طبقاتی کشمکش شروع سے آخر تک جاری وساری نظر آتی ہے۔ مثال کے لیے "شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں"، "یہاں سے شہر کو دیکھو"، وغیرہ ایسی نظموں کو ہی لے لیجئے۔

اسی طرح سامراج دشمن لہر بھی فیض کی شاعری میں رواں دواں ہے۔ اس حد تک کہ جب وہ امریکہ گئے، تو وہاں کی چمک دمک و چکا چوندھ میں نہ پڑ کر اس طرح کی باتیں محسوس کیں اور کہیں۔

جب ارضِ خدا کے کعبے سے
سب بُت اٹھوائے جائیں گے
ہم اہلِ صفا مردودِ حرم
مسند پہ بٹھائے جائیں گے
سب تاج اچھالے جائیں گے
سب تخت گرائے جائیں گے

وغیرہ

قومی نیز بین قومی مسائل کے تعلق سے فیض لکھتے ہیں۔

"یوں تو سارے جہاں کا درد بہر حال اپنے درد میں شامل

رہتا ہے اور زندگی کے ہر لمحے میں اس کا سامنا رہتا ہے لیکن اگر آدمی آزاد ہو تو اس درد کے مقابلے میں خود کو بے دست و پا محسوس نہیں کرتا اور اس کے خلاف بہت آن بان کے ساتھ لڑ بھی سکتا ہے۔" [۱]

فیض نے مذکورۂ بالا عذابوں کا مداوا مارکسزم یعنی سائنٹفک سوشلزم میں پایا جس پر ان کا یقین ایسا زبردست تھا کہ وہ اس پر ابتداء سے لے کر انتہا تک قائم رہے اس طور سے تاریخی مادیت اور جدلیاتی مادیت بھی فیض کی شاعری نیز ان کی غزلوں کی جان ہیں

یہی کنارِ فلک کا سیہ تریں گوشہ

یہی ہے مطلعِ ماہِ تمام کہتے ہیں

اسی طرح ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جب لوگوں نے یہ بھی کہنا شروع کیا کہ اب اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور اب کچھ نہیں ہو سکتا تو فیض کا جواب غزل کی صورت میں یہ تھا۔

رواں ہے نبضِ دوراں، گردشوں میں آسماں سارے

جو تم کہتے ہو سب کچھ ہو چکا ایسے نہیں ہوتا

---

[۱] صلیبیں مرے دریچے میں   فیض احمد فیض   صفحہ ۹۰

عالمی سامراجیت اور فسطائیت نے جب مقننّہ، انتظامیہ اور عدلیہ وغیرہ (Legislature, Executive, Judiciary etc) کے بھی رہے سہے پرخچے ادھیڑ دیئے تو ان باتوں کو بھی فیضؔ نے اپنی غزلوں تک میں اس طرح پیش کیا ہے کہ بس حیرت ہی ہوتی ہے۔

اب صاحبِ انصاف ہے خود طالبِ انصاف
مُہر اس کی ہے میزان بہ دستِ دگراں ہے

اردو شعراء نے چین کے خلاف بھی بہت کچھ لکھا ہے لیکن فیضؔ کے یہاں بات اس کے بالکل برعکس ہے۔ جیسے ڈاکٹر ایوب مرزا نے اپنی تصنیف "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" میں بہت تفصیل سے پیش کیا ہے۔
انقلابِ چین کرّۂ ارض کو ہلا دینے والا ایک واقعہ تھا اتنے بڑے موضوع کی جلوہ گری اشعارِ غزل میں یا غزلیہ لہجے میں یقیناً ایک حیرت انگریز بات نظر آتی ہے۔

ساقیا! رقص کوئی رقصِ صبا کی صورت
مطربا! کوئی غزل رنگِ حنا کی صورت

بساطِ رقص پہ صد شرق و غرب سے سرِ شام
دمک رہا ہے تیری دوستی کا ماہِ تمام

ملے کچھ ایسے، جدا یوں ہوئے کہ فیضؔ اب کے
جو دل پہ نقش بنے گا وہ گل ہے داغ نہیں

عالمی پیمانہ پر ظلم و استبداد کے اسباب سے فیضؔ پہلے ہی واقف ہو چکے تھے۔ چنانچہ انھیں کے مطابق انھوں نے شعر و غزل کا لہجہ بھی ڈھال لیا تھا۔

ہم چلے آئے لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل دل میں قندیلِ غم
اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کی
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم

سقوطِ مشرقی پاکستان ایسے سانحہ کو بھی فیضؔ نے اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے اشعار سے قبل انھوں نے جو باتیں لکھی ہیں وہ بھی توجہ طلب ہیں۔

"مشرقی پاکستان کے وہ دلدوز حالات اور واقعات ایسے ہیں جنھوں نے میرے دل کو فگار کر دیا تھا۔ مجھے زندگی میں اس سے بڑھ کر کسی واقعہ سے صدمہ یا دکھ نہیں ہوا ...... اسی سلسلے میں ایک غزل اور کہی ہے۔"[۱]

۱۔ ہم کہ ٹھہرے اجنبی ڈاکٹر ایوب مرزا صفحہ ۲۷۲

کہیں تو کاروانِ درد کی منزل ٹھہر جائے

کنارے آ لگے عمرِ رواں یا دل ٹھہر جائے

اماں کیسی کہ موجِ خون ابھی سر سے نہیں گزری

گزر جائے تو شاید بازوئے قاتل ٹھہر جائے

اس سلسلے میں بھٹو کے ساتھ فیض بھی مجیب الرحمٰن سے ملے معاملات طے نہ ہو سکے لیکن مجیب کے اصرار پر کہ۔

"فیض بھائی کچھ لکھیں ...... فیض بھائی ہمارے بارے میں بھی تو کچھ لکھیں ...... اور پھر بھئی وہاں کے دورے کی جو مایوسی اور دل شکنی ہم ساتھ لائے تھے وہ غزل ہو گئی۔

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد

پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد

بھئی یہ غزل ہم نے مجیب کو بھجوا دی تھی"۔[1]

ایک دوسری غزل میں اپنے جذبات کو کس موثر اور دلدوز انداز میں پیش کیا ہے۔

ہمیں سے اپنی نوا ہم کلام ہوتی رہی

یہ تیغ اپنے لہو میں نیام ہوتی رہی

---

[1] ہم کہ ٹھہرے اجنبی — ڈاکٹر ایوب مرزا — صفحہ ۲۸۸

مقابل صف اعداء جسے کیا آغاز
وہ جنگ اپنے ہی دل میں تمام ہوتی رہی
کوئی مسیحا نہ ایفائے عہد کو پہونچا
بہت تلاش پسِ قتلِ عام ہوتی رہی

فیضؔ آتے ہیں رہِ عشق میں جو سخت مقام
آنے والوں سے کہو ہم تو گزر جائیں گے

ان حقائق کے پیش نظر فیضؔ نے اپنے دور کے اہم سماجی مسائل وموضوعات کو پہچانا اور انھیں گہری دانائی وشعور، عظیم درد و وابستگی اور کمال فنی دسترس کے ساتھ شعری زبان بخشی۔ اس لیے ہم انھیں عالمی شاعری کی صف میں جگہ دیتے ہیں۔

مختصر یہ کہ غزل اردو کی بہت ہی مقبول صنف سخن شروع سے رہی ہے اور ہر دور میں حالات کے اعتبار سے اس میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں جسے ہم اردو غزل کے سفر کے نام سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں۔ یہی ایسی صنف ہے جس نے گل وبلبل سے لے کر دار و رسن تک کی بات نہایت مؤثر انداز میں کی ہے۔ بیسویں صدی میں اردو غزل میں تو قابل دید تبدیلی واقع ہوئی، جدید شعراء نے اسے گل وئل تک محدود نہیں رکھا بلکہ سماج میں رونما ہونے والے تمام اہم

سماجی حادثات کو قلمبند کرتے رہے۔ چونکہ کسی شاعر کے مطالعہ کے لئے اس کے گرد و پیش کے حالات اور سابقات کا جائزہ لازمی ہوتا ہے اس لیے میں نے اردو غزل کی مقبولیت خاص طور سے جدید اردو غزل پر ایک مختصر باب لکھا ہے جو کہ فیض شناسی میں ممد و معاون ہو سکے گا۔

TH-4374

فیض کی شاعری پر تبصرہ کرنے سے قبل یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ کسی بھی شاعر کے کلام کو از روئے تحقیق مطالعہ کرتے وقت اس کے حالات زندگی اور کوائف کا جائزہ لازمی ہوتا ہے تاکہ ہم اس کے مزاج کو سمجھ سکیں اور اس کی صحیح تفہیم کر سکیں اسی لیے میں نے ان پر جداگانہ بحث کی ہے۔

چونکہ فیض کا مطالعہ مشرق اور مغربی علوم کے سلسلے میں وسیع تھا اور عالمی سطح پر ان کا مجاہدہ (زیادہ تر جہد خاموش اور کبھی کبھی جہد پر شور) تھا ترقی یافتہ نظریات و تصورات کے سلسلے میں بھی ان کی شخصیت نمایاں ہے۔ لہذا یہ امر ناقابل فراموش ہے کہ انھوں نے شاعری کے میدان میں دانائے راز شعراء اور ادباء کا اثر قبول نہ کیا ہو اس سلسلے میں اپنی تمام محدودیت کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے چند اکابر شعراء کو بطور نمونہ پیش کیا ہے ویسے تو ان کی فہرست کافی طویل ہے۔

0168,1,N'';9 Th 168N2

فیض کے شعری مجموعوں پر تبصرہ کرنے کے بعد ان کی انفرادیت اور مقام کو متعین کرنے کے لئے میں نے ہم عصر چند ممتاز شعراء سے موازنہ کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ بہرحال اپنی تمام محدودیت کم مائگی اور خامیوں کے ساتھ یہ

تحقیقی مقالہ پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف!

آخر میں شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کے اساتذۂ کرام اور دیگر کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرنا اپنا عین فرض سمجھتا ہوں جنھوں نے میری ہر دستک پر لبیک کہا اور ہر طرح سے میری مدد کی۔ جن میں پروفیسر جعفر رضا صدر شعبۂ اردو، ڈاکٹر فضل امام، ڈاکٹر احمد حسن، ڈاکٹر عبدالحامد اور دوسرے اساتذہ کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی قابل ستائش ہے۔ پروفیسر سید مجاور حسین حیدرآباد یونیورسٹی اور ڈاکٹر عبدالحق دہلی یونیورسٹی خصوصی شکریہ کے حقدار ہیں ہر ملاقات میں دونوں کرم فرما حوصلہ افزائی کرتے رہے اور اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہے۔

اس سلسلے میں کچھ نام پاکستان کے عزیز کرم فرماؤں کے بھی ہیں جن میں جناب ظفر الاسلام صاحب اور سید انور جعفری صاحب خصوصاً قابل ذکر ہیں جنھوں نے مواد کی فراہمی میں بہت مدد کی۔

بالآخر از ہمہ استاد محترم پروفیسر سید محمد عقیل رضوی سابق صدر شعبۂ اردو خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے میری مدد کی اور مجھے ایک مشفق اور محسن استاد ڈاکٹر ظل حسنین کی رہنمائی میں کام کرنے کا موقع عنایت فرمایا۔ جن کی شخصیت فیض شناسی میں بلند مرتبہ کی حامل ہے۔

استاد محترم نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود ہر ہر قدم پر میری رہنمائی کی اور انھیں کی ذات بابرکت کی بدولت میرا یہ مقالہ پایۂ تکمیل کو پہونچا۔

سچ تو یہ ہے۔

"انھیں کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں"

(دستخط)

(اسامہ جعفری)

بابِ اوّل

مختصر سوانحِ حیات
فیض احمد فیضؔ

ہر فنکار۔ شاعر ہو یا افسانہ نگار یا ادیب اس کی تخلیقات
اپنے سوانح حیات، خاندان، گردو پیش کے معاشرے اور ماحول
سے نہ صرف متاثر ہوتی ہیں بلکہ کسی قدر اس کے اپنے سانحات حیات
کی عکاس ہوتی ہیں۔

اور

فیض نے تو اپنے کئی انٹرویو میں صاف کہہ بھی دیا ہے کہ
(جب ان سے کسی نے خود ان کے بارے میں سوال کیا) "مجھے جاننے
کے لیے میرا کلام پڑھ لیجئے" یہ وہی بات ہے جسے ساحر نے بھی
یوں کہا ہے:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

بات یہ ہے کہ شعری ادب ہو یا نثری ادب اس کی روح
رواں اسکا مواد ہوا کرتا ہے۔ انداز ترسیل اس مواد کو حسین اور

دلکش مزدور بنادیتا ہے۔ اگر کوئی فنکار اپنا مواد اپنے گردوپیش کے ماحول اور معاشرے کے تضاد و تصادم سے رونما ہونے والے واقعات اور حادثات سے اخذ نہیں کرتا اور ان سے روپوشی کرتا ہے تو وہ صحیح معنوں میں نہ "شاعر" کہلانے کا حقدار ہے نہ "ادیب" یہ بات خود فنکار کے شعور و تجربات ہی پیدا کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے انداز ترسیل میں انقلابی تنوع پیدا کر سکے۔

اب ہم اسی نظریے کے تحت فیض کے سوانح حیات کا جائزہ لیتے ہیں۔

فیض کی سوانح حیات قلمبند کرتے ہوئے وصی احمد سندیلوی یوں رقم طراز ہیں :-

" ملکی پابندیوں نے فیض احمد کے حالات زندگی فراہم کرنے میں بڑی دشواریاں پیدا کردی ہیں خط وکتابت کا سلسلہ بالکل بند ہے آنے جانے میں پابندیاں حائل ہیں اس لئے خاطر خواہ حالات زندگی پر روشنی ڈالنا ناممکنات میں سے ہو گیا ہے۔ اس لئے جستہ جستہ جو بھی ان کے حالات فراہم ہو سکے ان ہی پر قانع ہونا پڑا [۱]"

مگر وصی احمد سندیلوی کے اس خیال کی اب زیادہ اہمیت باقی نہیں رہی کیونکہ ۱۹۶۵ء سے اب تک مختلف فیض نمبروں کے ذریعے ان کے حالات زندگی کلی طور پر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ 'افکار' (صہبا لکھنوی) کراچی ۱۹۶۵ء فیض نمبر غالب اکاڈمی کراچی ۱۹۶۶ء فن اور شخصیت (صابر دت) ۱۹۷۲ء ممبئی " عمر گذشتہ کی کتاب" مصنف

---

[۱] انقلابی شاعر فیض احمد فیض وصی احمد سندیلوی صفحہ ۸

مرزا ظفر الحسن "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" مصنف ڈاکٹر ایوب مرزا۔ اس کے علاوہ ان کے انتقال کے بعد متعدد فیض نمبروں اور اخباروں میں ان کے حالات زندگی ہندوستان اور پاکستان سے شائع ہوئے ہیں جن میں ان کی سوانح حیات خود ان کی زبانی اور دوسروں کی زبانی لکھی جا چکی ہے۔

ہم سب سے پہلے "فن اور شخصیت" سے ان کی بہن بی بی گل کی بیان کردہ باتوں سے ان کا حال لے رہے ہیں مضمون کا عنوان ہے "بھائی کی کہانی بہن کی زبانی" مضمون نگار ہیں اختر جمال

خاندان:۔ فیض کی بڑی بہن بیگم شجاع الدین عرف بی بی گل نے بتایا۔

> "ان کا خاندان دراصل راجا سین پال جنکی حکمرانی یوپی کی میرٹھ کمشنری میں تھی۔ سہارن پور کو اس کا صدر مقام سمجھئے۔ اس راجپوت خاندان کی اولاد میں سے کسی شخص نے اسلام قبول کر لیا اور ہمارے والد کا تعلق اسی شاخ سے ہے۔ ہمارے پردادا کا نام 'سربلند' دادا کا نام صاحبزادہ خاں اور والد کا نام سلطان محمد خاں"۔[1]

---

[1] فن اور شخصیت : فیض نمبر بمبئی صفحہ ۵۴۵

"ہم کہ ٹھہرے اجنبی" میں ڈاکٹر ایوب مرزا نے ان کے والد کا پہلا نام "سلطان بخش" بتایا ہے۔[1]

مرزا ظفر الحسن اپنی تصنیف "عمر گذشتہ کی کتاب" میں ننھیال کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں:

"فیضؔ کا ددھیال اور ننھیال دونوں کالا قادر اور جسٹر ضلع سیالکوٹ کے دیہاتوں سے وابستہ ہے ان کے نانا کا نام عدالت خاں تھا۔ جن کی مالی حیثیت جسٹرؔ کے دوسرے رہنے والوں کے مقابلے میں بہتر تھی اس لیے جسٹرؔ کے رئیس کہلاتے تھے۔"[2]

ان کے والد بزرگوار کے ابتدائی حالات نہ صرف دردناک بلکہ عبرت ناک اور ہمارے لیے نصیحت آمیز ہیں۔ البتہ ان سے ان کی خود اعتمادی جفاکشی تحصیل علم، کا شوق اور آگے بڑھنے کے جذبے پر گہری روشنی پڑتی ہے۔

۱۔ ہم کہ ٹھہرے اجنبی — ڈاکٹر ایوب مرزا — صفحہ ۳۶

۲۔ عمر گذشتہ کی کتاب — مرزا ظفر الحسن — صفحہ ۳۲

تاریخ پیدائش

فیض احمد فیضؔ اپنے والد کی پانچویں بیوی محترمہ سلطان فاطمہ کے بطن سے تولد ہوئے۔ عام طور پر ان کا سنۂ ولادت ۱۹۱۲ء سمجھا جاتا رہا ہے۔ لیکن ۱۶ر اپریل ۱۹۶۵ء کے فیض احمد فیضؔ کے ایک خط سے صحیح تاریخ معلوم ہوتی ہے۔ صباؔ لکھنوی نے "افکار" فیضؔ نمبر میں ان کے اس خط کا عکس شائع کیا ہے۔

"تاریخ پیدائش اسکول کے کاغذات میں ۷ر جنوری ۱۹۱۱ء اور کہیں ۷ر جنوری ۱۹۱۲ء درج ہے۔ میں نے حال ہی میں ایک دوست سے فرمائش کی تھی کہ وہ سیالکوٹ کے دفتر بلدیہ سے پیدائش کے اندراجات کا رکارڈ دیکھ کر صحیح تاریخ معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ ان کی تحقیق کے مطابق بلدیہ کے کاغذات میں ۱۳ر فروری ۱۹۱۱ء تاریخ پیدائش درج ہے۔"[1]

ابتدائی تعلیم و تربیت اور تعلیمی ماحول

فیضؔ کی بہن بی بی گل نے جو دو بیان فن اور شخصیت کے فیضؔ

---

[1] افکار فیضؔ نمبر صفحہ ۲۵

نمبر میں دیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فیضؔ میں تحمل اور بردباری کا وصف بچپن ہی سے پایا جاتا تھا۔ فیضؔ کی تربیت اور پرورش میں نانا جان (سردار جان) کا بہت حصّہ رہا ہے۔

فیض احمد فیضؔ کی بسم اللہ ۱۹۱۵ء میں ہوئی اور انھوں نے محلے کی مسجد کے مکتب میں مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی کی زیر نگرانی بغدادی قاعدہ شروع کیا اور اسی مکتب میں ناظرہ قرآن کے ساتھ ساتھ اردو۔ فارسی اور حساب وغیرہ کی ابتدائی کتابوں کو ختم کیا اور دو سپارے حفظ بھی کر لیے۔ جیسا کہ بی بی گل نے لکھا ہے کہ جب فیض احمد کو آشوب چشم اور ضعف بصارت کی شکایت ہونے لگی تو حفظ کرنا چھوڑ دیا۔ ان کا داخلہ اسکاچ مشن اسکول میں ۱۹۲۱ء میں درجہ چار میں کرایا گیا۔ جہاں سے انھوں نے ۱۹۲۷ء میں شاندار کامیابی کے ساتھ میٹریکولیشن پاس کیا۔

اسی اسکول میں فیضؔ کے اندر چھپا ہوا شاعر ظاہری وجود میں آیا۔ چنانچہ جب وہ دسویں درجے میں تھے تو شعر گوئی کے طالب علمانہ مقابلے میں انکو پہلا انعام ملا۔ مہاراجا کشمیر کے ایک مقرب اور بلند پایہ عہدے دار پنڈت راج نرائن اور اس سے زیادہ ان کے والد محترم کے منشی منشی سراج الدین مرحوم نے فیضؔ کی تعریف کرتے ہوئے منع کیا کہ ابھی شعر گوئی کیطرف متوجہ ہونا ٹھیک نہیں ہے۔ چنانچہ

انھوں نے شعر کہنا ترک کر دیا۔

فیضؔ صاحب نے مرے کالج میں داخلہ ۱۹۲۷ء میں الف اے (انٹرمیڈیٹ) میں لیا۔ وہاں کے اردو لکچرار مولوی یوسف سلیم چشتی نے "اخوان الصفا" کے نام سے ایک انجمن بنائی تھی اور شاعرانہ مشاعروں کا انعقاد کرتے تھے۔ مولانا موصوف نے فیضؔ کی ہمت افزائی کر کے انھیں غزل گوئی پر آمادہ کیا چنانچہ ۱۹۲۸ء کے سالانہ مشاعرے میں فیضؔ نے جو غزل پڑھی وہ بہت پسند کی گئی اس کا مطلع یہ ہے۔

لب بند ہیں ساقی مری آنکھوں کو پلا دے
وہ جام جو منت کشِ صہبا نہیں ہوتا

دوبارہ بلانے پر انھوں نے ڈاکٹر اقبالؔ پر ایک نظم پڑھی جو اس سے بھی زیادہ پسند کی گئی جس کے دو بند درج ذیل ہیں:

نبود و بود کے سب راز تو نے پھر سے بتلائے
ہر اک قطرے کو وسعت دے کے دریا کر دیا تو نے
ہر اک قطرے کو تو نے اس کے امکانات جتلائے
ہر اک ذرّے کو ہمدوشِ ثریا کر دیا تو نے

فروغ آرزو کی بستیاں آباد کر ڈالیں
زجاجِ زندگی کو آتشِ دوشیں سے بھر ڈالا
طلسمِ کن سے تیرا نغمۂ جاں سوز کیا کم ہے
کہ تو نے صد ہزار اہرمنوں کو مرد کر ڈالا

ان کے اساتذہ کے علاوہ دوسرے سامعین نے بھی اس نظم پر بے پناہ داد دی۔

مرے کالج سے ایف۔ اے پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں ۱۹۲۹ء میں بی۔ اے میں داخلہ لیا جہاں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور احمد شاہ پطرس بخاری جیسے مشہور اور معروف بلند مرتبہ شاعر اور ادیب ان کو استاد ملے۔ انگریزی میں پروفیسر ڈکنس اور پروفیسر ہری چند کٹا پالیا جیسے ماہر زبان استاد ملے۔

ساتھ ہی یہ بھی ہوا کہ ڈاکٹر تاثیر جو اسلامیہ کالج میں تھے ان کی صحبت بھی میسر ہوئی فیض کالج میگزین "راوی" میں لکھنے لگے اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور احمد شاہ پطرس بخاری کی ادبی نشستوں میں شرکت کرنے لگے۔ اسی سلسلے میں امتیاز علی تاج۔ چراغ حسن حسرت حفیظ جالندھری۔ اختر شیرانی وغیرہ سے ذاتی مراسم پیدا ہوگئے۔

وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ زمانۂ طالب علمی سے شعر گوئی

کی تحریک کسی جذباتی حادثے کے باعث ہوئی تھی یا یوں ہی! ان کی نظم "نذر" اور "معصوم قاتل" مطبوعہ راوی ۱۹۳۲ء کسی حادثے کی یادگار ہے یا نہیں؟ مدیر راوی نے حاشیے[۱] میں جو نوٹ لکھا ہے "جی چاہتا ہے ایک نام لکھ دوں" کسی حادثے کی غمازی ضرور کرتا ہے۔ یہ نظم ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ البتہ ڈاکٹر سلیم اختر نے راوی سے اس کا سراغ لگایا اور لکھا ہے کہ دلچسپ تاریخی ریکارڈ کے لیے یہ نظم بے حد موزوں ہے جو اس طرح ہے۔

طرب زاد تخیل شوقِ رنگیں کار کی دنیا
مرے افکار کی جنت مرے اشعار کی دنیا
شب مہتاب کی سحر آفریں مدہوش موسیقی
تمہاری دل نشیں آواز میں آرام کرتی ہے
بہار آغوش میں پہلی ہوئی رنگینیاں لے کر
تمہارے خندۂ گل ریز کو بدنام کرتی ہے
تمہاری عنبری زلفوں میں لاکھوں فتنے آوارہ
تمہاری ہر نظر سے سیکڑوں ساغر چھلکتے ہیں

---

۱ فن اور شخصیت حنیف نمبر صفحہ ۲۲۸ تا ۲۳۰

تمہارا دل حسین جذبوں سے یوں آباد ہو گویا
شفق زارِ جوانی میں فرشتے رقص کرتے ہیں
جہانِ آرزو پر بے رُخی دیکھی نہیں جاتی

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ فیض ممتاز حیثیت کے فطری شاعر ہیں اور قدرت کی طرف سے ان کو بھرپور ملکۂ شاعری عطا ہوا ہے۔ انھوں نے غالب اور ڈاکٹر اقبال کی طرح اپنی تخلیقی شاعری کا اظہار عنفوانِ شباب سے ہی شروع کر دیا تھا۔

افسوس ہے کہ ان کا ابتدائی کلام خصوصاً ابتدائی غزلیں ہماری دسترس سے باہر ہیں البتہ جو کچھ ملتا ہے وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے اردو میگزین "راوی" میں ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۹ء تک کے پرچوں میں محفوظ ضرور ہے۔

"راوی" ۱۹۳۲ء کے شمارے کی ایک غزل کے دو شعر ملاحظہ فرمایئے:-

فضائے دل پہ اداسی بکھرتی جاتی ہے
فسردگی ہے کہ جاں تک اترتی جاتی ہے
فریب زیست سے قدرت کا مدعا معلوم
یہ ہوش ہے کہ جوانی اترتی جاتی ہے

اسی شمارے میں فیض کی دو غزلیں اور شائع ہوئیں جن میں سے ایک غزل "نقشِ فریادی" میں موجود ہے جس کا مطلع ہے:-

ہر حقیقت مجاز ہو جائے
کافروں کی نماز ہو جائے

اور یہ غزل جس کا مطلع درج ذیل ہے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے:

شباب کوشۂ الفت کی احتیاج سہی
بساط دہر پہ جور و ستم کا راج سہی

مختصر یہ کہ فیض کو قدرت نے شاعرانہ ملکہ عطا کیا تھا اور یہ ملکہ کس طرح وجود میں آیا کسی حادثے کے تحت یا یوں ہی! اس کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔

فیض احمد فیض بھائی اور بہن[1]

بہنیں:- (۱) بی بی گل بیگم شجاع الدین
(۲) بیگم حمید

---

[1] "افکار" فیض نمبر کراچی ۱۹۶۵ء صفحہ ۲۷

(۳) بیگم نجیب اللہ خاں

(۴) بیگم اعظم علی

(۵) رشیدہ سلطانہ

:۔ بھائی :۔

(۱) حاجی طفیل احمد :۔ ان کا حادثاتی طور پر انتقال اس زمانے میں ہوا جب فیضؔ حیدر آباد سندھ جیل میں تھے۔ ایک منظوم مرثیہ ان کی موت پر فیضؔ نے کہا تھا جو مجموعہ میں موجود ہے

(۲) میجر عنایت احمد :۔ جو بعد میں لفٹننٹ کرنل ہو گئے۔

(۳) بشیر احمد :۔ ان کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا

ملازمت

۱۹۳۵ء میں ایم۔اے۔او کالج میں انگریزی کے لکچرر کی حیثیت سے ملازم ہوئے اور ۱۹۴۰ء کے ابتدا تک رہے۔ یہی وہ وقفہ ہے جب فیضؔ کی صاحبزادہ محمود الظفر اور ان کی بیگم رشیدہ جہاں سے ملاقات ہوئی اور ان کے ذہن پر بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے ان کو خود فیضؔ

کے الفاظ میں پڑھئے۔ کہ وہ ترقی پسند تحریک سے کس طرح وابستہ ہوئے۔

"ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑی۔ مزدور تحریکوں کا سلسلہ شروع ہوا اور یوں لگا کہ جیسے گلشن میں ایک نہیں کئی دبستان کھل گئے ہیں۔ اس دبستان میں سب سے پہلا سبق جو ہم نے سیکھا یہ تھا کہ اپنی ذات کو باقی دنیا سے الگ کر کے سوچنا اوّل تو ممکن ہی نہیں اس لئے کہ اس میں بہر حال گرد و پیش کے سب ہی تجربات شامل ہوتے ہیں اور اگر ایسا ممکن ہو تو انتہائی غیر سود مند فعل ہو گا کہ ایک انسانی فرد کی ذات اپنی سب محبتوں اور کدورتوں مسرّتوں اور رنجشوں کے باوجود بہت ہی چھوٹی سی بہت ہی محدود اور حقیر شے ہے۔ اس کی وسعت اور پہنائی کا پیمانہ تو باقی عالم موجودات سے اس کے ذہنی اور جذباتی رشتے ہیں۔ خاص طور سے انسانی برادری کا مشترکہ دکھ درد کے رشتے چنانچہ غمِ جاناں اور غمِ دوراں تو ایک ہی تجربے کے دو پہلو ہیں اس لیے احساس کی ابتدا "نقش فریادی" کے دوسرے حصّے کی پہلی نظم سے ہوتی ہے اس نظم کا عنوان ہے۔[1]

"مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ"

---

[1] فیض احمد فیض : وصی احمد سندیلوی : صفحہ ۱۰-۱۱ انقلابی شاعر

یوں تو اودے نے مکرجی اور ایم اے راے نے تاشقند میں ۱۷ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو پارٹی کی بنیاد رکھ چکے تھے لیکن ہمارے یہاں ۱۹۲۴ء میں ستیہ بھگت نے کانپور میں پارٹی کی بنیاد رکھی اور اسی درمیان کانپور بال شویک سازشی مقدمہ چلا۔ یہی وہ وقت ہے جب فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوئے تھے اور جو ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۲ء تک آتے آتے بہت بڑھ گئے اور یہی وہ زمانہ بھی ہے جب مارکس اور لینن کے سوشلسٹ نظریات کی اشاعت ہونے لگی تھی۔ اسی دوران مزدور کسان جماعت (WORKERS AND PESANTS PARTY) کی بنیاد پڑی جس کو ٹریڈ یونین تحریک (TRADE UNION MOVEMENT) کا نام دیا گیا۔ ان نئی تحریکات کی طرف سب سے پہلے ڈاکٹر اقبال نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں ٹوٹے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

ورکرس اینڈ پی زینٹس پارٹی کا قیام (WORKERS AND PEASANTS PARTY) ۱۹۲۶ء۔ ۱۹۲۷ء میں عمل میں آیا جس کی طرف ڈاکٹر اقبال اس طرح اشارہ فرماتے ہیں:

؎ بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے

خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر

شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی

اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے

مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

کسانوں کی بیداری میں تیزی پیدا ہوئی۔ ڈاکٹر اقبال نے جس کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے:۔

؎ آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا

دانہ تو کھیتی بھی تو باراں بھی تو حاصل بھی تو

وائے نادانی کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا

مے بھی تو مینا بھی تو ساقی بھی تو محفل بھی تو

؎ جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روٹی

اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

فیض کا تعلق اس تحریک سے اتنا ہو گیا کہ پنجاب میں ترقی پسند تحریک و تنظیم کا جب بھی جس کسی کو خیال آئے گا اس کے ذہن میں فیض کی شخصیت ضرور ابھر آئے گی۔ کچھ عرصے بعد حکومت نے اس تحریک کو ممنوع قرار دے کر اس پر پابندی لگا دی۔ مگر فیض احمد فیض۔ بشیر احمد بختیار سکریٹری ٹیکسٹائل ورکرس یونین کے اشارے پر امرتسر میں خفیہ طور پر کام کرتے رہے جس کا ذکر عملی سرگرمیوں میں ذرا تفصیل کے ساتھ کیا جائے گا۔

(۲) اس کے بعد ۱۹۴۰ء میں ہیلی کالج آف کامرس میں فیض انگریزی کے لکچرر مقرر ہوئے اور اس کالج میں ۱۹۴۲ء تک رہے۔

(۳) اسی سال ۱۹۴۲ء میں کیپٹن کی حیثیت سے فوج میں ملازم ہو گئے اور یکم جنوری ۱۹۴۷ء تک فوج میں رہے۔

(۴) ۱۹۵۹ء میں پاکستان آرٹ کونسل لاہور کے سکریٹری مقرر ہوئے اور جون ۱۹۶۲ء تک خدمات انجام دیں۔

(۵) ۱۹۶۴ء میں عبداللہ ہارون کالج کراچی کے پرنسپل و نگراں ہوئے۔

صحافی خدمات

(۱) ایڈیٹر ادب لطیف لاہور ۳۶-۱۹۳۸ء

(۲) پروگریسو پیپرز لمیٹیڈ میں انگریزی روزنامہ پاکستان ٹائمز اردو

روز نامہ امروز اور ہفت روزہ لیل و نہار کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے ۳ ؍ فروری ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک خدمات انجام دیں۔

(۲) اس کے علاوہ فیض بیروت میں افرو ایشیائی رائٹرز فیڈریشن کے جریدہ، لوٹس کے کافی عرصہ تک مدیر اعلیٰ رہے۔

شادی

فیض کی شادی ۲۸ ؍ اکتوبر ۱۹۴۱ء کو جیوفری آ سمنڈ جارج کی صاحبزادی ایلیس کیتھرین جارج سے ہوئی۔ شادی سری نگر کے ایک محل میں ہوئی۔ نکاح شیخ محمد عبداللہ نے پڑھایا۔ "نکاح نامے پر فیض اور ایلیس کے ساتھ جی۔ ایم۔ صادق اور ڈاکٹر مسز تاثیر کے دستخط بطور شاہد ہیں"۔ انکی بارات میں جوش ملیح آبادی اور مجاز بھی شریک ہوئے۔

مسز ایلیس اپنے شوہر فیض احمد کی تمام کمزوریوں کو ایک وفا شعار بیوی کے مثل خندہ پیشانی سے برداشت کرتی رہیں۔ وہ انگریزی زبان کے علاوہ جرمن۔ فرانسیسی اور روسی زبانیں جانتی ہیں۔ اردو میں

سلہ عمر گذشتہ کی کتاب مرزا ظفر الحسن صفحہ ۶۰

بلا تکلف گفتگو کرتی ہیں اور تھوڑی بہت پنجابی بھی سمجھتی ہیں۔ ان کے اوصاف میں خود اعتمادی اور اپنی مدد آپ کا جذبہ پوری طرح نمایاں ہے۔ ان خیالات کا مختصراً اظہار اس لئے ضروری ہے کہ ہم فیض کا تصور مسز فیض کے بغیر کر ہی نہیں سکتے یہ وہی مثل ہوئی :-

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نہ گوید بعد ازاں من دیگرم تو دیگری

آج بھی فیض کے انتقال کے بعد وہ مثل سابق خود اعتمادی اور اپنی مدد آپ کے نظریات کے سہارے اپنی زندگی خوش اسلوبی سے بسر کر رہی ہیں اور فیض کے خواب کو عوام کو روشناس کرانے میں آگے بڑھ کر حصّہ لے رہی ہیں۔

اولاد

فیض کی صرف دو لڑکیاں ہیں۔ بڑی بیٹی سلیمہ ۱۹۴۲ء میں دلّی میں اور دوسری بیٹی منیزہ ۱۹۴۵ء میں شملہ میں پیدا ہوئیں۔ سلیمہ کالج آف آرٹس لاہور میں پڑھاتی ہیں۔ منیزہ پاکستان ٹیلی ویژن لاہور میں پروڈیوسر ہیں۔ فیض کے بڑے داماد شعیب ھاشمی اور چھوٹے حمیر ھاشمی ہیں۔ دونوں سگے بھائی ہیں اور فیض کے دوست بی۔ اے۔ ہاشمی کے فرزند ہیں۔

فیض کی لڑکیاں اور داماد خاصی شہرت کے حامل ہیں اور تدریسی، سماجی و ثقافتی مسائل سے بڑی دلچسپی رکھتے ہیں :

انتقال

۱۹۸۴ء کے نومبر کا مہینہ ہمیشہ نا قابل برداشت رنج و غم سہنے کے طور پر یاد کیا جائے گا اس ماہ میں ترقی پسند تحریک کا دلدادہ مظلوموں اور مسکینوں کی آواز کا رکھوالا ۵۰ سال سے زیادہ افق شاعری پر چمکنے والا ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء کو لاہور میں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا گویا :

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گذار کے

یہ تھے فیض احمد فیض جو زندگی کی تاریک راتوں اور دشوار گذار راہوں میں برصغیر ہند و پاک ہی نہیں بلکہ پوری محکوم دنیا کی نوجوان نسل کے لئے روشنی اور تابناکی کے مینار تھے ۔ سچ تو یہ ہے کہ غالب اور اقبال کی طرح فیض بھی کسی ایک فرد شاعر کا نام نہیں ۔ بلکہ وہ عہد ساز شاعر اپنی ذات میں ایک دبستان تھے جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ان کی

شخصیت کے کئی پہلو تھے۔ وہ اپنے عہد کے عنوان تھے۔ عشق و محبت
خلوص اور سچائی سرفروشی اور جاں سپاری کا پیکر تھے۔ افسوس کہ
فیض اب اس دنیا میں نہیں رہے لیکن غالب اور اقبال کی طرح ان
کی شاعری ہر دور کے تمام انسانوں کے لئے مشعل راہ رہے گی اور
اس کی روشنی میں انسانیت اس منزل کی طرف اپنا سفر جاری رکھے
گی جس کی آرزو اور تمنا کے ساتھ فیض اس جہان فانی سے رخصت
ہوئے سچ یہ ہے کہ :

ای بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد
چشم خود بربست و چشم ما کشاد

باب دوم

فیضؔ کی شاعری کا پس منظر

سیاسی پس منظر

پہلے تفصیل سے لکھا جا چکا ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر سے ہی سماج طبقاتی کشمکش سے دو چار ہو چکا تھا بورژوا طبقہ جو راجاؤں جاگیرداروں، مہاجنوں، ساہوکاروں اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز حکومت برطانیہ کے ملازمین وغیرہ پر مشتمل تھا اور فیض کے والد بزرگوار ایک مشہور بیرسٹر تھے اور حکومت برطانیہ کی نظروں میں بھی باوقار اور معزز سمجھے جاتے تھے، اور فیض کی پرورش اسی شان سے ہوتی رہی جیسا کچھ دستور تھا انگریزی تعلیم پر بورژوائی طبقے کا تسلط تھا۔ موصوف کے والد بزرگوار حکومت برطانیہ کے ایک وفادار شخص تھے۔ پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء میں اس قسم کی امداد بھی کی جو اس وقت کے زمیندار کرتے رہے تھے۔ اس ضمن میں بی بی گل بتاتی ہیں" ہمارے میاں (ان کے والد صاحب) کا انگریزوں سے میل جول تھا ان کے ساتھ ٹینس اور برج وغیرہ کھیلتے تھے۔ مگر نہ جانے وہ کون سا فطری جذبہ تھا کہ فیض کو اس وقت یعنی اپنے بچپن اور عنفوانِ شباب میں بھی حکومت برطانیہ سے کسی خاص قسم کا لگاؤ نہیں رہا اور وہ کھیل کھیل میں 'ٹوڈی بچہ ہائے ہائے مال ولایتی بائیکاٹ' آپس میں کہتے رہے۔ جیسا کچھ ان کی بڑی بہن بی بی گل نے ان کے بچپن کے حالات

جتاتے ہوئے کہا ہے اور جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں اور مال ولائیتی بائیکاٹ، والی بات ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۶ء اور اس کے بعد ۱۹۲۱ء فیض کے ذہن میں جاگزیں تھی۔ 'مال ولائیتی بائیکاٹ' کی تحریک کا حال ہم تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔

سماج کا دوسرا طبقہ ایک "متوسط طبقہ" رہا ہے۔ یہ وہ طبقہ رہا ہے جو تھوڑی بہت آراضی کے مالک تھے۔ بٹائی وغیرہ پر کاشت کر لیتے یا آراضی کا کچھ حصہ لگان پر دے دیا کرتے تھے۔ کچھ لوگ ایسے تھے جو کلکرطی اور سرکاری محکموں میں معمولی عہدوں پر ملازم تھے اور سفید پوش اور خوش خوراک سمجھے جاتے تھے۔

تیسرا طبقہ جو صحیح معنوں میں پرولتاری کہا جا سکتا ہے مزدوروں محنت کشوں، گھریلو دستکاروں وغیرہ کا رہا اور جس کی طرف فیض اس وقت متوجہ ہوئے جب وہ فیض احمد فیض بن چکے تھے۔ ترقی پسند تحریک ۱۹۳۶ء کے ایک زور دار کارکن بن گئے تھے اور اچھی خاصی شہرت کے جرنلسٹ بھی۔ کیونکہ وہ پاکستان کے انگریزی کے سب سے بڑے اخبار پاکستان ٹائمز (PAKISTAN TIMES) کے چیف ایڈیٹر بن چکے تھے۔ اگرچہ ایک انٹرویو میں اس سوال پر کہ ان کا دھیان محنت کش طبقے کی طرف کس طرح مبذول ہوا تو انھوں نے جواب میں فرمایا تھا کہ "محنت کش نہ صحیح پھر بھی مجھے مفلسوں اور

بیچارگی کی زندگیاں بسر کرنے والے لوگوں کے مصائب اور پریشانیوں کا احساس اس وقت سے ہو چلا تھا جب میرے والد صاحب کا انتقال ہوا۔ اگرچہ میرے گھرانے کا شمار دولت مندوں میں کیا جاتا تھا پھر بھی ہم اس درجہ مقروض تھے کہ قرض کی ادائیگی نے ہمیں تباہ حال بنا دیا اور ہم نے جس مصیبت سے اپنی تعلیم جاری رکھی وہ ہمیں جانتے ہیں یا ہماری والدہ مرحومہ"۔

(۲)

فیض کا بچپن اور عنفوانِ شباب مذہبیات کے اس دور سے گذر رہا تھا جب ہندوستانیوں کے لیے مذہب اوڑھنا اور بچھونا تھا۔ کوئی بات ہو کوئی کام ہو مذہب کے سہارے کے بغیر اس کا ہونا ناممکن سا تھا۔ توہمات مذہب کا جزو لاینفک بن چکے تھے۔ جن کا مذہب سے دور کا بھی کوئی رابطہ نہیں رہا۔ پیر پرستی عُرس خانقاہوں سے عقیدت جھاڑ پھونک تعویذ۔ گنڈوں۔ رمل اور جفر وغیرہ مذہب سمجھے جاتے تھے۔ یوں تو پورے ہندوستان کا یہی حال تھا۔ مگر پنجاب اور سرحدی صوبہ کچھ اور ہی پیش پیش تھا اور پیری مریدی کے قائل تھے۔ اور عرسوں میں مالی اعانت بھی کرتے تھے۔ فیض کی بڑی بہن بی بی گل بتاتی ہیں کہ "ان کے والد حضرت مجدد الف ثانی کے بے حد معتقد تھے۔ ہر سال ان کے عرس میں شرکت کرتے اور اپنی ایک ماہ کی پوری آمدنی

یا اس کا بہت بڑا حصّہ عرس کے مصارف پر خرچ کر دیتے۔.......“

توہمات اور غیر ضروری رسومات سے بچنے کے لیے اور بدعات سیئہ کو مٹانے اور ان سے احتراز کرنے کے لیے سر سید احمد خاں تصور شیخ اور راہ سنت در ردّ بدعت کلمتہ الحق وغیرہ لکھ چکے تھے اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تصنیف ”اصلاح الرسوم“ منظر عام پر آ چکی تھی۔ مگر ان توہمات اور رسومات کی جڑیں مذہب کے ساتھ اس بری طرح جُڑ گئی تھیں کہ مذکورہ بالا کتابوں تک کا کوئی اثر نہ ہوا اور ان کی جڑوں کو کوئی جنبش نہ ہوئی۔ عوام صحیح مذہبی اعمال سے زیادہ ان رسومات کے پابند رہے۔ کئی مذہبی تحریکیں بھی وجود میں آ چکی تھیں۔ ہندوؤں میں خصوصی طور سے اور مذہب وملت کی کٹر پنتھی سوچ سے پرے ہٹ کر انسانی فلاح وبہبود پر مشتمل ایک ملی جلی انسانی تحریک یعنی تھیوسافیکل تحریک۔ آریہ سماج تحریک مسلمانوں میں احمدیہ و قادیانی تحریک، اس تحریک نے مسلمانوں میں ایک نئے فرقے کو جنم دیا۔ جو اپنے کو قادیانی کہتے ہیں اور اس کے بعد بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں تحریک ختم نبوت وجود میں آئی اور اس سلسلے میں بہت سے علماء فقہا جیل بھی گئے جیسا کچھ فیض کے خط نمبر ۹۳[1] ۲۵ جون ۱۹۵۳ء سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ کراچی جیل میں تھے تو مولانا عبدالحامد بدایونی جو ختم

---

[1] صلیبیں مرے دریچے میں خط نمبر ۹۳ صفحہ ۱۷۳

بنوت کی تحریک کے سلسلے میں یہاں ہیں ان سے بھی کچھ انس ہو گیا ہے اور میرا خیال ہے کہ وقت کٹ جائے گا اور تنہائی باقی نہ رہے گی۔ مذہبی مباحثے مناظرے اور مسلکی خلفشار ہوتا ہی رہا۔

فیض بھی اس مذہبی دور سے اس طرح گزرے کہ حسب دستور قرآن مجید نہ صرف ناظرہ ختم کیا بلکہ دو سپارے حفظ بھی کئے۔ ان کے والد صوم و صلوٰۃ کے بڑے پابند تھے۔ فجر کی نماز سے پہلے بیدار ہو جاتے اور فیض کو بھی جگا دیتے۔ وہ ان کے ساتھ مسجد جاتے باجماعت نماز پڑھتے اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ درس قرآن سنتے۔ فیض پر یہ مذہبی اثر گھریلو ماحول کا سہی پھر بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جوانی کے دنوں میں بھی ان کے دل و دماغ پر مذہب کا وقار غالب رہا اور انھیں قرآن مجید اور دوسری مذہبی کتابیں سمجھنے کا ذوق باقی رہا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ انھوں نے انٹر۔ بی اے میں اختیاری مضامین میں عربی زبان کو ترجیح دی اور اس میں ایم۔ اے بھی کیا۔

فیض نے زمانہ وہ پایا جب انیسویں صدی کے اواخر کی مذہبی روایات بیسویں صدی میں بھی جاری وساری تھیں اور پنجاب غیر مقلد مسلک اور قادیانی مسلک کا ایک گڑھ بن رہا تھا۔ انھوں نے ان مذہبی فرقوں کے آئے دن کے مباحثوں، مناظروں بلکہ کج بحثوں کا حال نہ صرف سنا بلکہ بہ نفس نفیس دیکھا اور جھیلا بھی۔ غیر مقلدوں اور حنفیوں کے مناظرے آمین بالجہر، رفع یدین، قرأت خلف الامام وغیرہ وغیرہ جیسے

اختلافی مسائل پر بحثیں سنی اور پڑھی ہوں گی۔ قادیانیوں کی خاتم النبین کی تاویلیں عیسائی پادریوں اور مسلمان علماء کے مناظرے پنجابی دھرم پال آریہ اور اسلام کے خلاف اس کی تحریروں اور بہت سی اسی طرح کی غیر ضروری باتوں کج بحثیوں اور مذہبی تنگ نظریوں نے عجب نہیں بہت کچھ اثر کیا ہو۔ رفتہ رفتہ ان کے مذہبی نظریات میں تبدیلی پیدا کر دی ہو اور اس میں وسیع النظری پیدا کر دی ہو۔ فیض فطری طور پر ہر مجاں درنج قسم کے ایک وسیع القلب انسان رہے اور وہ مذہبی تنگ نظری سے دور ہٹتے گئے اور اس سلسلے میں انھیں تصوف کے مطالعے میں وہ کچھ مل گیا۔ جس سے انھیں سکون قلب حاصل ہو گیا اور غالبًا یہی وجہ ہے کہ جب کبھی کسی نے ان کے مذہب کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے جواب میں فرمایا "میرا مذہب وہی ہے جو مولانا روم کا رہا ہے" اور یہی ان کے مذہبی اشعار میں پس منظر سمجھئے ہم آگے چل کر اس سلسلے میں ان کے خیالات اور اشعار پیش کریں گے۔

ادھر یہ بھی ہوا کہ طالب علمی کے دوران اور اس کے بعد بھی یورپی فلسفیوں اور سائنس دانوں کے تصورات اور نظریات کا مطالعہ کرتے رہے اور اس کا بخوبی اندازہ اس طرح ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک پرائیویٹ نشست میں "گیٹے" پر ایک مقالہ پڑھا۔ یہ نشست وقتاً فوقتاً پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے دولت کدے پر

ہوا کرتی تھی جس میں پروفیسر بخاری ڈاکٹر تاثیر اور شہر کے دوسرے بلند پایہ ادیب اور شاعر شرکت فرماتے تھے۔ پروفیسر بخاری صاحب اور خود تبسم وغیرہ نے بڑی ستائش کی اور یہیں سے اندازہ ہوتا ہے کہ فیض نے اسی درمیان "برکلے" "ہیگل" وغیرہ کا مطالعہ کیا اور انھیں اس کی بدولت مذہبی تنگ نظری کا احساس بھی ہوا۔

ان سب سے بڑھ کر کارل مارکس کے نظریات و افکار اور ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس کے نظریات نے موصوف کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا اور ان کے ذہن پر مارکسیزم کارفرما ہوتی گئی اور اس کا اثر ان کی شاعری پر بہت گہرا پڑا اور ان کا رجحان مارکسی سائنٹفک وسوشلزم کی طرف مبذول ہوا۔

علامہ اقبال بھی اس قسم کے نظریات سے متاثر ہوئے تھے اور سچ پوچھئے تو برِّ صغیر ہند کے وہ پہلے بلند مرتبہ شاعر ہیں جنھوں نے اردو شاعری کو ان نظریات سے روشناس کرایا۔ بورژوا طبقے کے مظالم محنت کش طبقے کے دکھ درد، کسان اور زراعت، سرمایہ و محنت جیسے موضوعات و مسائل ہر جگہ نمایاں کئے۔ لیکن اقبال نے ان مسائل کو زیادہ تر نظم و مثنوی وغیرہ کے پیرائے میں پیش کئے مگر جہاں تک غزل کی بات ہے تو یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آتی ہے کہ اقبال غزل کو خواہ کتنی ہی بلندی تک نہ لے گئے ہوں لیکن ان کی غزلوں کا لہجہ اور مزاج بحیثیت مجموعی زروں بینی

اور عارفانہ بہ انداز متصوفانہ رنگ ڈھنگ رکھتے ہیں۔

(۳)

تہذیبی اور تمدنی پس منظر کے سلسلے میں بس یوں سمجھنا چاہیئے کہ

کھلی جو آنکھ تو بدلا ہوا زمانہ تھا

اور اسی بدلے ہوئے زمانے کی نمائندگی کے لیے فیض خود ایک نمونہ بنے۔ ۱۹۱۱ء شہنشاہ جارج پنجم کے زیر عاطفت ہندوستان بظاہر پُر امن اور خوش حال زندگی بسر کر رہا تھا اور اس وقت تک بنگال میں راجا رام موہن رائے، یوپی میں سر سید احمد خاں، مدن موہن مالویہ اور پنجاب میں لالہ لاجپت رائے کی کوششیں بار آور ہو چکی تھیں اور مشرقی تمدن اور تہذیب پر یورپی اثرات بری طرح اثر انداز ہو چکے تھے لیکن وہ روایات اور رسومات جن کی وابستگی مذہب اور عقائد سے تھی البتہ سخت جان تھیں اور وہ اتنی زیادہ متاثر نہ ہوئیں۔ پھر بھی عیسائی مشنریوں کی بدولت بنگال، یوپی، پنجاب وغیرہ میں تبدیل مذہب کی تحریک جاری تھی۔ بنگال میں مدھوسدن جیسا سنسکرت اور بنگلا زبانوں کا نہ صرف ماہر بلکہ ایک بلند پایہ شاعر مائیکل بن گیا تھا۔ اسی طرح پنجاب میں پادری برکت اللہ کی طرح نہ جانے کتنے "اللہ" پادری بن چکے تھے۔ یہی حال دوسرے صوبوں کا تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں مشرقی تہذیب و تمدن پر یورپی تہذیب

کے اثرات پڑنا لازمی تھے۔

سر سید احمد خاں تقاضائے وقت کے تحت تہذیب و تمدن کے ضمن میں ہر مشرقی طور و طریق پر انگریزی طرز کو ترجیح دیتے رہے یہاں تک کہ اپنے ایک مضمون "طریق تناول طعام" میں مشرقی طرز خورش کا مذاق اڑایا ہے۔ مالویہ جی لالہ لاجپت رائے۔ رام موہن رائے وغیرہ نے اپنی توجہ صرف انگریزی تعلیم کی ترویج تک محدود رکھی۔ سوامی دیانند نے "آریہ سماج" کے نام سے جس تحریک کا آغاز کیا اس نے البتہ تہذیب پر اس طرح اثر کیا کہ چھوت چھات کے خلاف آواز بلند کی۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ فرقہ وارانہ رہنمایان اقوام نے اواخر انیسویں صدی سے انگریزی تعلیم کی ترویج کی طرف جو توجہ کی جس کی بدولت فرقہ وارانہ اور ذات برادری کے لحاظ سے تعلیم گاہوں کا رواج عام ہوا۔ کرسچین، دیانندی دھرم سماجی، مسلم ہائی اسکولوں کی بنیادیں پڑنے لگیں۔ چھتری کا یستھ کھتری، اگروال وغیرہ ذاتوں نے اپنی اپنی قوم کے لیے اسکول اور کالج کھولنے شروع کئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک الگ فرقہ بن گیا اور ان کی تہذیب اور تمدن ایک جداگانہ تہذیب بن گئی۔

مولانا حالی نے اپنی عظمت پارینہ کا اظہار اور اس کے زوال پر افسوس مدوجزر اسلام کے ذریعے کیا، جو مسدس حالی کے نام سے آج تک مشہور ہے۔ منشی سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ لکھنؤ سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اعلیٰ تہذیب کا نمونہ سمجھا جانے لگا۔ یہ انگریزی تہذیبی اثرات انگریزی تعلیم اور سرکاری عہدیداروں کے ذریعے قصبات تک پہنچے۔ مگر دیہات کے باشندے اپنے پرانے رسم و رواج اور طور طریقوں کو اپنائے رہے۔ تہہ بند ہے اور بنڈی سر پر ہلکی پگڑی کندھے پر ہل اور آگے بیلوں کی جوڑی صبح کا سہانا سماں ہے اور کسان (پنجاب ہو یا یوپی کا یا کسی دوسرے صوبے کا) تان لگاتا کھیتوں کی مینڈوں پر چلا جا رہا ہوگا۔

"بیلا پھولے آدھی رات گجرا کہی کے ڈاروں رے"

فیض جیسا ہم پہلے لکھ چکے ہیں اس بدلی ہوئی تہذیب کے نمائندہ نمونہ ہیں اور پھر مسدس مدوجزر اسلام۔ اودھ پنچ کی فائلوں میں انڈے بچے والی چیل چلہار اور اکبر الہ آبادی اور ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار وغیرہ کا کلام پڑھا اور انھیں قدیم تہذیب کے مٹ جانے کا احساس ضرور ہوا۔

سیاسی پس منظر

(۴)

(۱) ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۵ء تک

(۲) ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۰ء تک

(۳) ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۶ء تک

جشن دربار دلی شہنشاہ جارج پنجم کی تشریف آوری ۱۹۱۱ء اور فیض احمد فیض کی ولادت ترکی اور اٹلی کی جنگ ۱۹۱۱ء جنگ بلقان ۱۹۱۲ء اور اس کے اثرات تحریک خلافت کا وجود انگریز حکام کا ہندوستانی عہدے داروں سے غیر مساویانہ سلوک ڈاکٹر نذیر احمد کا مضمون "ایک انگریز حاکم سے ملاقات" قومی بیداری اور حصول آزادی کا جذبہ پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۶ء اور اس کے بعد پہلی جنگ عظیم کے آخر تک ہوم رول تحریک ۱۹۱۶ء لارڈ منٹو چیمسفورڈ رپورٹ ۱۹۱۹ء اور اس کے اثرات ڈاکٹر اقبال کی شاعری اور جذبۂ وطنیت۔ انقلاب روس اکتوبر ۱۹۱۷ء اکبر الہ آبادی کا کلام ۱۹۱۹ء کی اہمیت۔ آل انڈیا ہڑتال کا اعلان ۱۹۱۹ء جلیان والا باغ کا حادثہ اور جنرل ڈائر کے مظالم کانگریس اور مسلم لیگ کا اتحاد ۱۹۱۶ء کے پیکٹ کے تحت اور آگے تحریک ترک موالات لارڈ ریڈنگ کا عہد

(۱۹۲۱ء ـــــ ۱۹۲۴ء) زمینداروں کی امن سبھائیں چوری چورا ضلع گورکھپور کے تھانے کا حادثہ تحریک ترک موالات کی منسوخی ۔ فرقہ وارانہ فسادات ۱۹۲۵ء نمک قانون اور ڈانڈی مارچ ۱۹۳۰ء راؤنڈ ٹیبل کانفرنس مولانا محمد علی جوہر کا انتقال ۱۹۳۰ء ۔ دوسری عالمی جنگ (۱۹۳۹ء ـــ ۱۹۴۵ء) تحریک ہندوستان چھوڑدو ۱۹۴۲ء حکومت کے مظالم ۔ دو اہم تحریکیں اور شاعری پر ان کے اثرات ....

سیاسی پس منظر کے سلسلے میں ہم فیض احمد فیض کی شاعری کے وقفے سے بہت کچھ پیچھے لے گئے ہیں (۱۸۹۹ء سے ۱۹۳۳ء) صرف اس لیے کہ اس وقفے کے پیچھے کے واقعات بیسویں صدی کی تیسری دہائی گویا فیض کی شاعری کے وقفے سے کچھ اس طرح وابستہ ہیں کہ ان پچھلے واقعات کا اثر برابر پڑتا رہا اور ان واقعات کی کڑیاں فیض کی شاعری کے وقفے سے بری طرح مربوط ہیں بس یوں سمجھئے کہ ۔

بیسویں صدی سیاسی سماجی اور مذہبی ہنگامے اپنے ساتھ لائی ۔ ہم اور آپ سبھی جانتے ہیں کہ اس صدی کی ابتدائی تین چار دہائیوں کا وہ وقفہ ہے جب کشمیر سے لنکا تک اور بلوچستان سے برما تک برٹش حکومت کا بول بالا رہا ہے ۔ اور چھوٹے بچوں کی درسی کتابوں میں لکھا ہوا یہ بھی پڑھایا جاتا رہا ہے " برٹش حکومت میں آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا " اور یہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ ان روایات کا ساتھ دیتا ہوا نظر نہیں آرہا

تھا۔ جو اواخر انیسویں صدی میں راجا رام موہن رائے ۔ سرسید احمد اور پنڈت مدن موہن مالویہ، دادا بھائی نوروجی وغیرہ بنا چکے تھے۔ آل انڈیا کانگریس جس کو یہاں کی ایک اہم سیاسی پارٹی کہنا چاہیئے اس کا رویہ بھی اعتدال پسندانہ رہا اس لیے ملک پر اہل ثروت اور صاحب اقتدار اشخاص کا تسلط رہا۔ پھر وہ کیا اسباب تھے جن کی بدولت ہندوستانیوں میں برٹش حکومت کی طرف سے بدظنی اور شکوک پیدا ہونے لگے اور ان کے چنگل سے آزاد ہونے کا جذبہ بیدار ہونے لگا۔ آیئے ان حالات کا ذرا تفصیلی جائزہ لینے کی سعی کی جائے اور یہ بھی بتایا جائے کہ وہ واقعات اور سانحات فیض احمد فیضؔ کے عنفوان شباب تک کیا رنگ لائے؟

۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۵ء لارڈ کرزن کا زمانہ ہے اور ان کو قحط اور وبائی امراض، طاعون، کالرا، ہیضہ، چیچک وغیرہ سے مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ موصوف نے ان سے بچنے اور ان مہلک وبائی امراض سے نجات دلانے کی بڑی کامیاب کوششیں کیں۔ آبپاشی ذرائع نقل و حرکت خصوصاً ریلوے لائنوں میں اصلاح اور توسیع کی۔ "پوسا" ضلع بینی تال میں زراعتی تحقیقاتی ادارے کا افتتاح کیا اور عوام خصوصاً کاشتکاروں کی فلاح کے لیے بہت کچھ کیا گیا مگر وہ ایک ایسا کام کر بیٹھے جس نے ان کے سارے فلاح و بہبود کے کاموں پر پانی پھیر دیا اور وہ تھا تقسیم بنگال کا عمل۔

انھوں نے وائسرائے اور جمہور کے احتجاج کے باوجود بنگال کے دو ٹکڑے کر دیئے۔

(۱) مشرقی بنگال اور آسام جس میں چٹاگانگ اور مشرقی بنگال کے پندرہ اضلاع شامل اور جہاں مسلم اکثریت تھی۔

(۲) مغربی بنگال۔

اس عمل سے باشندگان مغربی بنگال خصوصیت سے متاثر ہوئے اور شدید احتجاج کیا اور یہیں سے برٹش گورنمنٹ کے خلاف جذبات ابھرنے لگے۔ بلکہ فرقہ وارانہ ذہنیت نے بھی جنم لیا۔

۱۹۰۵ء — ۱۹۱۰ء لارڈ منٹو کے عہد میں اس نفرت آمیز احتجاج میں ایسی شدت پیدا ہو گئی کہ برٹش حکومت کے عہدیداروں کے ساتھ تشدد رونما ہونے لگا یہاں تک کہ قاتلانہ حملے بھی ہونے لگے حکومت بھی اس برتاؤ اور بدسلوکی کا جواب "قوانین نافذ کر کے دینے لگی" مولانا حسرت موہانی کا یہ شعر اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے:

نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم
جبر بہ زیر نقاب دیکھئے کب تک رہے

اور ۱۹۰۵ء سے برٹش اشیاء بائیکاٹ تحریک شروع ہو گئی اور ۱۹۰۶ء کے سالانہ اجلاس آل انڈیا کانگریس دو پارٹیوں میں بٹ گئی۔

(۱) اعتدال پسند (ماڈریٹ) بوڑھے پرانے ممبر اور

(۲) تشدد پسند (ایکسٹریمسٹ) جواں سال ممبر جو مکمل آزادی کے طلب گار تھے۔ اس وقفے میں (۱) تحریک سودیشی اور برٹش اشیاء کا بائیکاٹ (۲) کانگریس کے ممبروں میں اختلاف کی تشدد (۳) ۱۹۰۹ء کے ایکٹ کے تحت جداگانہ طبقاتی انتخاب وجود میں آیا۔ ہندو مسلم، اینگلو انڈین، ہریجن وغیرہ۔ ان کوائف نے اردو شاعری پر اثر ڈالا۔ لسان العصر اکبر الہ آبادی تحریک سودیشی کا خیر مقدم اپنے مخصوص پیرائے میں اس طرح کر رہے ہیں:

تحریک سودیشی پہ مجھے وجد ہے اکبر
کیا خوب یہ نغمہ ہے چھڑا "دیس" کی دھن میں

یا

دھن دیس کی تھی جس میں گاتا تھا ایک دیہاتی
بسکٹ سے ہے ملائم پوری ہو یا چپاتی

اور تو اور فیض احمد فیض جب محض سترہ اٹھارہ سال کے تھے۔ تو کھیل کھیل میں بچوں سے کہلانے لگے "ٹوڈی بچہ ہائے ہائے امال بدیشی بائیکاٹ"۔

چنانچہ لارڈ ہارڈنگ (۱۹۱۰ء ــــ ۱۹۱۶ء) کے عہد میں ۱۹۱۲ء میں جب وائسرائے کی سواری چاندنی چوک دہلی سے گذر رہی تھی ان

پر بم پھینکا گیا۔ ان کا ایک باڈی گارڈ ہلاک ہو گیا اور وہ خود زخمی ہوئے

مسلمان اگرچہ ابھی خاموش تھے لیکن جنگ بلقان ۱۹۱۲ء اور جنگ ترکی واٹلی ۱۹۱۱ء میں بلقانیوں اور اطالیوں نے ترکی کے جس طرح حصے کر دئے تھے اور ترکوں پر مظالم کئے تھے۔ برٹش حکومت نے ان میں نہ کوئی مزاحمت کی اور نہ ترکوں کے ساتھ کسی ہمدردی ہی کا اظہار کیا۔ ان جنگوں کا تعلق اگرچہ براہ راست ہندوستانی مسلمانوں سے نہ تھا لیکن جذباتی طور پر مسلمان ترکی سلطنت کو خلافت اسلامیہ کا درجہ دیتے تھے۔ اس لیے ان کے جذبات میں بھی اشتعال پیدا ہوا۔ جس کے نتیجے میں تحریک خلافت وجود میں آئی اور آگے چل کر ہندو مسلم اتحاد میں بڑی مدد کی۔

انگریز حکمراں طبقہ عوام کی بات چھوڑئے روٴسا اور جاگیرداروں تک کے ساتھ برابر کا سلوک روا نہ رکھتا تھا۔ انگریز تعلیم یافتہ طبقے کو ایسا برتاؤ بہت ناگوار تھا اودھ پنچ لکھنؤ کی فائلیں اُلٹیے آپ کو عدم مساویانہ برتاؤ پر خطوط اور مضامین مل جائیں گے۔ مولانا نذیر احمد مشہور ناول نگار کا ایک انشائیہ "ایک انگریز حاکم سے ملاقات" پڑھ لیجئے۔ انھوں نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ ہندوستانی ڈپٹی کلکٹر کیا خواہ اس کا بادا ہی کیوں نہ ہو انگریز حاکم کی برابری نہیں کر سکتا۔ مولانا حالی کی بعض غزلیں بھی اس کی نشان دہی کرتی ہیں۔ مولانا حسرت موہانی کو بھی اس کا احساس ہوتا ہے وہ فرماتے ہیں:

دولت ہندوستاں قبضۂ اغیار میں
بے عدد و بے حساب دیکھئے کب تک رہے

لارڈ ہارڈنگ کے عہد کا امتیازی وصف "دلی دربار" رہا ہے۔ جب شہنشاہ جارج پنجم اپنی تاج پوشی کے بعد ہندوستان تشریف لائے۔ یہ دربار بڑی شان و شوکت سے منعقد ہوا۔ روایتی طور پر راجا مہاراجا اور زمینداروں کے علاوہ دو چار شاعر بھی شرکت دربار کیلئے مدعو کیے گئے۔ چنانچہ اکبر الہ آبادی نے اپنی ایک نظم "دلی دربار" میں اس کا حال بڑی خوبصورتی سے نظم کیا ہے۔

سر میں شوق کا سودا دیکھا — دہلی کو ہم نے جا دیکھا
جو کچھ دیکھا اچھا دیکھا — کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا
کچھ چہروں پر سردی دیکھی — کچھ چہروں پر زردی دیکھی
اچھی خاصی سردی دیکھی — دل نے جو حالت کر دیکھی
اچھے اچھوں کو بھٹکا دیکھا — بھیڑ میں کھاتے جھٹکا دیکھا
منہ کو اگرچہ لٹکا دیکھا — دل دربار سے اٹکا دیکھا
اوج برٹش راج کا دیکھا — پرتو تخت و تاج کا دیکھا
رنگ زمانہ آج کا دیکھا — رخ کرزن مہراج کا دیکھا
پہونچے پھاند کے سات سمندر — تحت میں ان کے بیسوں بندر
حکمت و دانش ان کے اندر — اپنی جگہ ہر ایک سکندر

(اکبر الہ آبادی)

مراعات کے سلسلے میں دو چیزیں اہم رہیں۔

(۱) فرقہ وارانہ انتخاب منسوخ کر دیا گیا۔

(۲) تقسیم بنگال کا معاملہ بھی برطرف کر دیا گیا۔ اور بنگال کا صوبہ جیسا کچھ پہلے تھا اسی حالت میں آگیا۔

غرض کہ یہ تھے وہ اسباب جنھوں نے قومی بیداری پیدا کی اور قومی تحریکیں وجود میں آئیں اور ان کے عمل میں تیزی اور توانائی پیدا ہونے لگی۔

ان تمام حالات کا اثر اردو شاعری پر پڑا اور صنف غزل بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکی۔ علامہ اقبال۔ اکبر الہ آبادی۔ مولانا حسرت موہانی وغیرہ کے کلام میں اس طرف کثرت سے اشارے ملتے ہیں۔

ہوم رُول

تحریک کا آغاز اور غزل پر اثرات

ہوم رول تحریک ۱۹۱۶ء جب ہندوستانی رہنماؤں نے اس جنگ میں غیر مشروط امداد دینے پر ہندوستانی فوجیوں کو غیر ممالک میں مرتے کٹتے دیکھا جس کا کوئی تسلی بخش نتیجہ نہیں نکلا تو انھوں نے ہوم رول کا مطالبہ کیا۔ یہ تحریک مسز اینی بیسینٹ اور لوک مانیہ تلک کی قیادت میں شروع ہوئی اور بہت جلد ہندوستان گیر تحریک بن گئی۔

ڈاکٹر اقبال پہلے عظیم شاعر ہیں جنکی غزلوں میں قومی تحریک کی گونج سنائی دینے لگی۔ چنانچہ وہ نام و نہاد جمہوریت پر اس طرح طنز بلیغ کرتے ہیں۔

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

ان کی شاعری میں بین الاقوامی مسائل کی طرف بھی توجہ ملتی ہے اور وطنیت

کے علاوہ تمام انسانیت کا درد رکھتی ہے۔ موجودہ نظام جمہوری کے پس پردہ استحصال اور ناجائز مفاد پرستی کا جذبہ کارفرما ہے۔

پنڈت برج نرائن چکبست تو اس تحریک سے اس درجہ متاثر اور اس کے شیدائی تھے کہ اس کو تقدس کا درجہ دے دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں :

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم "ہوم رول" کے بدلے

لارڈ منٹو چیمسفورڈ رپورٹ " سے ہندوستانی رہنماؤں کو اطمینان بخش تسلی نہ ہوئی اور انھیں اس کے خلاف احتجاج کرنا پڑا جس کا ذکر ہم آگے کر رہے ہیں۔

پہلی عالمی جنگ اور انقلاب روس ۱۹۱۷ء کے رجحانات کا آغاز اور اردو غزل پر اس کے اثرات

:

پہلی عالمی جنگ جاری تھی کہ اگست ۱۹۱۷ء میں روس میں انقلاب ہوا اور زار شاہی کا تختہ الٹ گیا اور اس طرح ہمارے یہاں سوشلزم کے رجحانات پیدا ہونے لگے اور ساتھ ہی ساتھ بالشویک حملے کا دھڑکا ہر وقت ہندوستان پر لگا رہتا تھا۔ (اگرچہ یہ خیال قرین قیاس نہیں تھا) پھر بھی اکبر الہ آبادی ایک ایسے شاعر ہیں جن کے اشعار سے اس

وقت کے سیاسی واقعات کا اندازہ ہوتا ہے۔

پہلی عالمی جنگ کے واقعات انھوں نے بڑی خوبصورتی سے تلمیح کے طور پر استعمال کئے ہیں:

یہ بت دل میں گھسے آتے ہیں جرمن کا ستم بن کر
مرا تقویٰ کہاں تک ان کو روکے بلجیم بن کر

اسی طرح انقلاب روس پر یہ اشعار روشنی ڈالتے ہیں۔:

تار برقی سے ہوا معلوم حالِ زار روس
شور برپا ہے کلیسا میں حرم میں دہر میں
ہمیں کیا بالشوک آتا ہے یا کہ روس آتا ہے
یہاں تو فکر سرمائی ہے ماگھ اور پوس آتا ہے

اکبر الہ آبادی جہاں سماجی و سیاسی سانحات و حادثات پر بھی اپنے مخصوص و منفرد طنزیہ انداز میں تبصرہ و تنقید کیا کرتے تھے وہیں وہ خود اپنے کو بھی نہ بخشتے تھے خود تنقیدی کے رنگ   کا ایک شعر بھی قابل ملاحظہ ہے:

؎ مدخولۂ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا
اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی ٹولیوں میں

ظاہر ہے کہ کوئی بھی مدخولۂ گورنمنٹ اور وہ بھی برٹش سامراج کا محض ایک نوکر بالشوک انقلاب پر اپنے خیالات کا حقیقی طور پر اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ پھر سخت احتساب (CENSOR) وغیرہ کی وجہ سے صحیح حالات

کا علم بھی نہیں ہو پاتا تھا۔ ان حالات میں اکبر الہ آبادی نے اگر ماگھ اور پوس کا ذکر کرتے ہوئے انقلاب روس کا ذکر کر دیا تو یہ بھی قابل لحاظ بات ہے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ انقلاب روس پورے کرۂ ارض کو ہلا دینے والا اپنی نوعیت کا پہلا ایک واقعی عجیب و غریب سیاسی انقلاب تھا جس کی دنیا بھر کے شاعروں، فنکاروں، ادیبوں اور مفکروں نے اپنے طور پر تعبیر، تشریح و تنقید کی۔ انقلابات تو دنیا میں ہوتے ہی رہے ہیں لیکن ان سب کی نوعیت حادی طور پر یہی رہی ہے کہ ان کا کردار اقلیتی کردار رہا ہے۔ یعنی یہ کہ ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس سے پہلے کے انقلابات اقلیتی طبقے کے مفاد میں رہے ہیں لیکن اکتوبر ۱۹۱۷ء کا انقلاب ایسا تھا جس کا کردار اکثریتی کردار رہا۔ یہ وہ پہلا عظیم انقلاب ہے جو اکثریت اور عوام کے حق و مفاد میں رونما ہوا۔

ایک نابینا شاعر کرم علی نے اس انقلاب کو اپنی بینائی سے تعبیر کیا...... ٹیگور نے بھی اپنے دلنشیں انداز میں اس انقلاب اور ان کی برکتوں کی تعریف کی ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے بھی اسے حق المقدور اسے لبیک کہا ہے۔

گاندھی کی طرح بیٹھ کے کیوں کاتیں گے چرخا
لینن کی طرح دیں گے نہ دنیا کو ہلا ہم

اور یہ بھی قابل قدر ہے کہ حسرت موہانی کی نگاہ یہاں تک پہنچی کہ یہ انقلاب جنم داتا کی حیثیت رکھتا ہے۔ حسرت موہانی کا یہ شعر بھی قابل قدر ہے۔

؎ لازم ہے یہاں غلبۂ احکام سوتیت
دو چار برس میں ہو کہ دس بیس برس میں

۱۹۱۹ء کا سنہ کئی لحاظ سے صرف اس لیے اہم ہے کیونکہ اس میں کئی حادثات پیش آئے۔ جو دردناک تو تھے ہی ساتھ ہی حکومت برطانیہ کے جبر و استبداد کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔ یہی وہ سنہ ہے جب مہاتما گاندھی نے منٹو مارلے رپورٹ سے بیزار ہو کر ۳۰ مارچ ۱۹۱۹ء کو آل انڈیا ہڑتال کا اعلان کیا اور ستیہ گرہ کا آغاز ہوا۔ پولس اور پبلک کے درمیان زبردست تصادم شروع ہوا۔ جلیان والا باغ امرتسر کے حادثہ کو اسی سلسلے کی ایک کڑی سمجھئے۔ جو اس طرح پیش آیا کہ دو مقامی لیڈر ستیہ پال اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو گرفتار کر لئے گئے۔ اور انھیں جلاوطن کر دیا گیا۔ اس موقع پر جمہور نے احتجاجاً ان کی رہائی کے مطالبے میں ہڑتال کی اور ڈپٹی کمشنر کے بنگلے کی طرف روانہ ہوئے اور مطالبہ کیا کہ رہنمایان موصوف کو رہا کیا جائے۔ ہال گیٹ برج پر پولیس نے ان کو روکنے کے لئے فائرنگ کر دی جس میں دو آدمی فوت ہو گئے۔ اور بہت سے زخمی ہوئے۔ مغلوب الغضب جمہور نے لاشوں کا ایک جلوس نکالا اور آتش آمیز ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ہندوستانیوں کے علاوہ کئی یوروپین بھی مارے گئے۔ جنرل ڈائر کو اس کا چارج دیا گیا انھوں نے ہر طرح کی میٹنگ کو ممنوع قرار دینے کا اعلان کیا۔ لیکن ہندوستانی رہنماؤں نے جلیان والا باغ امرتسر میں بیساکھی کے

دن ۲۰ ر اپریل ۱۹۱۹ء کو اس سلسلے میں ایک میٹنگ کا اعلان کیا جو دراصل سیاست سے غیر وابستہ تھی۔ جنرل موصوف نے چاروں طرف سے باغ کا محاصرہ کیا اور ایک طرف صرف چھوٹا سا دروازہ کھلا رہنے دیا اور وہاں پر مشین گن اس وقت تک چلتی رہی جب تک کارتوس ختم نہیں ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورا پنجاب قتل و غارت گری کا مرکز بن گیا اور مارشل لا جاری کر دیا گیا۔

کانگریس اور مسلم لیگ کا اتحاد ۱۹۱۶ء کے لکھنؤ پیکٹ کے مطابق ہو چکا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "تحریک عدم تعاون" میں تحریک خلافت کے اتحاد سے بہت زور پیدا ہو گیا۔ لارڈ ریڈنگ کے عہد حکومت ۱۹۲۱ء ۱۹۲۶ء میں "ترک موالات" برابر بڑے زور شور سے چلتی رہی اگرچہ سیکڑوں آدمی جیل جا چکے تھے پھر بھی جوش کم نہ ہوتا تھا۔ نہ ہڑتالیں ہوتی رہیں۔ بائیکاٹوں کا زور رہا۔ بدیشی کپڑے سڑکوں پر جلائے جاتے رہے۔ گاندھی ٹوپی پہننے والوں کھدر پوشوں کی پیٹھ پر ڈنڈے پڑتے رہے اور انگریزوں کی حمایت میں امن سبھائیں قائم کی گئیں جن کے سرپرست اور سربراہ زمیندار اور تعلقدار تھے۔

یہ سب کچھ ہوتا رہا تھا ۱۹۲۲ء میں ضلع گورکھپور کے پولیس تھانہ چوری چورا میں ایک جانکاہ حادثہ ہوا۔ وہاں بڑا زبردست فساد ہوا اور تھانے کو نذر آتش کر دیا گیا تھا۔

مہاتما گاندھی اس المناک حادثے کو برداشت نہ کرسکے اور اس درجہ متاثر ہوئے کہ 'تحریک ترک موالات' بند کردی۔

اس کے بعد اس اتحاد نے ہندو مسلم کشیدگی اختیار کی اور ۱۹۲۵ء سے کئی سال متواتر ہندو مسلم فسادات ہوتے رہے کاکوری ڈکیتی کیس، میرٹھ بم سازی مقدمہ نمک قانون کے خلاف ڈانڈی مارچ ۱۹۳۰ء راؤنڈ ٹیبل کانفرنسوں کا انعقاد ہوتا رہا۔ مولانا محمد علی جوہر کا یہ کہنا کہ آزادی یا موت اور ان کا انتقال دوسری عالمی جنگ ۱۹۳۹-۱۹۴۵ء اور اسی درمیان میں دو اہم تحریکیں وجود میں آئیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ اساتذہ اور ادیبوں اور شاعروں کا فوج میں اپنی خدمات پیش کرنا ایک اہم بات رہی۔ یہ روایت ملک کے ہر صوبے میں چلتی رہی خصوصیت سے پنجاب اور صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ (موجودہ اترپردیش) میں اس کا بڑا زور رہا جس کا ذکر ہم آگے کریں گے۔

۱۹۴۲ء کی تحریک ہندوستان چھوڑ دو تک پہنچتے ہی ساتھ ہی ساتھ مسٹر محمد علی جناح کی قیادت میں مطالبہ پاکستان کا تقاضا تیز سے تیز تر ہوتا گیا۔ ۱۹۴۵ء ۱۹۴۶ء میں پھر ہندو مسلم کشیدگی میں تشدد اور آخرکار اگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کا بٹوارہ ہوجاتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ کشت و خون غارت گری لوٹ مار ہوتی ہے کہ انسانیت چیخ اٹھتی ہے۔

اس طرح بیسویں صدی گوناگوں انقلابات اپنے ساتھ لے کر آئی اور ہمارے شعراء ان سب حادثات اور کوائف سے متاثر ہو کر اپنے جذبات کا اظہار اپنی تخلیقات اور شاعری میں کرتے رہے۔ اور ہماری غزل بھی ان حوادثات سے متاثر ہوتی رہی اور دردناک جذبات کا مظاہرہ ہوتا رہا۔

دو اہم تحریکیں

رجحانات اور انکا اثر غزل پر

(۱) سوشلزم اور بالشوک رجحانات:-

یوں تو ہمارے یہاں صحیح معنی میں سوشلزم کا آغاز انقلاب روس ۱۹۱۷ء کے بعد سے ہوا لیکن اواخر انیسویں صدی میں کچھ ایسے آزاد خیال لوگ تھے جن کا ذہن سوشلسٹ نظام کی طرف مائل تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء میں اروند گھوش نے "نیو لیمپ آف انڈیا" کے عنوان سے کئی مضامین شائع کئے کانگریس پارٹی پر بورژوا طبقے کی سربراہی اور تسلط دیکھ کر اس کی مذمت کی اور محنت کش طبقے کی حمایت میں اشارے بھی کئے انقلاب روس کے بعد فوراً العبد ۱۹۱۸ء میں دلّی کے خیری برادر عبدالجبار خیری اور عبدالستار خیری ماسکو پہنچے اور وہاں تقریریں بھی کیں۔ یہ خیال غلط ہے کہ

روس پہنچنے والے پہلے شخص مسٹر مہندر پرتاپ تھے۔ جیسا مسٹر ایودھیا سنگھ نے اپنی تصنیف "بھارت کا مکتی سنگرام" صفحہ ۲۷۴ [1] پر واضح طور پر لکھا ہے کہ خیری برادر نے مسٹر لینن سے ملاقات بھی کی۔ یہ بات صحیح ہے کہ ایک وفد کی صورت میں پہلے پہل مئی ۱۹۱۹ء میں مولوی عبد الرب پیشاوری اور مولوی برکت اللہ کے ساتھ مہندر پرتاپ اور کچھ دوسرے اشخاص بھی ماسکو گئے مزدور تھے اور لینن سے ملاقات بھی کی۔ اس کے بعد شوکت عثمانی۔ فضل الہٰی وغیرہ مہاجر کی حیثیت سے روس گئے اور واپسی پر مارکس اور لینن کے نظریات اپنے ساتھ لائے اور دونوں پر حکومت برطانیہ نے "پیشاور سازشی مقدمہ" بھی چلایا۔

یورپ میں رہنے بسنے والے ہندوستانیوں نے ۱۹۱۷ء میں برلن میں ایک انجمن قائم کی اور سویڈن کی سوشلسٹ پارٹی کے اشتراک میں اسٹاک ہوم میں ایک اجلاس بھی کیا۔

برلن کی سوشلسٹ پارٹی کے سربراہ بھوپیندر دت اور دیریندر چٹو پادھیا تھے۔ اس کے بعد مسٹر اونی مکرجی اور مسٹر ایم۔ این رائے نے ۱۷ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں تاشقند میں کمیونسٹ پارٹی کی داغ بیل ڈالی۔ مگر صحیح معنوں میں اس پارٹی کی بنیاد ۱۹۲۴ء میں کانپور میں مسٹر

---

[1] بھارت کا مکتی سنگرام صفحہ ۲۷۴

ستیہ بھگت نے ڈالی۔ ۱۹۲۴ء میں کانپور بالشویک سازشی مقدمہ چلایا گیا۔ اور یہ فیصلہ مسٹر ایم۔ این رائے کے دو مضامین "انڈین پرابلم" اور انڈیا ان ٹرانسزیشن" کی وجہ سے ہوا۔

ان پابندیوں کے باوجود سوشلسٹ تحریک بڑھتی ہی رہی اور سرمایہ داری کے خلاف باغیانہ جذبات ابھرتے ہی رہے۔ ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۷ء ورکرس پیزینیٹ پارٹی (کسان مزدور پارٹی) اور ٹریڈ یونین تحریک کا آغاز ہوا۔ ۱۹۲۷ء میں مدراس میں منعقد کانگریس کے اجلاس میں سوشلسٹ نظریات کی حمایت میں ایک قرارداد منظور کی گئی۔ حالانکہ یہ بات گاندھی جی کی رائے کے خلاف تھی۔ ان سب رجحانات اور نظریات کا اثر یہ ہوا کہ کسانوں اور مزدوروں میں بیداری پیدا ہوئی اور اپنے حقوق کے مطالبات میں ہڑتالوں کی کثرت ہوتی رہی۔ اور ہمارے شعراء ان رجحانات کی ترجمانی کرتے رہے۔ چنانچہ ڈاکٹر اقبال پہلے شاعر ہیں جو تمام دنیا کے محنت کش طبقے کی زبوں حالی پر بے چین نظر آتے ہیں۔ اور انھوں نے سوشلسٹ رجحانات کی ترجمانی بھی کی ہے۔ مثلاً

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں ٹوٹے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

بندۂ مزدور کو جاکر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات

اے کہ تجھکو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر

شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی

اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے

مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اس طرح اردو شاعری اور غزل میں احترام انسانیت اور بیداری جمہور، محنت اور مشقت کی اہمیت وغیرہ کے تصورات نظم ہونے لگے۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو

کاخ امراء کے در و دیوار ہلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقین سے

کنجشک فرو مایہ کو شاہیں سے لڑا دو

سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ

جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روٹی

اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

دوسری تحریک جس نے اردو شعر و ادب پر گہرے انقلابی اثرات ڈالے وہ ہے ترقی پسند تحریک۔ مارکس اور اینگلز کی تحریروں کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے

انھیں معلوم ہے کہ ان لوگوں نے سب سے پہلے ادب کے مطالعے کے لیے تاریخی شعور کو ضروری سمجھا ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ روایت پرستی سے اجتناب کو بھی ضروری سمجھا۔ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ انگریزی تعلیم اور ملک میں حکومت برطانیہ کے جبر و استبداد کے خلاف کئی تحریکیں منظر عام پر آچکی تھیں۔ اور جمہور میں ایک نئی بیداری کی لہر دوڑ گئی۔ اور اس میں سب سے زیادہ تیزی اس وقت پیدا ہوئی جب ۱۹۳۳ء سے جرمنی میں ہٹلر کی سرکردگی میں فاشزم نے سر اٹھایا۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنی تصنیف "اردو میں ترقی پسند تحریک"[1] صفحہ ۲۹-۲۸ پر اس کی وضاحت اس طرح کی ہے۔

"۔۔۔۔ فاشزم کی بدولت پورے یورپ کو ایک سیاسی بحران سے گذرنا پڑا اس سیاسی بحران اور دوسری جنگ عظیم کے اثرات سے پورے مغرب میں جو ہلچل اور بے چینی پیدا ہو گئی اس کا اثر ان ہندوستانی طلبہ پر خاص طور سے پڑا۔ جو یورپ کی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ یہ نوجوان فاشزم کے ستائے ہوئے ادیبوں اور شاعروں اور آرٹسٹوں کے مصائب اور ہٹلری مظالم دیکھ کر اس درجہ متاثر ہوئے کہ اس گروہ نے آہستہ آہستہ ۱۹۳۵ء میں ایک ادبی حلقے کی شکل اختیار کرلی۔ اس حلقے میں سجاد ظہیر کے علاوہ انگریزی زبان کے ادیب اور ناول نگار ملک راج آنند بنگالی کے ادیب ڈاکٹر جیوتی گھوش اور پرمود سین گپتا اور اردو کے ایک اور ادیب شاعر ڈاکٹر محمد دین تاثیر شامل تھے۔ اس طرح ان سب کے ذہن میں ہندوستانی

---

[1] اردو میں ترقی [illegible] صفحہ [illegible]

ادیبوں کی ایک انجمن بنانے کا خیال ہوا اور انجمن کی تشکیل کے لیے باقاعدہ مینی فسٹو تیار کیا گیا۔ اور اس کا پہلا باقاعدہ جلسہ لندن کے نان کنگ ریسٹوران میں ہوا۔ اور اس کا نام "ہندوستانی ترقی پسند ادیبوں کی انجمن رکھا گیا۔"

مذکورہ بالا انجمن کے متحرکار نے اسے ہندوستان میں قائم کرنا چاہا۔ چنانچہ اس مینی فسٹو کی سائیکلو اسٹائل کاپیاں ملک کے دوسرے ادیبوں شاعروں اور دانشوروں کے ملاحظہ اور ان کی رائے حاصل کرنے کے لیے بھیجی گئیں۔

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی اس کتاب کے صفحہ ۳۵ - ۳۴ پر اس سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں۔[1]

"جن دوستوں کے پاس سجاد ظہیر نے خطوط لکھے تھے ان میں ڈاکٹر اشرف تھے۔ جو ان دنوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تاریخ کے لکچرر تھے۔ ڈاکٹر محمود الظفر جو ایم۔ اے او کالج امرتسر کے پرنسپل تھے۔ اور ان کی بیوی ڈاکٹر رشیدہ جہاں جو ان دنوں امرتسر میں ہی ان کے ساتھ رہتی تھیں اور ڈاکٹری کرتی تھیں۔ کلکتہ میں پروفیسر ہیرن مکرجی جن ہوں نے آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ الہ آباد میں علی احمد تھے جو ان دنوں یونیورسٹی میں انگریزی کے لکچرر تھے۔ ابھی یہ خط

---

[1] اردو میں ترقی پسند تحریک صفحہ ۳۵ - ۳۴

و کتابت جاری ہی تھی کہ سجاد ظہیر اپنی بیرسٹری کی تعلیم ختم کرکے ۱۹۳۵ء کے آخر میں ہندوستان واپس آگئے۔ یہاں آنے کے بعد سب سے پہلے انھوں نے اپنی اسی اسکیم کو عملی جامہ پہنایا۔ واپسی میں ان کا قیام الہ آباد میں تھا۔ جہاں ان کے والد وزیر حسن رہتے تھے۔ الہ آباد میں احمد علی کے علاوہ اس وقت فراقؔ گورکھپوری اور ڈاکٹر اعجاز حسین بھی تھے۔ ہندی کے ادیب شیودان سنگھ چوہان اور نریندر شرما اور دونوں جوان طالب علم احتشام حسین اور سید وقار عظیم جو اس وقت ایم۔ اے کے طالب علم تھے ان سب ادیبوں نے سجاد ظہیر کے منصوبے کی تائید کی۔ نیز پنڈت امرناتھ جھا وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی اور ڈاکٹر تاراچند نے بھی ہمت افزائی کی چنانچہ الہ آباد میں ترقی پسند ادیبوں کا ایک حلقہ بن گیا جس میں اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے ادیب شامل تھے۔"

اتفاق سے اسی زمانے میں (دسمبر ۱۹۳۵ء) ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی ایک کانفرنس ہوئی۔ جس میں مولوی عبدالحق۔ منشی پریم چند اور جوشؔ ملیح آبادی تشریف لائے۔ سجاد ظہیر نے ان سے ملاقات کی۔ اور ادبی تحریک کے اس منصوبے کو سامنے رکھا۔ ان کو اپنا مینی فسٹو دکھایا۔ ان تینوں حضرات نے اس کے مقاصد سے اتفاق کیا اور اس پر اپنے دستخط کردیئے۔

الہ آباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے تشکیل کے ساتھ ہی ہندوستان

کے دوسرے شہروں میں ترقی پسند خیالات رکھنے والے ادیبوں نے اپنے یہاں انجمنیں قائم کیں۔ علی گڑھ میں ترقی پسند مصنفین کا پہلا جلسہ ۱۹۳۶ء کے اوائل میں خواجہ منظور حسین کے مکان پر ہوا۔ علی سردار جعفری اس وقت وہاں طالب علم تھے۔ انھوں نے "جدید ادب اور نوجوان کے رجحانات" پر ایک مقالہ پڑھا جو علی گڑھ میگزین میں شائع ہوا۔ جس کے ایڈیٹر اس زمانے میں جاں نثار اختر تھے۔ اس زمانے میں علی گڑھ یونیورسٹی کے نوجوانوں میں خاص طور پر اشتراکیت سے دلچسپی لینے والے طالب علم جمع ہو گئے تھے۔ سردار جعفری اور جاں نثار اختر کے علاوہ حیات اللہ انصاری، مجاز، اختر حسین رائے پوری، خواجہ احمد عباس، شاہد لطیف اور سبط حسین وغیرہ کی بدولت کئی سال پہلے ہی سے یہاں نئے ادبی رجحانات کو ترقی مل رہی تھی۔"

آگے چل کر وہ تحریر فرماتے ہیں کہ کن اشخاص کی بدولت اس تحریک نے عمومی مقبولیت حاصل کی اور اس تحریک نے ہندوستان گیر صورت اختیار کی۔

سبط حسن اس وقت علی گڑھ کی تعلیم سے فارغ ہو کر حیدر آباد دکن میں قاضی عبدالغفار کے اخبار "پیام" میں کام کرتے تھے۔ انھوں نے حیدر آباد دکن میں ادیبوں کو اس تحریک کے لیے منظم کیا اور قاضی عبدالغفار نے خاص طور پر اس میں دلچسپی لینی شروع کی۔ سجاد ظہیر نے الہ آباد میں انجمن کی تشکیل کے بعد پنجاب کا دورہ کیا اور امرتسر اور لاہور میں فیض احمد فیض

محمود الظفر، ڈاکٹر رشیدہ جہاں وغیرہ کی مدد سے پنجاب کے ادیبوں سے ملے اور وہاں اختر شیرانی نے انجمن کے مینی فیسٹو پر دستخط کئے اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم لاہور انجمن کے عارضی سکریٹری چنے گئے۔ صوبہ بہار میں سہیل عظیم آبادی تمنائی اور اختر اورینوی نے ایک حلقہ قائم کیا۔

اختر حسین رائے پوری نے رسالہ اردو جولائی ۱۹۳۵ء کے شمارے میں "ادب اور زندگی" کے عنوان سے ایک معرکتہ الآرا مقالہ لکھا اور اس طرح ان کی کوششوں سے سی۔ پی (مدھیہ پردیش) میں انجمن قائم ہوئی۔

ہیرن مکرجی نے بنگلہ ادیبوں کو ہموار کر کے کلکتہ میں انجمن کی تشکیل کی۔ اس طرح بہت تھوڑے عرصے میں بنگلہ، ہندی، گجراتی، تیلگو، تامل وغیرہ زبانوں میں اس تحریک نے مقبولیت حاصل کرلی۔ اور یہ تحریک ہندوستان گیر بن گئی۔ اور بلند رتبہ شخصیتوں اور شاعروں نے اس کے مینی فیسٹو پر نہ صرف دستخط کیے بلکہ ستائش کر کے زوردار تائید بھی کی۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ آچاریہ نریندر دیو۔ ڈاکٹر ٹیگور۔ ڈاکٹر اقبال۔ ڈاکٹر عبدالحق منشی پریم چند۔ مولانا حسرت موہانی۔ جوش ملیح آبادی۔ فراق گورکھپوری پنڈت امرناتھ جھا۔ چودھری محمد علی ردولوی۔ ڈاکٹر عبدالعلیم۔ اوماشنکر جوشی (گجراتی زبان) پروفیسر سنت سنگھ (پنجابی) پروفیسر رگھوونش کمار رگھو بنی چوپڑا وغیرہ اس ضمن میں آتے ہیں۔

اور جب پہلی کل ہند ۱۹۳۶ء اور دوسری کل ہند کانفرنس ۱۹۳۸ء
کلکتہ میں منعقد ہوئی جن میں ہندوستان کی تمام علاقائی زبانوں کے ادیب
اور شاعر بلند مرتبہ اشخاص بڑے جوش وخروش سے شریک ہوئے۔
فیض احمد فیض اس تحریک کے سرگرم کارکنوں و رہنماؤں میں شمار کئے جانے
لگے ۔غرضیکہ علی گڈھ تحریک کے بعد جس کا دائرہ صرف اصلاح سماج اور
زبان تک رہا اس ترقی پسند تحریک نے ہندوستان کی ساری زبانوں
کے شعر وادب پر جو انقلابی اثرات ڈالے کوئی دوسری تحریک نہ ڈال سکی
اور اردو غزل اس ترقی پسند تحریک سے جس قدر متاثر ہوئی اور اس
میں جو تبدیلیاں ہوئیں دوسری صنف ادب میں ایسی تبدیلیاں نہ ہوئیں
اور ہمیں اردو غزل میں اس طرح کے اشعار ملنے لگے ۔:

؎ یہیں بہشت بھی ہے حور و جبرئیل بھی ہے
تری نگہہ میں ابھی شوخئ نظارہ نہیں

(ڈاکٹر اقبال)

؎ اس انجمن دہر کا ہر تازہ تغیّر
میرے لئے بیتاب ہے معلوم نہیں کیوں

(جگر)

؎ فکر جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

(جگر)

اور اس غزل خواں سے مراد ان کی مراد حسن و عشق کی روایاتی غزل سمجھنا چاہیئے ۔

ذرا آہستہ لے چل کاروانِ کیف و مستی کو
کہ سطحِ ذہنِ عالم سخت ناہموار ہے ساقی

(جوشؔ)

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

(اصغرؔ گونڈوی)

بنائے غم کی خیر ہو کہ آج آہِ واپسیں
چلی دلوں کی وادیوں سے آندھیاں لئے ہوئے

(فانیؔ بدایونی)

غزل کیا اک شرارِ معنوی گردش میں ہے اصغر
مگر افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

(اصغرؔ)

یہاں کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

(اصغرؔ)

ـــہ یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

(شاد عظیم آبادی)

ـــہ لازم ہے یہاں غلبۂ احکام سویت
دو چار برس میں ہو کہ دس بیس برس میں

(حسرت موہانی)

ـــہ گاندھی کی طرح بیٹھ کے کیوں کاتیں گے چرخا
لینن کی طرح دیں گے نہ دنیا کو ہلا ہم

(حسرت)

فیض احمد فیض ایم۔اے۔او کالج امرتسر میں انگریزی کے لکچرر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے کہ ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فسطائیت کرۂ ارض پر ایک نئے قہر کی شکل میں نمودار ہو رہی ہے۔ ہٹلر اور مسولنی اپنے آپ کو دنیا کی اعلیٰ ترین نسل تصور کرتے تھے اور اس لحاظ سے ان کا عقیدہ تھا کہ دنیا پر حکومت کرنا ان کا ازلی اور ابدی حق ہے۔ اور ان کی پشت پناہی وہاں کا سرمایہ دار طبقہ کر رہا تھا۔ ہمارے یہاں بھی فسطائی تنظیم بن چکی تھی۔ اور تعجب یہ ہے کہ علی گڈھ یونیورسٹی اسکا مرکز بنی۔ یہاں بھی فسطائی تحریک کا براہ راست رشتہ عالمی فسطائی تحریک سے تھا۔ پنجاب کی "خاکسار تحریک" بھی بہت کچھ اسی کے زیر اثر تھی۔

ڈاکٹر ایوب مرزا کے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے جو انھوں نے فیض سے کیا تھا کہ آپ نے انگریز کی نوکری کی اور اس وقت کی جب آپ کمیونسٹ مینی فیسٹو پڑھ چکے تھے۔ فیض نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا۔

"یہ وہ وقت تھا جب فاشزم خوں خوار درندے کی طرح یورپ اور ایشیا میں خون ریزی کر رہا تھا۔ اور ہمیں فاشزم کے خلاف دلی نفرت تھی اور ہم اس کے عمل کو بڑی حقارت سے دیکھتے تھے۔ اسی کا مقابلہ کرنے کے لیے ہم فوج میں داخل ہوئے" اور یہ بھی ہوا کہ کچھ ادیب اور شاعر ہم سے پہلے فوج میں داخل ہو چکے تھے۔ مجید ملک صاحب کے ٹیلی فون نے مجھ پر زیادہ اثر کیا۔ انھوں نے کہا تھا فیض تم فوج میں آجاؤ۔ تمہاری بڑی ضرورت ہے" [1]

دراصل فیض احمد فیض کا تعلق پبلک ریلیشن (رابطہ عامہ) اور اطلاعات سے تھا۔ ورنہ سچ پوچھیے تو فیض کا نظریہ وہی رہا جو انھوں نے یوں پیش کیا ہے۔

سو پیکاں تھے پیوست گلو، جب چھیڑی شوق کی لے ہم نے
سو تیر ترازو تھے دل میں جب ہم نے رقص آغاز کیا

---

[1] ہم کہ ٹھہرے اجنبی — ڈاکٹر ایوب مرزا — صفحہ ۵۷

جس خاک میں مل کر خاک ہوئے وہ سرمۂ چشم خلق بنی
جس خار پہ ہم نے خوں چھڑکا، ہم رنگِ گل طناز کیا

ڈاکٹر ایوب مرزا نے پھر سوال کیا آپ کی شاعری میں فاشزم کے خلاف اس زمانے کی کوئی نظم یا غزل نہیں ملتی۔ فیضؔ نے برجستہ جواب دیا۔

"یہ بات درست ہے کہ میں نے عدیم الفرصتی کے باعث اس زمانے میں بہت کم لکھا پھر بھی 'تیرگی ہے کہ امنڈتی ہی چلی آتی ہے'، 'پھر نور سحر دست و گریباں ہے سحر سے'، 'میرے ہمدم مرے دوست'، اسی دور کا کلام ہے اور سیاسی لیڈر کے نام جو نظم ہے وہ ہم نے مسٹر گاندھی کے لیے لکھی تھی۔" [۱]

پاکستان بن جانے کے بعد بھی جمہور اور متوسط طبقے کے لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ وہ جمہوری حقوق سے جو انھیں ملنا چاہیئے محروم ہیں اور پرانے مسلم لیگی لیڈر اپنے اقتدار اور عظمت کو برقرار رکھنے کے لیے دوسری ابھرتی ہوئی پارٹیوں کو آگے بڑھنے نہیں دیتے ہیں۔ کسان مزدور پارٹی، ٹریڈ یونین فیڈریشن وغیرہ جماعتوں کو پس پشت ڈال رہے تھے۔ اسی سے فیض احمد فیضؔ کا تخیل بھی متاثر ہوا۔ صرف فیضؔ ہی نہیں مولانا ظفر علی خاں (زمیندار) اور دوسرے اخبارات اور رسائل حکومت کی بے انصافیوں کے خلاف زوردار آرٹیکل لکھتے رہے۔ اور جیل بھی جاتے رہے۔ احتجاجی جلوس نکلتے رہے۔ اور لاٹھی چارج بھی ہوتا رہا

---

[۱] ہم کہ ٹھہرے اجنبی   ڈاکٹر ایوب مرزا   صفحہ ۸۰

یہاں تک کہ ۱۹۵۱ء میں پاکستانیوں کو پہلے اسمبلی الکشن کا موقع ملا تو پرانے مسلم لیڈر کے مقابلے میں مزدور پارٹی کے ایک رہنما الکشن میں کھڑے ہوئے اور ان کو شکست دینے کے لیے پرانے مسلم لیگی لیڈر اجتماعی کوشش کرنے لگے۔ اس طرح فیضؔ کا یہ کلام صادق آتا ہے

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

ابھی چراغ سر رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

اور مزدور اور پس ماندہ طبقے کو ترقی کی راہیں دکھانے کے جرم میں وہ سیفٹی ایکٹ کے تحت جیل بھیج دئے گئے۔ قید تنہائی کی سزا بھگت ہی رہے تھے کہ انھیں راول پنڈی سازش کیس میں ماخوذ کرکے حیدرآباد (سندھ) سنٹرل جیل بھیج دیا گیا۔

شعری اور ادبی پس منظر

فیضؔ کے والد بزرگوار خواہ شاعر نہ ہوں لیکن وہ علم دوست اور شاعر نواز ضرور تھے۔ ڈاکٹر اقبالؔ کے علاوہ شمالی ہندوستان کے دوسرے شاعروں سے ان کے دوستانہ تعلقات بھی تھے۔ فیض احمد فیضؔ کے دور طفلی کے بعد بھی روایتی مشاعروں کا بڑا زور رہا ہے اور یہ چیزیں فیضؔ کی شاعرانہ ذہنیت پر اثر انداز ہوتی رہیں۔

فیضؔ کے عنفوان شباب تک لاہور صحافت اور شعر و شاعری کا مرکز بن چکا تھا۔ یہ وہ لاہور ہے جہاں ۱۸۷۴ء میں کرنل ہال رائڈ کے ایماں پر مولانا محمد حسین آزادؔ نے جدید طرز کے مشاعروں کا آغاز کیا تھا۔ جو تحریک سرسید کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔ لاہور صحافت کا گڑھ بن گیا تھا۔ مخزن، ہمایوں، ادبی دنیا، عالم گیر، نیرنگ خیال وغیرہ کے علاوہ صوفی، مست قلندر، پیسہ، اخبار، تہذیب نسواں ...... وغیرہ رسالے شائع ہو رہے تھے۔ فیض احمد فیضؔ فطری طور پر مطالعہ کے بڑے شوقین تھے۔ ان سب کا مطالعہ ضرور کرتے رہے ہوں گے۔

فیض احمد فیضؔ کے عنفوان شباب کا وہ زمانہ ہے جب ڈاکٹر اقبالؔ، حفیظ جالندھری، جوشؔ ملسیانی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم وغیرہ کا پنجاب

ہیں اور اس طرف جوش ملیح آبادی، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی چکبست، ثاقب لکھنوی، انور لکھنوی وغیرہ کی شاعری کا چرچا رہا۔ فیض نے یقیناً ان سب کے کلام کا مطالعہ کیا ہوگا۔

اس سلسلے میں ہمیں وہ مخصوص نشستوں کو بھی نہ بھولنا چاہیئے جن کا آغاز خواجہ میر درد اور دوسرے اہل ثروت اشخاص کے وہاں سے ہوا اور یہ روایت فیض کے عنفوان شباب تک چلتی رہی۔

یہ وہ دور ہے جب تعلیم گاہوں کالجوں وغیرہ میں سال میں ایک دو بار مشاعروں کی تقریب ایک لازمی روایت بن گئی تھی۔ فیض کے طالب علمی کے زمانے میں بھی یہ روایت چلتی رہی تھی۔ ادبی نشستوں کا بھی رواج رہا۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور احمد شاہ پطرس بخاری کے وہاں بھی مخصوص شاعرانہ نشستیں ہوتی رہیں۔ جن میں فیض احمد فیض کو بھی شرکت کا موقع ملتا رہا۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور احمد شاہ پطرس بخاری جیسے مشہور اور معروف شاعر اور ادیب ان کے استاد رہے۔ اس سلسلے میں بیخود موہانی جو شیعہ کالج لکھنؤ میں لکچرار تھے ان کا بھی نام لیا جا سکتا ہے۔ مختصر یہ فیض احمد فیض پر خاندانی ماحول سے لے کر روایاتی مشاعروں تک کا بے پناہ اثر رہا اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے "غزل" سے شاعری کا آغاز کیا اگرچہ اس دوران میں انھوں نے نظمیں بھی کہیں، لیکن ان کی شاعری کا پہلا دور غزل گوئی پر مشتمل ہے اس بارے میں خط نمبر ۳۶ مورخہ ۲۳ رمئی ۱۹۵۲ء میں مسز ایلس کے نام خود لکھتے ہیں :

"میرا خیال تھا کہ نوجوان حسیناؤں کی صف سے
ہمارا مداح کب کے رخصت ہو چکے ہوں گے
ان میں تو اپنا چرچا اس زمانے میں تھا جب
ہم شعر میں عاشقانہ رونا دھونا کیا کرتے تھے
اگر انھیں ہمارا کلام اب بھی پسند ہے تو
اس کا مطلب ہے کہ نئی نسل ایسی کم عقل نہیں
جیسا کہ ہم سمجھتے تھے اور انھیں بالغ زندگی کے
وسیع تر اور عمیق تر جذبات کا شعور بھی ہے۔"[1]

لاہور کا رسالہ "مخزن" اپنے وقت کا ایک بلند پایہ رسالہ تھا۔ اگرچہ ہم اس کو کسی ادبی تحریک کے ضمن میں جگہ نہیں دے سکتے پھر بھی ڈاکٹر سید عبداللہ نے اسے کئی ادبی تحریکوں کا حرف اول قرار دیا ہے۔

اتنی بات ضرور ہے کہ مخزن کے قلم کاروں نے نثری ادب میں زیادہ اور نظم میں کم لطیف تخیل پیدا کیا۔ جمالیت کی روح بیدار کی۔ نیاز فتح پوری یہی چیز نگار میں پیش کر رہے تھے۔ جس کو اس وقت ادب لطیف کا نام دیا جاتا تھا اور ٹیگوری اسٹائل کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یہ روش الفاظ کی سعیدہ گری تشبیہات کی قدرت

---

[1] صلیبیں مرے دریچے میں فیض احمد فیض صفحہ ۸۷

کا نمائندہ تھا۔ حفیظ ہوشیار پوری اور اختر شیرانی وغیرہ نظم میں اس اسلوب کی نمائندگی کر رہے تھے۔

بات دراصل یہ ہے کہ بیسویں صدی کی تین چار دہائیاں عجیب خلفشار کا زمانہ رہی ہیں۔ خواص کے علاوہ عوام بھی ذہنی الجھنوں میں پھنس کر رہ گئے تھے اور لوگ فکری اور فلسفیانہ شعر و ادب کی طرف متوجہ نہ ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب لطیف کی نشو و نما ہوتی رہی اور اسی رجحان کے تحت رومانیت نے جنم لیا۔

یہ وہ وقت تھا جبکہ سماج کے مانند شعر و ادب بھی دو حصوں میں بٹ چکا تھا ایک گروہ وہ تھا جو رؤسا، امراء، جاگیرداروں، استعمار پرستوں مہاجنوں اور سیٹھوں پر مشتمل تھا۔ رجعت پسند شعراء اور ادیب ان کے لیے سستا ادب رومانی اور جاسوسی صورت میں پیش کر رہے تھے۔ اور اسطرح ان کی بوالہوسی کی تسکین کا سہارا بن رہے تھے۔ دوسرا طبقہ ان غرباء اور مساکین کا تھا جن پر "کنواں کھودو اور پانی پیو" کی کہاوت صادق آتی ہے۔ اس گروہ میں محنت کش، مزدور کسان، دستکار اور درمیانی طبقے کے وہ لوگ آتے ہیں جو چھوٹی چھوٹی ملازمتوں پر مامور تھے اور اسی سلسلے میں مجاہدین آزادی کو بھی شامل کر لیجئے۔

پہلے گروہ پر اپنے اپنے ذاتی مفاد کے تحت وہ بے حسی طاری تھی کہ انھیں نہ تو شعر و ادب سے کوئی خاص دلچسپی تھی اور نہ ملک کی

آزادی کا خیال نہ ہی وہ کروڑوں انسانوں کی بے مائگی اور پریشان حالی کی طرف متوجہ تھے۔ جو برسہا برس سے حیوانوں کی طرح زندگی بسر کر رہے تھے۔

دوسرا گروہ ان کی زندگی کو ایک نیا اور روشن موڑ دینے کا خواہاں تھا۔ یہ گروہ ملک کو برٹش سامراج کے چنگل سے نجات دلانے اور ترقی کی راہیں دکھانے کا خواہاں تھا۔ وہ سماج کے روایاتی نظام میں ایک انقلاب پیدا کرنا چاہتا تھا۔ ایسا انقلاب جو انسان کو انسان کا خون چوسنے سے بچا سکے اور پچھڑے ہوئے گروپ میں ایسی بیداری پیدا کر سکے کی وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔

صاف ظاہر ہے کہ اوّل تو پہلے گروپ کو شعر و ادب سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور اگر تھی بھی تو وہ ایسا ادب چاہتے تھے جو ان کی بوالہوسی اور ہوس پرستی کو تسکین دے سکے۔ ایسی صورت میں فحش رومان ہی پنپ سکتا ہے اور ترقی پسند تحریک سے پہلے ایسا ہوتا رہا تھا۔ اور اسی کو ہم "ادب برائے ادب" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اسی جذبے کے تحت شعری اور ادبی دنیا میں رومانی رجحانات کی نشو و نما ہوتی رہی۔

رومانیت دراصل زندگی کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھنے کا نام ہے۔ جس میں حقیقت سے زیادہ جذباتیت غالب رہی ہے۔ ایک رومان پرور شاعر اور ادیب بھی روایتی سماج کے بندھنوں سے چھٹکارا پانے کا خواہاں ہے۔ مگر اس کا یہ جذبہ زیادہ تر مطلق العنانی کی حد میں داخل ہو

جاتا ہے۔ وہ اس دنیا سے فرار ہو کر کسی ایسی دنیا میں جانا چاہتا ہے جو خود اس کی بنائی ہوئی ہو اور بے انکس کا ہاتھی بن کر جو چاہے کرتا رہے اور اس پر کوئی روک ٹوک نہ ہو۔

مخزن کے ادب لطیف کی اسٹائل نے اس جذبے کو بڑی تقویت بخشی۔ اختر شیرانی۔ میراجی وغیرہ اس کے نمائندہ شاعر ہیں عظمت اللہ خاں حیدر آبادی اور ن م۔ راشد نے شعری ہیئت میں بھی تبدیلیاں کیں۔

دوسرا گروہ ترقی پسند تحریک کے ہم نواؤں پر مشتمل تھا اور وہ پہلے گروپ کے برعکس شعر و ادب پیدا کرنے کا خواہاں تھا جس کو ہم "ادب برائے زندگی" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اگرچہ اس تحریک سے کوئی ساٹھ ستر سال پہلے سرسید کی علی گڑھ تحریک موجودہ شعری ادب خصوصاً غزل کی اصلاح کے درپئے ہوئی اور شمس العلماء مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری کے ذریعے اسلوب غزل کے خلاف آواز بلند کی۔ ساتھ ہی ساتھ سرسید احمد نے تہذیب الاخلاق کا اجراء کر کے اردو نثر میں مقفی اور مسجع نثری پیرایۂ ترسیل کی جگہ سادہ نثر کو رواج دینے کی کوشش کی۔ عربی کے مغلق الفاظ عجیب و غریب ضرب الامثال، تشبیہات اور دور از کار استعاروں کے استعمال سے احتراز کرنے کی ترغیب دی۔ انجمن پنجاب لاہور نے کرنل

ہال رائڈ کی رہنمائی میں اس سلسلے میں لائق ستائش کام کیا۔ اور اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ سرسید احمد کی علی گڑھ تحریک اور انجمن پنجاب لاہور نے جدید شاعری کی تحریک کو پروان چڑھایا۔ علی گڑھ تحریک کے زیر اثر نشو ونما پانے والی اس جدید شاعری کی بنیاد مقصدیت اور افادی ادب پر تھی۔ سرسیّد احمد کے مضامین، مولانا حالؔی اور مولانا آزاد کی شاعری میں خطیبانہ لہجہ پایا جاتا ہے۔ اسں خطیبانہ آہنگ کے ساتھ حب الوطنی کا جذبہ بھی اسں جدید شاعری کا ایک بنیادی عنصر رہا ہے۔ یہ کہنا کسی حد تک درست ضرور ہے کہ سرسید تحریک کے ہم نواؤں کے یہاں انگریزی حکومت پرستی کا جذبہ کارفرما رہا ہے۔ مگر ہمیں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے ان ضرر رساں نتائج کو بھی نہ بھولنا چاہیئے جو انگریزوں کے دوبارہ تسلط کے بعد رونما ہوئے۔ سچ پوچھیئے تو تقاضائے وقت کا نتیجہ وہی تھا جو مولانا حالؔی اور مولانا آزاد کی شاعری اور سرسید اور ان کے رفقائے کار کے مضامین میں پایا جاتا ہے۔ اور ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ مولانا حالؔی کے کالے اور گورے کے امتیازی فرق کی جھلکیاں بھی نظر آجاتی ہیں اور یہی غیر مساویانہ برتاؤ کے جذبے کی بعد میں نشو ونما ہوئی اور انگریزی حکومت سے نفرت اور حصول آزادی کا جذبہ بیدار ہوا۔ اس لیے ان تحریکوں کی کارکردگی شعر و ادب میں ساتھ ہی ساتھ سماجی اصلاح کے جذبات قابل قدر ہیں۔

لیکن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود ترقی پسند تحریک کے رہنماؤں کے نظریات اور ان کے اسلاف کے نظریات میں امتیازی اور نمایاں فرق ہے کیوں کہ ان کی نظر طبقاتی کشمکش اور اقتصادی پس ماندگی کی طرف نہیں گئی۔ ہمارے سماج میں اقتصادی غیر مساویانہ مسئلہ ایک بڑا مسئلہ تھا۔ ایک طرف اہل ثروت کی اقتصادی حالت آسمان چھو رہی تھی دوسری طرف مزدور، کسان اور دوسرا محنت کش طبقہ اور گھریلو دستکار روٹیوں کا محتاج تھا۔

یہ نئی نسل نئے آدرش اور نئے خواب رکھتی تھی لیکن ان خوابوں کی تعبیر کے ذرائع محدود تھے۔ اس کا ردعمل نئی نسل کے شاعروں اور ادیبوں پر بھی ہوا۔ کچھ شاعر اور ادیب خواب و خیال کی دنیا میں پھنس کر صرف اتنا کہہ سکے "لے چل ہمیں کہیں اس دنیا سے دور" اور رومانیت کا علم بلند کرنے لگے۔ اور کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے جذباتیت اور عقلیت کے امتزاج سے کام لے کر ملک کے باسیوں کی زندگیوں کو نئے حالات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ جسے ترقی پسند تحریک سے وابستگی کا نتیجہ سمجھنا چاہیے اور یہی وہ گروہ ہے جو ملک میں تبدیلی، ترقی اور ایک ایسا انقلاب پیدا کرنا چاہتا تھا جس سے سماج کا نظام بہتر ہو سکے یعنی بورژوا طبقہ پس ماندہ طبقے کی محنت کو جابرانہ غصب نہ کر سکے اور ایسا سماج وجود میں آئے جس کی بنیاد سوشلسٹ نظام پر ہو جہاں ہر شخص کو اپنی

اندرونی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع مل سکے اور اپنی صلاحیت اور محنت کا واجب معاوضہ پا سکے اور اپنی بنیادی ضرورتوں روٹی، کپڑا اور مکان کے لیے کسی کا دست نگر نہ ہو۔

اس طبقاتی اور اقتصادی احساس کی روشنی میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہنماؤں نے اس بات پر زور دیا کہ ادب کو زندگی کا ترجمان بننا چاہیئے چنانچہ ہمارے شعری اور نثری ادب میں مقصدیت اور افادیت کی تکمیل کے عناصر داخل ہوئے۔ جس کا آغاز علی گڈھ تحریک اور انجمن پنجاب لاہور کے ذریعے کسی حد تک نمایاں فرق کے ساتھ ہوا تھا۔ اور" ادب برائے ادب" کی جگہ" ادب برائے زندگی" کا ایک درخشاں نظریہ وجود میں آیا۔

فیضؔ کی ذہنیت پر اس شعری اور ادبی ماحول روایاتی مشاعرے۔ مخصوص ادبی نشستیں، رومانیت وغیرہ سبھی نے اثر کیا۔ "مگر ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے ان کی ذہنیت میں کشادگی اور تخیل میں بڑی وسعت پیدا کر دی۔ اور اسی لئے ان کے بارے میں یہ مقولہ بہت عام بن گیا۔

"رومانیت سے حقیقت کی طرف!......"

باب سوم

اُردو غزل کی مقبولیت

اور

جدید اردو غزل

غیاث اللغات صفحہ ۱۹۴ مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ پر
غزل کے لفظی معنی اس طرح دئے گئے ہیں۔

"غزل بفتحتین حدیث زناں وحدیث
عشق ایشاں کردن و سخنے کہ در وصف
زناں وعشق ایشاں گفتہ آید"۔

عورتوں کی بات کرنا ان سے عشق کی باتیں کرنا اور وہ باتیں جن کا تعلق عورتوں اور ان کے عشق سے ہو۔ منتخب اللغات، قاموس اللغات اور صراح اللغات میں یکساں معنی دئے گئے ہیں۔ اسی لغوی معنی کی رو سے اصطلاح میں بھی غزل کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے، کہ غزل اصناف شاعری کی وہ صنف ہے جس میں حسن وعشق اور جذبات عشق، محبوب کے اوصاف اور اس کے سلوک کا ذکر ہو۔

حسن وعشق کی باتیں کرنا اور سننا انسانی فطرت ہے۔ اسی

لیے ہر شاعر کی توجہ عشقیہ جذبات کی طرف مبذول ہوتی ہے۔ اور اسے وہ بڑی آسانی سے اشعار میں سمو لیتا ہے۔ عشق صرف انسان کو انسان سے ہی نہیں ہوتا بلکہ پرندوں اور جانوروں سے بھی ہوتا ہے۔ مثال کے لئے اگر طوطے مینے وغیرہ ایسے پرندوں اور کتے، گھوڑے یا ہاتھی وغیرہ پالتو جانوروں ہی کو لے لیجئے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان جانوروں تک میں بھی محبت کا وصف پایا جاتا ہے۔ یہ بات عام طور پر مشہور ہے۔ جنگ میں اگر گھوڑے کا مالک مجروح ہو جائے تو اس کو کسی نہ کسی طرح سے اپنی پیٹھ پر لادنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور وہاں سے قدم نہیں ہٹاتا۔ تاریخی واقعہ بتایا جاتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کو جب فرنگیوں نے قید کرکے رنگون بھیجا تھا تو ان کے ہاتھی نے کئی دن کھانا نہیں کھایا۔ ان باتوں کو عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ محبت کا مفہوم بہت وسیع ہے، اور ہر قسم کی محبت کو غزل اپنے اندر سمو لیتی ہے، اور اس طرح انسان کی فطری دلچسپی کو تسلّی اور سکون بخشتی ہے۔

ہیئت کے لحاظ سے غزل کا ہر شعر منفرد ہوتا ہے اور اس طرح شاعر کے تخیل میں جو احساسات اور جذبات ابھرتے ہیں وہ انھیں غزل کے صرف دو مصرعوں میں رکھ سکتا ہے۔ اس طرح مختلف جذبات اور احساسات غزل میں سموئے جا سکتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ پر مکمل ہوتا ہے۔

شاعر کا تخیل طرح طرح کے خیالات اور گوناگون جذبات کا جولاں گاہ ہے۔ غرضیکہ پست اور بلند، ادنیٰ اور اعلیٰ ہر طرح کے خیالات اپنی شاعری میں سمو دیتا ہے۔ پست خیالات جن میں عریانیت ہوتی ہے وہ بھی بعض قارئین اور سامعین کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ مثال کے لیے ہم مولانا حسرت موہانی کے چند اشعار پر ہی اکتفا کرتے ہیں ورنہ خدائے سخن اور خدائے غزل میرؔ کے یہاں تو ایک دفتر سا ملتا ہے جن پر "پستش بہ غائت پست" جیسا تبصرہ بادی النظر میں صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اب ذیل میں حسرتؔ کے یہ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

رونق پیرہن ہوئی خوبیٔ جسم نازنیں
اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

ہم رات کو اٹلی کے حسینوں کی کہانی
سنتے رہے رنگینیٔ ثریا کی زبانی

ہونٹوں کے قریب آئی جو وہ زلفِ معنبر
جھٹ چوم لیا میں نے طبیعت ہی نہ مانی

یا ؎ ساتھ آف کے جو ہم آئے تھے بیرو ت سے حسرت
یہ رنگ نتیجہ ہے اسی ہم سفری کا

یا ؎ کیا حسن پرستی بھی کوئی عیب ہے حسرت
ہونے دو جو اخلاق کی تنقید کڑی ہے

اعلیٰ خیالات صوفیانہ اور فلسفیانہ مسائل پر عام طور سے مشتمل ہوتے ہیں جنھیں سامع اور قاری کو سمجھنا بڑا دشوار سا ہوتا ہے ۔ لیکن غزلگو صرف دو چار مصرعوں میں انھیں سمجھا دیتا ہے ۔ مثال کے طور پر زندگی اور موت کا مسئلہ لیجئے زندگی اور موت کیا ہے ۔ اس کا جواب یوں دینا نہ صرف دشوار بلکہ درازی کلام چاہتا ہے ۔ لیکن ایک غزلگو پنڈت برج نرائن چکبست صرف دو مصرعوں میں اس کا جواب دے دیتے ہیں :

؎ زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزاء کا پریشاں ہونا

فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا
اجل کیا ہے خمار بادۂ ہستی اتر جانا

؎ مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

زندگی کی بے ثباتی کا اظہار میر تقی میر نے کس خوبصورتی سے کیا ہے :۔

؎ ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

خدا ہر جگہ موجود ہے اس بات کو ڈاکٹر اقبال نے صرف دو مصرعوں میں اس طرح ادا کیا ہے :۔

؎ چمک تیری عیاں بجلی میں آتش میں شرارے میں
جھلک تیری ہویدا چاند میں سورج میں تارے میں

خدا کو پہچاننا اور اس کے وجود کو سمجھنا ایک دشوار مسئلہ ہے مگر میر نے "مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ" کی بنیاد پر کتنے حسین انداز میں اس مسئلے پر روشنی ڈالی ہے ۔

؎ پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

یعنی انسان اگر اپنی حقیقت سے آشنا ہو جائے اور اسے اپنی
ہستی بے ثبات کا اندازہ ہو جائے تو وہ قادر مطلق کی حقیقت بہ آسانی
سمجھ لے گا۔ اسی مسئلے میں اکبر الہ آبادی نے وجود باری تعالیٰ کے سمجھنے یا نہ سمجھنے
کو دو مصرعوں میں کس لطیف انداز میں نظم کیا ہے۔

ے فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

اور دوسری جگہ اسی مسئلے کو حل کرتے ہیں کہ خداوند کریم کا سمجھنا
عقل انسانی سے پرے اور بعید ہے۔

ے ذہن میں جو گھر گیا لاانتہا کیوں کر ہوا
جو سمجھ میں آ گیا پھر وہ خدا کیوں کر ہوا

تقدیر اور تدبیر کا مسئلہ ہمیشہ مختلف ہی رہا ہے جسے حل کرنے
میں دو مختلف فرقے بن گئے۔ تقدیر پرست اور تدبیر پرست۔ میر تقی میر
اس مسئلے پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں۔ جو اگرچہ تقدیر پرستی کی طرف
اشارہ کرتا ہے۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہیں ہیں سو آپ کرے ہیں ہمکو عبث بدنام کیا

اور کبیر داس نے تو اس سے زور دار الفاظ میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔

نیاؤ نہ کین کینھ ٹھکرائی
بن کینھے لکھ دین برائی

غزل کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ غزل کے اشعار اپنے اندر کچھ خاص سانحات سموئے رہتے ہیں۔ بقول مسعود حسن رضوی "تخصیص میں تعمیم پیدا کر دیتے ہیں[۱]" میر کا ایک شعر ہے۔

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انھیں کو آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

"میر کی زندگی میں قادر روہیلے نے شاہ عالم بادشاہ کی آنکھوں میں نیل کی سلائیاں پھیر کر انھیں بصارت سے محروم کر دیا تھا۔ اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ میر نے اسی خاص واقعے سے متاثر ہو کر اس شعر میں اپنے دلی

۱۔ ہماری شاعری سید مسعود حسن رضوی صفحہ ۲۴۹

تاثر کا اظہار کیا ہے۔ مگر دیکھئے کہ اس اظہار میں کیوں کر عمومیت اور گہرائی پیدا کر دی ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ ایک تاریخی واقعہ کی شہرت کے باعث اس شعر کے محرک کا پتہ چل گیا۔"

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ غزل کی مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس میں خیالات اور باتیں صرف دو مصرعوں میں ادا کر دی جاتی ہیں۔ غالب کا شعر ملاحظہ ہو ـــ

ـــــہ ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں

"شاعر ان دو مصرعوں میں ایک منظر پیش کر رہا ہے اشخاص منظر دو ہیں ایک عاشق اور ایک کوئی اور ان دونوں میں مکالمہ ہو رہا ہے۔ عاشق سے کہا جا رہا ہے کہ جس پر تو اتنا تن من دھن نثار کئے ہوئے ہے وہ وفا جانتا ہی نہیں بلکہ وہ بے وفا ہے۔ عاشق کو اپنے معشوق کی وفاداری پر اتنا یقین ہے کہ وہ برائی کرنے والے کی باتوں کو بالکل غلط اور سراسر بہتان سمجھتا ہے وہ جھنجھلا کے نفرت آمیز لہجہ میں اتنا کہتا ہے جاؤ وہ بے وفا سہی، برا صحیح کچھ بھی صحیح۔ جس کو اپنی جان اور اپنا دل عزیز ہو وہ اس سے محبت ہی کیوں کرے

اس سے تو وہی محبت کر سکتا ہے جو سب کچھ کھو بیٹھے اور میں اس کے لیے تیار ہوں"[۱]

اسی طرح سے دو شعر اور ملاحظہ فرمایئے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا جو میری شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

اپنی مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

غزل کی مقبولیت کا سب سے بڑا اور اہم سبب اس کی موسیقیت ہے یہ سنگیت کے ہر راگ پر گائی جا سکتی ہے اور غالباً عوام میں اس کی مقبولیت کا سبب یہی ہے۔ اس راز کو فارسی کے خدائے سخن حافظ شیرازی نے پالیا تھا غالباً جبھی انھوں نے اس نکتے کو ملحوظِ خاطر رکھا۔

من حال دل زاہد با خلق نخواہم گفت
کایں قصہ اگر گویم با چنگ و رباب اولی

---

[۱] اردو غزل کی نشو و نما ڈاکٹر رفیق حسین صفحہ ۷۷

اظہر علی فاروقی صاحب نے اردو غزل کی مقبولیت کے اسباب کو مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کیا ہے۔ اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں۔

(۱) انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ اس کو حسن وعشق کی باتیں سننا اور سنانا پسند ہے اور یہ جذبہ قریب قریب پورے سماج میں پایا جاتا ہے

(۲) غزل کی ہئیت اس کی مقبولیت میں بہت کچھ مدد کرتی ہے اس لئے کہ اس میں ہر قسم کے جذبات سمو لینے کی قدرت ہے۔

(۳) مشاعرے جو غزل کو عوام تک پہنچانے کے ذمّے دار رہے ہیں اور غزل کو مقبول بناتے ہیں۔

(۴) موسیقی ساز و آہنگ :

غزل کو آپ اردو شاعری کی آبرو سمجھیں یا نہ سمجھیں آپ کو پورا پورا اختیار ہے۔ مگر یہ تو آپ کو سمجھنا اور تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ اصناف شاعری میں جو مقبولیت غزل کو حاصل ہے وہ مقبولیت کسی دوسری صنف کے حصّے میں نہیں آئی جو غزل اور صرف غزل کو نصیب ہوئی۔ اس کے اسباب کچھ تو غزل کی ساخت اور ہئیت سے تعلق رکھتے ہیں کچھ اس کے موضوع سے وابستہ ہیں اور کچھ ہماری معاشرت اور سماجی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔

غزل کی ہئیت میں ایک مخصوص لوچ ہے جو دوسرے اصناف میں مفقود ہے۔ غزل کا ہر شعر ایک جداگانہ خیال رکھتا ہے، اور تمام بسیط خیالات جو وقتاً فوقتاً شاعر کے ذہن میں گذرتے ہیں وہ انھیں نظم کرتا

جاتا ہے، اور اس کی قوتِ متخیلہ بیکار نہیں جاتی۔ اس کے تحت شعور میں جو کچھ خیالات نشو و نما پاتے ہیں وہ انھیں اپنے شاعرانہ شعور کی بدولت منظر عام پر لانے کے لائق ہو جاتا ہے۔ اقدار حیات میں تنوع ہے اس کی بدولت نہ جانے کتنے سانحات و حادثات و واقعات اور رومان وغیرہ پیش آتے رہتے ہیں جن سے وہ متاثر ہوتا ہے، اور انھیں کو منظوم صورت میں پیش کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اس کی ہمت افزائی غزل کے دو مصرعوں کے علاوہ کوئی دوسری صنف نہیں کر سکتی۔ یہ سہولت اسے غزل ہی بہم پہنچاتی ہے کہ وہ اپنا منفرد خیال صرف دو مصرعوں میں ادا کر دے۔ رُباعی اور قطعہ کچھ آسانیاں ضرور فراہم کرتی ہیں مگر ان میں وہ گنجائش اور وسعت کہاں جو غزل کے چند اشعار میں اکثر و بیشتر مل جاتی ہے۔

موضوع کے لحاظ سے بھی غزل انسان کی فطرت سے بہت قریب ہے اور بڑی مناسبت رکھتی ہے۔ اس کے لغوی معنی عام طور پر مشہور ہیں "حکایت با یار گفتن" اگر ایک طرف جوان طبقہ مادی عشق و عاشقی اور شہوانی باتیں سننے میں دلچسپی لیتا ہے تو دوسری طرف سن رسیدہ اور زہد و تقویٰ کے پرستار روحانی عشق سے شغف رکھتے ہیں، اور غزل ہے کہ دونوں کی دلجوئی کرنے کے لیے تیار۔ غالبؔ نے اسی لیے فرمایا ہے۔

ے ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بھی بادہ و ساغر غزل میں دلکشی پیدا کر دیتے ہیں۔ اور خواص تو خواص عوام بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔

اسی پر کیا منحصر غزل گو شعراء میں کچھ تو صوفی مشرب تھے۔ جنھوں نے صوفیانہ خیالات و جذبات وغیرہ کی نمائش مادی عشق کے پردوں میں کی۔ یہی نہیں غزل کے موضوع میں بڑی وسعت ہے۔ رومانوی جذبات کا بہترین پیرایہ اظہار غزل ہے۔ پند و موعظت، اخلاق و فلسفہ سے لیکر سیاست جیسا سخت اور خشک موضوع غزل کی حدوں میں آجاتا ہے۔ جدید غزل کے رجحانات میں سیاسی خیالات واقعات اور کیفیات کی ترجمانی بڑھتی جارہی ہے اور بڑی خوبصورتی سے کی جارہی ہے۔

؎ تیرے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنالیتی تو اچھا تھا

؎ نہ سرمایہ داروں کی نخوت رہے گی
نہ حکام کا جور بیجا رہے گا

؎ زمانہ وہ جلد آنے والا ہے جس میں
کسی کا کسی پر نہ دعویٰ رہے گا

دراصل غزل کے موضوع کا تنوع اور رنگا رنگی اس کی دلفریبی اور مقبولیت کا بہت بڑا سبب ہے۔ غزل کے شعر یہاں تک کہ اس کے مصرع اپنے اندر کہاوت بن جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

مثال :-

ع   خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

ع   منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی

ع   آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ے   سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

ے   مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

یہ ہی منحصر نہیں نہ جانے کتنے شعر آج بھی بطور ضرب المثل ہیں اور زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ غزل کا ہر شعر قاری اپنے رجحان اور موقع کے مناسب بیان کر سکتا ہے

اس کی عمومیت سے انفرادیت اور انفرادیت سے عمومیت جنم لیتی ہے۔
ایک شعر ملاحظہ ہو۔

آئی بہار گلشن گل سے بھرا ہے لیکن
ہر گوشۂ چمن میں خالی ہے جائے بلبل

فرض کیجئے آپ کے احباب کا ایک گروہ تھا اور گردش روزگار سے سب کے سب الگ تھلگ ہو گئے۔ خوبی قسمت سے ایک بار سب پھر یکجا ہو گئے۔ مگر ایک صاحب جو اپنی شوخی و ظرافت سے سب کو خوش کئے رہتے تھے اب بھی ندارد ہیں۔ کیا یہ شعر اس حالت پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔

ایک بیوہ عورت نے اپنے اس لڑکے کو پالا پرورش کیا، جسے اس کا باپ عالم طفولیت میں چھوڑ کر مر گیا تھا۔ وہ دن آیا کہ اس کی شادی ہو رہی ہے گھر مہمانوں سے بھرا پڑا ہے۔ دولہا بیاہنے کے لیے جا رہا ہے۔ یک بیک اس بیوہ عورت کو اپنے شوہر کی یاد آ جاتی ہے اور اسے ایک جگہ خالی محسوس ہوتی ہے اب آپ یہ شعر اس حالت پر منطبق کیجئے

غزل میں خارجی اور داخلی دونوں طرح کے تجربات کا جذباتی اور تخیلی سادہ اور تمثیلی بیان بیک وقت ممکن ہے۔ استعاروں اور کنایوں کے پردے میں حقائق اور احساسات کی وسیع کائنات جذباتی رنگ میں پیش کی جا سکتی ہے، جہاں غزل کو کسی منطقی استدلال کا سہارا

لیتا ہے بلکہ وہ دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والے جذبات و احساسات کی وہ تصویریں ڈھالتا ہے جو مَن کو موہ لیتی ہے۔

رقص و سرود کی ایک زبردست دھوم دھام ہے شادی بیاہ ہو یا اور کوئی جلسہ، مسجد میں جلسہ ہو یا خانقاہ میں بزم حال وقال ڈھولک کے گیت ہوں یا قوالیاں، حقانیاں ہوں یا رندانہ نغمے غزل کہاں ساتھ دیتی نظر نہیں آتی۔ ستار کے تاروں کی جھنکار ہو یا دنیا کے سریلے سُر۔ ڈھولک ہو یا تبلے کی تھاپ۔ غزل کی نشست ہر ایک پر ٹھیک ہی اترتی ہے۔ پریم راگ چاہے گل و بلبل کی زبانی سنائی جائیں یا شیریں فرہاد کی زبان سے، لیلیٰ مجنوں کہیں یا نل دمینتی سب کے دلوں کو موہ لیتے ہیں، اور دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں۔ اور یہ سحر کاری غزل کی تخلیق اور اس کا حصہ قوالی پر غلط یا صحیح جو مذہبی رنگ چڑھ گیا ہے وہ اتارا نہیں جا سکتا اور غزل قوالی کی جان ہے اور نام و نہاد صوفیوں کی مجلس حال و قال کی روح۔

مختصر یہ کہ غزل کے مضامین میں بڑی وسعت ہے ہر قسم کے احساسات اور قلبی جذبات کو اپنے میں سمو لینے کی گنجائش رکھتی ہے۔ پند و موعظت، اخلاقی مسائل، صوفیانہ جذبات و احساسات، فلسفہ وحکمت، وحدۃ الوجود، وحدۃ الشہود اور مراقبے سے لے کر سیاست جیسا سخت اور خشک مضمون غزل کی فصل پار کر جاتا ہے۔

یہ سلسلہ قدما سے لیکر آج تک چلا آرہا ہے۔ چونکہ شاعر بہت ہی حساس ہوتا ہے اس لیے وہ اپنے گرد و پیش اور خارجی طور پر زندگی کی تبدیلیوں سے متاثر ہوکر غزل میں اپنے خیالات سموتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بیسویں صدی میں سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اردو غزل میں بھی تبدیلی آئی۔ انقلاب روس، تحریک ترک موالات انقلاب آزادی ہند وغیرہ وغیرہ نے اردو شعراء کو متاثر کیا جس نے آگے چل کر ایک مستقل شکل اختیار کرلی اور شعراء کی ایک کثیر تعداد اس مکتبۂ خیال کی علم بردار نظر آتی ہے جنھیں جدید اردو غزل کا معمار یا سنگ میل کہا جا سکتا ہے۔

ان میں سے چند اہم شعراء کا ذکر اجمالاً کیا جارہا ہے۔

داغؔ کی غزل گوئی نے ایک مکتبۂ خیال کی حیثیت اختیار کرلی تھی اور ان کے تلامذہ کی کثیر تعداد سے تغزل کا یہ رنگ و آہنگ ایک عرصے تک باقی رہا مگر ان کی وفات ۱۹۰۵ء کے بعد آہستہ آہستہ یہ رنگ دھندلا پڑتا گیا۔ یہ وہ وقفہ ہے جو اپنے ساتھ گوناگوں واقعات اور حادثات اپنے ساتھ لایا۔ بدیشی اشیاء کا بائیکاٹ سے لے کر ہوم رول تحریک ۱۹۱۶ء، پہلی عالمی جنگ ۱۹۱۴ء ــــــ ۱۹۱۸ء انقلاب روس ۱۹۱۷ء تحریک ترک موالات ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۲ء جلیان والا باغ کا دردناک واقعہ۔ چوری چورا کا واقعہ اپریل ۱۹۲۲ء اور بہت سے دوسرے واقعات اور حادثات نے اردو شعراء کو

بہ طور خاص متاثر کیا اور اردو غزل بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی چنانچہ ہم اس وقفے کو داغ کے مکتبۂ تغزل، اور آغاز ترقی پسند تحریک کے آغاز کا درمیانی وعبوری دور کہہ سکتے ہیں۔ اس وقفے کے ابتدائی دور کے شعراء میں ہمیں تین چار ایسے نمایاں وممتاز شاعر ملتے ہیں جو مذکورۂ بالا حادثات اور واقعات سے متاثر ہوتے نظر آتے ہیں :۔

اس ضمن میں ڈاکٹر عبادت بریلوی اپنی کتاب 'غزل اور مطالعۂ غزل' میں کچھ اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔ "غزل میں غزل قدامت اور جدت میں حد فاصل قائم کرنا بڑا دشوار ہے۔ صرف اس لیے کہ غزل اپنی روایات کی سختی سے پابند ہے۔ دوسرے یہ کہ غزل داخلی جذبات کی ایک اعلیٰ ترسیل ہے۔ اور اس میں خارجی جذبات اور بیانات بھی اشاروں اور کنایوں میں ظاہر کئے جاتے ہیں[1]۔"

جیسا کہ جدید غزل کے نقاش اول غالب نے بھی اس کی نشاندہی بہت پہلے کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

؎ ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ وساغر کہے بغیر

پھر بھی ڈاکٹر موصوف اس بات کا اعتراف کرتے ہیں :۔

---

[1] غزل اور مطالعۂ غزل ڈاکٹر عبادت بریلوی صفحہ ۴۵۳

"لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ غزل پر تغیر کا عمل نہیں ہوتا اور اور وہ جدت سے ہم کنار نہیں ہوتی۔ ایسا نہیں ہے خارجی طور پر زندگی میں جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اس کے اثرات غزل میں بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اس میں بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔"[1]

اب ہمیں ان حالات اور کوائف کا جائزہ لینا ہے جنھوں نے غزل پر اپنے اثرات چھوڑے اور اس کی نوعیت پر جدت کی چھاپ ڈالی۔

ہمارے خیال سے حقیقت یہی ہے کہ کسی ملک کے سیاسی و معاشی حالات اس کے معاشرتی، تعلیمی اور مذہبی وغیرہ حالات پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ انیسویں صدی تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار اور شان و عظمت کا پرچم دکن سے شمالی ہندوستان تک لہرا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ وقت نے ایک ایسا پلٹا کھایا اور ہندوستان کو اس دور میں پہنچا دیا کہ سارا قدیم نظام درہم برہم ہوگیا۔ دورِ آخر کے مغل تاجداروں کی حیثیت محض ایک وظیفہ خوار کی رہ گئی اور وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ستم رانیوں اور اس کے بے پناہ جبر و استبداد سے سخت

---

[1] غزل اور مطالعۂ غزل   ڈاکٹر عبادت بریلوی   صفحہ ۲۵۴

گھبرا گئے اور ردِ عمل میں وہ اس کا تختہ الٹنے کی فکر کرنے لگے۔ اور اسی کے نتیجے میں ۱۸۵۷ء کا حادثۂ عظیم جس کو پہلی جنگ آزادی کہا جاتا ہے رونما ہوا۔ یہ بات اور ہے کہ لڑائی جیتی نہ جا سکی۔ ہزیمت ہار و شکست کا ہی سامنا کرنا پڑا لیکن اس کا دوسرا تابناک پہلو یہ بھی تھا کہ مذکورۂ بالا واقعۂ عظیم ہندوستان کی جدّو جہد آزادی کی تحریک میں ایک بہت ہی نمایاں موڑ لے کر ابھرا اور اس نے ہندوستانی آزادی کے پیش خیمے اور ہراول کی حیثیت اختیار کی۔

شکست کے بعد پورا ہندوستان تاج برطانیہ کے سائے میں آگیا اگرچہ اس حادثے کا اثر اس وقت اردو شعر و ادب پر براہ راست اور واضح صورت میں نمایاں نہیں ہو سکا اور نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے جو خلفشار پہلے پیدا کیا تھا اور شعرائے دہلی نے ترکِ وطن تک اختیار کیا یہ حادثہ اگرچہ کوئی فی الفور چونکا دینے والی بات پیدا نہ کر سکا غلامی ہی مُسلّط ہوئی۔ حالات سے سمجھوتہ کرنا پڑا۔ لارڈ میکالے کی لائن تعلیم، کلچر و قانون وغیرہ کی صورت میں برابر اثر انداز ہوتی گئی۔ تعلیمی نظام جس کا نفاذ ۱۸۳۵ء میں ہوا۔ اور پریسیڈنسی یونیورسٹیاں (بمبئی مدراس اور کلکتہ) میں قائم ہوئیں۔ اور شمالی ہندوستان میں کئی کالج کھل گئے اور ہندوستانی انگریزی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ اگرچہ مسلمان اس معاملے میں بہت پچھڑے تھے پھر بھی انگریزی شعر و ادب کے افکار

و خیالات رونما ہونے لگے اور اس طرح انگریزی خواں ایک ایسا طبقہ بن گیا جو افکار و خیالات میں قدیم ہندوستانیوں سے مختلف تھا۔

یوں تو غالب کی غزلوں میں فکری اور فلسفیانہ خیالات (خواہ وہ تصوف سے ہی وابستہ کیوں نہ ہوں) رونما ہونے لگے تھے۔ لیکن سچ پوچھئے تو اردو غزل میں سر سید احمد کی تحریک علی گڑھ نے ایک انقلاب سا پیدا کیا۔ سر سید بجائے خود روایتی غزل کو ناپسند فرماتے تھے۔ چنانچہ وہ ایک موقع پر تحریر فرماتے ہیں:۔

"فن شعر جیسا کہ ہمارے زمانے میں خراب اور ناقص ہے اس سے زیادہ کوئی چیز بری نہ ہوگی۔ مضمون تو بجز عاشقانہ کے اور کچھ نہیں ہے۔ وہ بھی نیک جذبات انسانی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ ان جذبات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ضد حقیقی تہذیب الاخلاق کے ہیں"

یہاں ہم یہ چند باتیں کہہ دینا چاہتے ہیں کہ جو باتیں سر سید نے حقیقی کہیں فیکٹس FACTS پر مبنی کہیں جن کی بنیاد عقل و شعور پر ہے اور جن کی بنیاد سائنٹفک ہے یہ سب تو یقیناً قابل قبول ہیں لیکن جو باتیں سمجھوتہ پسندی کی ہیں ان کو دل قبول نہیں کرتا۔ اس ضمن میں اکبر الہ آبادی کی بات بھی ہم لا سکتے ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ اکبر نے اگرچہ بہت

ساری باتیں سرسید کی مخالفت میں بے جا کہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی نظر اصل سماجی حقیقت کو پہچان رہی تھی اور غلط سمجھوتہ پسندی سے عاجز بھی تھے۔ یہی بات ہم اقبال کے سلسلے میں بھی کہہ سکتے ہیں۔ اقبال جانتے تھے کہ انگریزی و مغربی کلچر تیزاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اس سے بھی متفق تھے کہ طبقۂ امراء نہ آزادی دلا سکتا ہے اور نہ ہی ملک و قوم کو اخلاقی بلندی سے ہم کنار کر سکتا ہے۔ اسی لیے کے 'Beware of the treachry of the educated' وہ قائل بھی نظر آتے ہیں اور ایسے نظام تعلیم کو وہ تیزاب تک سمجھتے تھے۔

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے ادھر پھیر (اقبال)

لیکن پھر یہی شاعر ہمیں سمجھوتے کرتا ہوا بھی نظر آتا ہے۔ غالباً اسی بنیاد پر ان پر یہ پھبتی بھی کسی گئی کہ۔

سرکار کے دہلیز پہ سر ہو گئے اقبال

بہر کیف ہمیں کہنا یہی ہے کہ خواہ سرسید ہوں یا سر اقبال ہوں ان کی ایسی ساری باتیں جو مینارۂ نور ہیں ہر باضمیر انسان کے لئے قابل قبول ہیں۔ لیکن جو ہماری رہنمائی نہیں کرتے انھیں ظاہر ہے کہ ہم پسند نہیں کر پاتے۔

ایسے مقامات پر ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے۔

؎ لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے (غالب)

بہر حال سر سید کی سوچ کا جو روشن پہلو ہے اس کے زیر اثر الطاف حسین حالی اور مولانا محمد حسین آزاد نے ۱۸۷۴ء میں ایک جدید مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔ اور کوئی گیارہ بارہ سال بعد اس مشاعرے میں پڑھی ہوئی نظموں کو سراہتے ہوئے وہ یوں رقم طراز ہیں:۔

"ہاں یہ بات سچ ہے کہ ہمارے ان باعث افتخار شاعروں کو بھی نیچر کے میدان میں پہنچنے کے لیے آگے قدم اٹھانا ہے اور اپنے اشعار کو نیچرل پوئٹری کے ہمسر کرنے میں بہت کچھ کرنا ہے"۔

سر سید کا مقصد نیچرل پوئٹری سے یہ تھا کہ ادائیگی مضمون اور صفائی بیان ہر طرح کے تصنع اور تکلف سے پاک ہو۔ سر سید کی ترقی پسندی یقیناً اپنے دور سے بہت آگے تھی۔ شاعری کے افادی پہلو پر زور دینے کے ساتھ ساتھ سر سید نے شاعری کے آہنگ پر بھی زور دیا۔ وہ ایک خاصی حد تک ردیف و قافیہ کے قائل نہ تھے۔ وہ نہ صرف موضوع و مضمون میں تبدیلی کے خواہاں تھے بلکہ ہیئت اور اوزان میں بھی خاصی تبدیلی چاہتے تھے۔ جس کا ثبوت ان کی اس تحریر سے ملتا ہے۔

"نظم کے اوزان بھی وہی معمولی تھے ردیف وقافیہ
کی پابندی گویا ذاتِ شعری میں داخل تھی اور بے
قافیہ شعر گوئی کا رواج ہی نہ تھا اور اب بھی شروع
نہیں ہوا"۔[1]

سرسید کے ان جملوں سے اردو شاعری کے عصری تقاضوں پر روشنی پڑتی ہے جو آج تکمیل کی حدوں سے گزر رہے ہیں۔ ان بیانات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید بھی اردو غزل کے رویّے سے نہ صرف غیر مطمئن تھے اور اس کے موضوعات میں تبدیلی کے خواہاں تھے بلکہ وہ غزل کی ہیئت میں بھی تبدیلی چاہتے تھے اور اس طرح نظم معریٰ کے وجود کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔

مولانا حالی کے شعری مجموعے پر مقدمہ منظرِ عام پر آیا۔ جو آج "مقدمہ شعر و شاعری" کے نام سے موسوم ہے۔ اور جس نے کلاسکی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ اصلاحِ غزل کا احساس و شعور مولانا حالی کو سرسید کی ذات کے علاوہ غالب، مومن اور شیفتہ کی غزلوں سے پیدا ہوا۔ جن کی صحبتوں سے وہ فیض یاب ہو چکے تھے۔ دوسری طرف دبستانِ لکھنؤ کی غزل گوئی کی پست حالت بھی ان کے سامنے تھی۔ جس نے غزل کو بہ اعتبار

---

[1] ڈاکٹر احسن نشاط — نیا دور اپریل ۱۹۸۴ء — صفحہ ۱۸

غزل پست سے پست تر کر دیا تھا۔ مولانا حالی ایسی شاعری کو قوم اور ملک کے لیے نہ صرف گمراہ کن بلکہ خطرناک اور مہلک بھی سمجھتے تھے۔ اب انھوں نے غالب وغیرہ کی غزل اور دبستان لکھنؤ کی غزل کے تضاد کو محسوس کرتے ہوئے غزل کی صحیح اور صحت مند روایات برتنے کی طرف توجہ دلائی۔ اس طرح حالی کی اصلاح غزل کی تحریک نے غزل کو جدید راہیں دکھائیں۔ چنانچہ وہ غزل کے موضوع کے بارے میں 'مقدمہ شعر و شاعری' میں تحریر فرماتے ہیں۔

"غزل کے لئے ایک ضروری سی بات قرار پا گئی ہے کہ اس کی بنا عشقیہ شاعری پر رکھی جائے اور حق یہ ہے کہ اگر غزل میں عشق و محبت کی چاشنی نہ دی جائے تو حالت موجودہ میں اس کا سرسبز اور مقبول ہونا ایسا ہی مشکل ہے جیسا شراب میں سرکہ بن جانے کے بعد سرور قائم رہنا۔ لیکن اصل اور نقل میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ جو کیفیت عشق میں ہے وہ تعشق میں ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی جو غزلیں محض تقلیداً عاشقانہ لکھی جاتی ہیں ان میں اتنا ہی اثر ہو سکتا ہے جتنا کہ ایک بھانڈ کی نقل میں ہو جو مجنوں یا فرہاد بن کر مجلس میں آئے"[۱]

اسی میں آگے چل کر اپنی رائے کا اس طرح بھی اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

---

[۱] مقدمہ شعر و شاعری الطاف حسین حالی صفحہ ۲۵۰

"اسی لیے ہماری یہ رائے ہے کہ غزل میں جو عشقیہ مضامین باندھے جائیں وہ ایسے جامع الفاظ میں ادا کئے جائیں جو دوستی اور محبت کی تمام انواع و اقسام اور تمام جسمانی اور روحانی تعلقات پر حاوی ہوں۔ اور جہاں تک ہو سکے کوئی لفظ ایسا نہ آئے پائے جس سے کھلم کھلا مطلوب کا مرد یا عورت ہونا پایا جائے۔ شلاً کلاہ، چہرہ۔ دستار۔ جامہ۔ قبا۔ سبزۂ خط میں بھیگنا۔ رنگریسر۔ مطرب پسر۔ مغبچہ وغیرہ وغیرہ یا محرم کرتی مہندی۔ چوٹی چوڑیاں وغیرہ[1]"

آگے چل کر کچھ اس طرح لکھتے ہیں۔

"غزل کو باعتبار مضامین اور خیالات کے جہاں تک ممکن ہو وسعت دینی چاہیئے۔ شعر کی لوگوں کو ایسی ضرورت نہیں ہے جیسی کہ بھوک میں کھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان کو اگر ہمیشہ طرح طرح کے کھانے میسّر نہ آئیں تو وہ تمام عمر ایک ہی کھانے پر قناعت کر سکتا ہے۔ لیکن شعر یا راگ میں جب تک تلوّن اور تنوّع نہ ہوں ان سے جی اکتا جاتا ہے۔ جو گوّیا صبح شام رات دن بھیرویں ہی الاپے جائے اس کا گانا اجیرن ہو جاتا ہے۔ اسی طرح شعر میں ہمیشہ ایک ہی قسم کے مضامین سنتے سنتے شعر سے نفرت ہو جاتی ہے[2]"

---

[1]	مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	صفحہ ۲۵۲
[2]	مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	صفحہ ۲۶۷

ہکرّر گرچہ سحر آمیز باشد
طبیعت را ملال انگیز باشد

مشاعروں کی غزلوں پر غور کیجئے۔ انداز الفاظ اور قوافی اگرچہ مختلف ہوتے ہیں مگر مضمون وہی معمولی اور یکساں گھسا پٹا۔ البتہ بحر۔ ردیف اور قافیہ کے اختلاف سے مختلف شکلیں پیدا ہو جانے سے کوئی افادی پہلو نہیں پیدا ہوتا۔

اس سلسلے میں مولانا موصوف نے الفاظ اور محاورات کے مختلف انداز بیان کی مثالیں پیش کرتے ہوئے "چاک گریباں" کے استعمال کی بہت سی مثالیں بھی پیش کر کے دکھایا ہے۔ کہ ایک ہی گھسی پٹی بات کو مختلف طور پر ظاہر کرنے سے کوئی جدت تو نہیں پیدا ہوتی۔

ان باتوں سے بآسانی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مولانا حالی غزل کے مضامین میں وسعت اور تنوع پیدا کرنا چاہتے تھے اور انداز ترسیل میں تصنع اور آورد کو جگہ دینا نہیں چاہتے تھے۔

مولانا حالی کی غزلیات کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے عشقیہ جذبات کی ترجمانی بے باکی سے کرنے کے باوجود اپنے تہذیبی اور معاشرتی روایات کو برقرار رکھا ہے۔ وہ جس بات کو محسوس کرتے ہیں اس کے اظہار میں کسی قسم کے تکلف اور تصنع کو روا نہیں رکھتے اور ان کی غزلوں

میں مخصوص معاشرتی پس منظر کے اثرات نمایاں ہیں۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیے :-

زیر برقع تو نے کیا دکھلا دیا
جمع ہیں ہر سو تماشائی بہت

منہ کہاں تک چھپاؤ گے ہم سے
تم کو عادت ہے خود نمائی کی

پردے بہت سے وصل میں بھی درمیاں رہے
شکوے وہ سب سنا کیئے اور مہرباں رہے

TH-4374

شکوہ کرنے کی خو نہ تھی اپنی
پر طبیعت ہی کچھ بھر آئی آج

گو جوانی میں تھی کجرائی بہت
پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

ان اشعار میں اگرچہ روایاتی عشقیہ باتوں کی ترجمانی کی گئی ہے اور

غزل گو عام طور پر اس کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن حالیؔ نے اپنے انداز بیان سے جو ستھرا پن اور نکھار ان میں پیدا کیا ہے اس نے حقیقت اور واقعیت سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔

غزل میں جدت کی باقاعدہ تحریک جو حالیؔ کے ہاتھوں شروع ہوئی اس کے اثرات کم و بیش ان کے وقت میں بھی پڑے مگر اس کے بعد اس کے اثرات ہمہ گیر ثابت ہوئے۔ اگرچہ اس تحریک کی مخالفت بھی ہوئی جس میں اودھ پنچ کے ایڈیٹر سجاد حسین اور لکھنؤ اسکول کے کچھ شعراء پیش پیش تھے سچ پوچھئے تو انیسویں صدی کی آٹھویں نویں دہائی طبقاتی کشمکش کا وقفہ تھا۔ مشرقی تہذیبی روایات بالکل مٹی تو نہیں پھر بھی ان کی جگہ انگریزی تہذیبی روایات لے رہی تھیں اور مشرقی تہذیب کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ اکبرؔ الٰہ آبادی نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں اس طرف اشارہ کیا ہے:۔

؎ حضور آئے نوابی کے انتشار کے بعد
ہزار حیف کہ فالج گرا بخار کے بعد

اور علی گڑھ تحریک کے مقلدین خصوصاً مولانا حالیؔ کے بارے میں اسطرح فرمایا ہے:۔

؎ حالیؔ اب آؤ پیروئ مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفیؔ و میرؔ ہو چکی

ان بدلے ہوئے حالات میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو ان سے سمجھوتہ

کرنے پر تیار نہ تھے اور مشرقی روایات کو زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ اکبر الہ آبادی اور اودھ پنج اسکول کے حامیوں کے علاوہ کچھ ایسے شاعر بھی موجود تھے جو غزل گوئی کے پرانے ڈھرے پر چلتے رہے اور ان کی غزلیں بے حد مقبول بھی ہوتی رہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ایسے شاعروں میں داغ دہلوی کا نام سر فہرست ہے۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بھی وسیع تھا۔ سائل دہلوی۔ نوح ناروی اور بہت سے جن کی بدولت یہ انداز غزل اوائل بیسویں صدی تک چلتا رہا۔ داغ اس ماحول اور ان کے کوائف سے بالکل متاثر نہ ہوئے، جنھوں نے سر سید احمد اور الطاف حسین حالی، مولانا محمد حسین آزاد جیسے صاحب اور دور بیں حضرات کو متاثر کیا تھا۔ داغ ایک شاعر تھا جس کے حلقۂ تلامذہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ داغ نہ صرف ایک شاعر تھا، بلکہ تغزل میں وہ ایک اسکول تھا اور داغ اسکول کی غزلیں دوسرے شعراء کی غزلوں سے ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی 'غزل اور مطالعۂ غزل' میں اس طرح رقمطراز ہیں۔

> " داغ جدید غزل گو شاعر نہیں تھے انھوں
> نے اپنی ساری زندگی درباروں میں
> گذاری۔ لال قلعہ میں ان کی نشو و نما ہوئی پھر رام پور اور
> حیدرآباد میں وہ اطمینان کی زندگی بسر کرتے رہے۔ اس لئے

ان کی غزل میں جدید رجحانات کے اثرات کی تلاش بظاہر ایک بے سود سی بات معلوم ہوتی ہے اور یہ خیال کسی حد تک صحیح بھی ہے لیکن اس کے باوجود بھی ایک حقیقت ہے کہ داغ نے اردو غزل میں ایک نیا رنگ نکالا ہے۔ انھوں نے اسے ایک نیا آہنگ دیا ہے اور وہ اس میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ رنگ چاہے خود بہت زیادہ اہمیت نہ رکھتا ہو کیونکہ اس کے تمام پہلوؤں سے متفق ہونا مشکل ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ مجموعی اعتبار سے اس نے اردو غزل کو جدت سے ہم کنار کرنے میں بڑی مدد کی ہے۔"[1]

اس جدت سے "ہم کنار کرنے میں" یہ اشعار پیش فرماتے ہیں:۔

یوں مرے دل میں گھر کے رہیں تیری حسرتیں
ہو جائے جیسے قلعے میں فوجِ غنیم بند

عاشق کے ضعفِ قلب کی کچھ انتہا نہیں
گویا وہ اس زمانے کا اسلام ہو گیا

کرتے ہو داغ دور سے بت خانے کو سلام
اپنی طرح کے ایک مسلماں تمھیں تو ہو

---

[1] غزل اور مطالعۂ غزل ڈاکٹر عبادت بریلوی صفحہ ۴۸۹

ان دو تین تشبیہوں اور ایسی ہی کچھ دوسری تشبیہات یا دوسرے جذبات و احساسات کی ترجمانی سے یہ اندازہ تو نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا تخیل اپنے ماحول یا تحریک علی گڈھ کی اصلاحی جذبے سے تاثر قبول کر رہا تھا۔ کیونکہ داغ اپنی نجی باتیں اور واردات قلب کی باتیں کھرے ڈھنگ سے پیش کرنا چاہتے تھے جنیت کو بھی وہ ایک اہم ضرورت جانتے تھے چنانچہ اسے بھی وہ طرح طرح سے اور بہت ہی فنکارانہ انداز میں ڈھالتے تھے۔ خواہ ان کے محبوب کو لوگ بازاری عورت، ہی قرار کیوں نہ دیں لیکن جذبات کی تصویر کشی کی بے مثل اور نادر مثالیں ان کے یہاں ضرور ملتی ہیں۔ ان کی شاعری کا عام رنگ کچھ اسی طرح کا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

بھنویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کچھ ہم سے ایسی بگڑی ہے کہ یوں بن ٹھن کے بیٹھے ہیں

کوئی چھینٹا پڑے اور داغ کلکتے پہنچ جائیں
بس اتنی بات میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

دہی نہیں بلکہ ان کی غزلوں میں زندگی کی ساری مسرتوں سے لطف اندوز ہونے کا شدید احساس ملتا ہے جو لذت پرستی سے قریب نظر آتا ہے ایسی حالت میں ان کی غزلوں کا رشتہ جدید تغزل سے جوڑنا یعنی اسے جدید غزل کا پیش خیمہ قرار دینا کچھ لوگوں کو گراں گزرے گا لیکن ہمیں حقیقت اسی میں نظر آتی ہے کہ داغ کے آہنگ غزل نے اردو غزل کو ایک ایسا مادی رنگ بخشا جو آگے چل کر حسرت اور فیض ایسے شعراء کے یہاں زیادہ نکھرا۔ فیض کے جمالیاتی رنگ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ فیض کے متعلق تفصیلات تو بعد میں آئیں گی ہی۔

ان کا آنچل ہے، کہ رخسار، کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں
جانے اس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں
رنگ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر

داغ کے ہم عصر امیر اور جلال کے علاوہ ان کے تلامذہ میں بےخود دہلوی، سائل دہلوی، نسیم بھرت پوری، احسن مارہروی، نوح ناروی (الہ آبادی) وغیرہ کے سلسلے سے بھی داغ کے تغزل کا ساز و آہنگ بیسویں صدی کی چار پانچ

دہائیوں تک چلتا رہا اگرچہ تغزل کا قالب بہت کچھ بدل چکا تھا۔ علامہ اقبال داغ کے شاگرد تھے اور موصوف نے بھی داغ کے کلام سے خاصہ اثر قبول کیا یہاں تک کہ ان کے مخصوص رنگ میں غزلیں بھی کہیں۔ چند مثالیں دیکھتے چلیں

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

اکبر الٰہ آبادی مشرق اور مغرب کی آویزش اور ان واقعات اور حادثات سے بے پناہ متاثر نظر آتے ہیں۔ اگرچہ ان کی شخصیت داخلی اور خارجی قوتوں کے ٹکراؤ میں پھنسی نظر آتی ہے۔ ایک طرف وہ مغرب کی کورانہ تقلید کے سخت مخالف تھے اور سرسید کی مغرب پرستی کو بھی برا سمجھتے تھے ساتھ ہی ساتھ قدامت پرستی بھی انھیں پریشان کیے ہوئے تھی اور عوام کی توہم پرستی سے بھی بیزار تھے۔ ایسی حالت میں انھوں نے اپنے نظریات اور اسلوب بیان کی مدد سے کچھ ایسی راہیں اختیار کیں جنھوں نے ان کی شخصیت کو منفرد بنادیا وہ دونوں پر کس خوبی سے طنز کرتے ہیں:۔

مغرب نے خوردبین سے کمر ان کی دیکھ لی
مشرق کی شاعری کا مزا کرکرا ہوا

اب نہ جنگی علم نہ جھنڈا ہے
صرف تعویذ اور گنڈا ہے

پتلی کمر اور تعویذ گنڈے پر یہ طنز محض سرسری نہیں ہے بلکہ ان کے رجائی ذہن اور تنقیدی شعور پر روشنی ڈالتا ہے۔

ہم لکھ چکے ہیں کہ یہ وہ وقت تھا جب انگریز حکومت اور مغربی تہذیب ہندوستان کی شاہانہ عظمت اور تہذیبی قدروں کو کچلتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اس لیے حب الوطنی کے جوش میں اکبر نے اپنی تمام فنکارانہ صلاحیت استعمال کی۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی تصنیف "اردو ادب میں طنز و مزاح" میں علامہ عبداللہ یوسف علی کی تصنیف "انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ" کے حوالے سے لکھا ہے۔

اکبر نے مغربی تہذیب کے خلاف پرزور الفاظ میں مشرق کی آواز بلند کی دوسرے انھوں نے ہندوستان میں مذہب کے زوال پر دلی رنج کا اظہار کیا تیسرے انھوں نے ریاکاری اور بیہودگی کے خلاف اپنے

جذبات کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی۔"

سچ پوچھئے تو اکبر الہ آبادی اس دور سے گذر رہے تھے جب ایسا کچھ کہا جاتا تھا کہ "حکومت برطانیہ میں آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا" مگر ایسا خیال محض سرسری اور سطحی تھا اور حقیقت یہ تھی جیسا کچھ ڈاکٹر ظل حسنین صاحب نے اپنی تالیف "اردو شاعری اور مسائل زمانہ" میں تحریر فرمایا ہے۔

"جس زمانے میں اکبر نے آنکھ کھولی وہ انتہائی حزن و مایوسی کا زمانہ تھا انگریزوں کی لوٹ گھسوٹ اور ان کے مظالم بہت عام تھے۔ اور کس طرح اور کن حالات میں ملک پر قابض ہوئے تھے اس کا بیان اکبر کے الفاظ میں سنئے۔"[1]

حضور آئے نوابی کے انتشار کے بعد
ہزار حیف کہ فالج گرا بخار کے بعد

ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس وقت کی ترجمانی کی ہے جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا دور دورہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد جب ہندوستان

---

[1] اردو شاعری اور مسائل زمانہ — ڈاکٹر ظل حسنین — صفحہ ۷۳

تاج برطانیہ کے تحت آگیا۔ سرسید نے مسلمانوں کی بقا کا صرف یہی راستہ اپنایا کہ حکومت برطانیہ کی وفاداری کا اعلان کیا جائے اور ان کے رفقاء کار میں مولانا حالی بہت پیش پیش رہے ہیں۔ انھوں نے بھی پیروئی مغربی کی ترغیب اس طرح دی کہ قوم کو وقت کے مطابق چلنا چاہیئے۔ ڈاکٹر ظل حسنین صاحب 'اردو شاعری اور مسائل زمانہ' میں اکبر کے متعلق اس طرح تحریر کرتے ہیں[1]۔

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر ہو چکی

اکبر زمانے کو حرکی تسلیم کرتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں!۔

نبائے کار جہاں کو خراب ہی دیکھا
ہمیشہ ہوتے یہاں انقلاب ہی دیکھا

لیکن تعجب ہے وہ اپنے معاشرے کی روایات کو ابدیت دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ معاشرہ کو وقت کے اثر سے بری رہنا چاہیئے اس معاملے میں وہ اودھ پنچ لکھنؤ سے اتفاق کرتے ہیں جو سرسید تحریک سے سماج پر مغربی اثرات پڑ رہے تھے۔ اودھ پنچ کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین بالکل مخالف تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اکبر نے ہر کام پر نکتہ چینی کرنا اپنا فرض سمجھ لیا۔ ڈاکٹر

---

[1] اردو شاعری اور مسائل زمانہ ڈاکٹر ظل حسنین صفحہ ۴۸

ظل حسنین کا ایک بیان بڑا دلچسپ ہے۔

"اکبر مدت مدید تک سرسید پر بے جا اعتراضات کی بوچھار کرتے رہے لیکن اپنی جگہ پر سرسید بھی ایک ایسے فراخ دل، وسیع الذہن اور سراپا اخلاق تھے کہ ان سے کبھی بھی جبر نہیں ہوئے نہ تو ماتھے پر بل پڑے اور نہ ہی ابروؤں پر شکن آئی بلکہ اکبر سے اب بھی گو نہ محبت کرتے رہے یہاں تک کہ کوشش و سفارش کر کے ان کا تبادلہ علی گڈھ کرالیا تھا۔ سرسید کی عظیم انسانی صفات نے آخرش اکبر کو بھی متاثر کر کے ہی چھوڑا۔ علی گڈھ آکر اکبر کو سرسید کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اب اکبر کا دل سرسید سے صاف ہو گیا اب وہ سرسید پر ذاتی و شخصی حملے کرنے کے بجائے ان کی تعریف کرنے لگے تھے مثالاً یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں"۔[1]

تعلیم اگر نہیں ہے زمانہ کے حسب حال
پھر کیا امید دولت و آرام و احترام
سید کے دل میں نقش ہوا اس خیال کا
ڈالی بنائے مدرسہ لے کر خدا کا نام
صدمے اٹھائے رنج سہے گالیاں سہیں
لیکن نہ چھوڑا قوم کے خادم نے اپنا کام

---

[1] اردو شاعری اور مسائل زمانہ ڈاکٹر ظل حسنین صفحہ ۵۲

نیت جو تھی بہ خیر تو برکت خدا نے دی
کالج ہوا درست بہ صد شان و احترام

اکبرؔ ہندو مسلم اتحاد کے قائل تھے انھوں نے اگر ایک طرف مسلمانوں کے بارے میں کچھ کہا ہے تو دوسری طرف ہندوؤں کو بھی اپنی نظر میں رکھا ہے۔ وہ مسلمان کو ایک بہتر مسلمان اور ہندو کو ایک بہتر ہندو بننے کی ترغیب دیتے ہیں اور کہیں کہیں اکبرؔ کا یہ رنگ کبیرؔ سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

؎ کہاں کے ہندو کہاں کے مسلم بھلائی ہیں سب اگلی رسمیں
عقیدے سب کے ہیں تین تیرہ گیارہ میں ہے نہ اسمی ہے

محرم اور دسہرا ساتھ ہوگا
نباہ اس کا ہمارے ہاتھ ہوگا

لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ
موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

اکبرؔ نے اپنی شاعری میں ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کو جگہ دی ہے اور اپنی شاعری کا تانا بانا ہندوستانیت سے بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے

ہندی الفاظ اور ہندوستانی ضرب الامثال اور ہندو مذہبی روایات بکثرت استعمال کیے ہیں۔ اکبر صحیح معنوں میں محب وطن تھے۔ وہ اپنے وطن کو غیروں کے اقتدار سے آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کا صرف ایک شعر پڑھیے۔ جس سے اندازہ ہو جائے گا:۔

اکبر اگر نہ ہوتا مدخولۂ گورنمنٹ
اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

انقلاب آیا نئی دنیا نیا ہنگامہ ہے
شاہنامہ ہو چکا اب دورِ گاندھی نامہ ہے

ہندوستان کی تحریک آزادی کی رہنمائی کو اکبر ذاتی نمائش کا مشغلہ تصور کرتے تھے اور اسی ضمن میں جہاں وہ گاندھی جی کی گوپیوں میں شامل ہونا چاہتے ہیں اور شاہنامہ پر گاندھی نامہ کو ترجیح دیتے ہیں۔

اکبر کی شاعرانہ صلاحیت اور قابلیت میں کسی کو ذرا بھی شبہ نہیں لیکن وہ سیاسی معاملات کی طرف زیادہ متوجہ نہیں ہوئے۔ بلکہ مذہبیات سے زیادہ وابستہ رہے۔ ڈاکٹر ظل حسنین اپنے مجموعے مضامین "اردو شاعری اور مسائل زمانہ" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"اکبر کہتے ہیں کہ گاندھی تو آج اٹھے ہیں ہم تو ایک مدت سے وعظ

کہہ رہے ہیں لیکن ہمارا مقصود پولیٹیکل نہیں بلکہ صرف مذہبی و روحانی ہے"۔ [1]

نشان شوکت و گاندھی کجا بود
کہ اکبر صرف کشف ماجرا بود
بجائے ملک لیکن مدعائش
خدا بود و خدا بود و خدا بود

ان حالات اور کوائف کی ترجمانی صرف ان کی نظمیں اور قطعات ہی نہیں کرتے بلکہ ان کی غزلیں بھی کہیں کہیں واضح طور پر اور زیادہ تر علامتی پیرائے میں ان کی ترجمان ہیں۔

مغربی تعلیم اور تہذیب کی بدولت مذہب سے بے توجہی پیدا ہو رہی تھی اس پر طنز ملاحظہ فرمایئے:

زمانہ کہہ رہا ہے سب سے پھر جا
نہ مندر جا نہ مسجد جا نہ گرجا
کیسے نماز حال میں ناچوں جناب شیخ
تم کو خبر نہیں کہ زمانہ بدل گیا

---

[1] اردو شاعری اور مسائل زمانہ ڈاکٹر ظل حسنین صفحہ ۵۷

کہا پیر طریقت نے اکڑ کر اپنی ٹم ٹم پر
یہی منزل ہے جس میں شیخ کا ٹٹو نہیں چلتا

انگریز دستکاروں کی بنائی ہوئی اشیاء کی مقبولیت پر طنز ملاحظہ فرمایئے

؎ بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے ایک مضمون لکھا
ملک میں مضمون نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

سرسید پر چبھتی ہوئی چوٹ ملاحظہ فرمایئے :-

؎ دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا
بت کے بندے ملے، اللہ کا بندہ نہ ملا
بزم یاراں سے پھری باد بہاراں مایوس
ایک سر بھی اسے آمادۂ سودا نہ ملا
سید اٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے
شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسا نہ ملا
جس روشنی میں لوٹ ہی کی آپ کو سوجھے
تہذیب کی میں اس کو تجلی نہ کہوں گا

روایت پرست مذہبی رہنماؤں کا خاکہ اسطرح اڑاتے ہیں :-

؎ واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے
کر دیا کعبے کو گم اور کلیسا نہ ملا

خلاف شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں
مگر اندھیرے اجالے میں چوکتا بھی نہیں

کچھ شک نہیں کہ حضرت واعظ ہیں خوب شخص
یہ اور بات ہے کہ ذرا بیوقوف ہیں

خود اپنی ریش میں الجھے ہوئے ہیں حضرت واعظ
بھلا ان کو بتوں کے گیسوئے پرخم سے کیا مطلب

نئی تعلیم کے اثرات اکبر کی زبانی سنئیے:

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جاکر

موم کی پتلیوں پر ایسی طبیعت پگھلی
چمن ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے

اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنے یہاں کے خورونوش سے بھی اعتراض کرنے لگے

ع کیک کو چکھ کے سیوئیوں کا مزہ بھول گئے

حصول ملازمت کی تلاش میں کیا کچھ ہوتا ہے اسے اکبر سے سنئے :-

ــــہ مذہب چھوڑو ملت چھوڑو صورت بدلو عمر گنواؤ
صرف کلرکی کی امید اور اتنی مصیبت توبہ توبہ

شوقِ لیلائے سول سروس نے اس مجنون کو
اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

قومی رہنماؤں کی حالت دیکھئے :-

ــــہ قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہیں مگر آرام کے ساتھ

مختصر یہ کہ اکبر الہ آبادی کے سامنے سیاسی معاملات سے زیادہ سماجی، مذہبی معاملات زیادہ رہے ہیں۔ وہ مشرقی تہذیب کے دلدادہ اور پرستار نظر آتے ہیں اور مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے روکنے کے درپے رہتے ہیں

اس وقفے کے بین الاقوامی شہرت کے حامل شاعر مفکر اعظم علامہ اقبال ہوئے ہیں۔ جن کو پہلا شاعر سمجھنا چاہیئے۔ جس نے اردو غزل کو ایک جدید ترقی پسندانہ موڑ دیا۔

اس وقفے کے سیاسی حالات پر ہم پہلے روشنی ڈال چکے ہیں۔ البتہ ہم

نے ان ممالک کی طرف توجہ نہیں کی تھی جنھیں دنیائے اسلام کا نام دیا جاتا ہے۔ برطانیہ کی شاطرانہ سیاست اور نو آبادیات کے جذبے نے ان ممالک کو بھی انگریزوں کے زیر اثر کر دیا تھا۔ ہمارے ملک کا ہم سایہ ملک افغانستان انگریزوں سے تیسری ۱۹۱۹ء افغان جنگ میں شکست کھا کر ایک ہندوستانی ریاست کی سطح پر آ چکا تھا۔ ایران اپنے قاچاری بادشاہوں کے طلسم اقتدار اور ان کے مغربی حریفوں کے سحر سامری سے بُری طرح متاثر ہو چکا تھا۔ ترکی اور اس کے مقبوضات شام فلسطین طرابلس بھی برطانیہ کے حکمت عملی سے خاموش پڑ چکے تھے۔ مصر پر اگرچہ خدیو کی حکمرانی تھی لیکن وہ انگریزوں کی کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ انگریزی تعلیم کے ذریعے مغربی تہذیب و تمدن کے سانچے میں ڈھالا جا رہا تھا۔ غرضیکہ سارے عالم اسلام پر ایک خواب گراں طاری تھا۔ اس سلسلے میں تصورات اقبال میں مولانا صلاح الدین احمد تحریر فرماتے ہیں:

> "ان حالات میں جمال الدین افغانی اپنی پوری قوت سے اس سکوتِ مرگ نما کو توڑنے کی کوشش کی۔ لیکن فرنگ کی عیاری نے خود انہی ہاتھوں سے اس کی آواز کو خاموش کروا دیا اور ان کی مشن کو ناکام بنا دیا۔"[1]

یہ تھے وہ حالات جن کا اقبال نے بغور مطالعہ کیا اور اس کے نتیجے میں

---

[1] تصورات اقبال — مولانا صلاح الدین احمد — صفحہ ۲۷۵

اردو شاعری کو ایک ایسا موڑ دیا جسے ہم وطنیت اور ملت کی شاعری سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

یوں تو اقبال کی شاعری کا آغاز اس وقت ہوا جب داغ اسکول کے مقلدین کی بدولت غزل کا وہی ساز و آہنگ باقی رہا جس کی بنیاد داغ ڈال چکے تھے۔ تمام بڑے شہروں کی طرح لاہور میں بھی مشاعروں کا زور شور تھا، اور شعراء اسی رنگ میں غزلیں کہتے اور مشاعروں میں سنا کر داد طلب ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ اقبال نے بھی داغ کے انداز میں متعدد غزلیں کہیں۔ جن میں سے اب وہ غزلیں ان کے مجموعے کلام میں شامل نہیں ہیں۔ جیسا مولانا صلاح الدین احمد نے اپنی تصنیف "تصورات اقبال" میں لکھا ہے۔[1] اس طرح کی ایک دو غزلوں کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے۔

مہ و خورشید و انجم دوڑتے ہیں ساتھ اس کے
فلک کیا ہے کسی معشوق بے پروا کی ڈولی ہے

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

---

[1] تصورات اقبال مولانا صلاح الدین احمد صفحہ ۲۱۱

تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی
کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا
فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی [1]

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی
منصور کو ہوا لبِ گویا پیامِ موت
اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی
میں انتہائے عشق ہوں تو انتہائے حسن
دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
اٹھ بیٹھے کیا سمجھ کر بھلا طور پر کلیم
طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی

---

[1] تصورات اقبال   مولانا صلاح الدین احمد   صفحہ ۲۱۱

ڈاکٹر اقبال ۱۹۰۵ء میں بیرسٹری کی تعلیم کے لیے انگلستان[1] روانہ ہوئے اور وہاں تین سال رہے۔ اکبر الہ آبادی نے ایک بڑا خوبصورت شعر کہا :-

سدھارے شیخ کعبے کو ہم انگلستان دیکھیں گے
وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے

یہ شعر اقبال کے جذبات پر اس لیے صادق نہیں آتا ہے کہ انھوں نے وہاں خدا کی شان ضرور دیکھی اور مغرب کی مادی اور افادی ترقی کا گہرا مطالعہ کیا۔ وہ اس نتیجے پر پہونچے کہ اس میں وہ وصف نہیں جو انسانی روح کے اندر زندگی کی لامتناہی اقدار کی خلاف ہو، اور اسی لیے انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا۔

پیر مغاں فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر
اس میں وہ کیف غم نہیں مجھ کو تو خانہ ساز دے

ڈاکٹر اقبال کا عقیدہ تھا کہ مشرقی انسان کے لیے وہی شاعری دلکش اور اثر آفریں ہو سکتی ہے جس میں روحانیت کی چاشنی ہو۔ سنائی، عطار اور رومی کی شاعری کا اثر فردوسی انوری اور خاقانی کے افکار سے زیادہ ہے۔

سر سید احمد اور ان کے رفقائے کار کی نظر میں صرف ظاہری تجلی نظر

۱۔ تصورات اقبال — مولانا صلاح الدین احمد — صفحہ ۲۱۲

آئی۔ لیکن ڈاکٹر اقبال نے اس روشنی کو محض شرار کا تبسم سمجھا۔

ہنگامہ گرم ہستی ناپائدار کا
چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

اسی جذبے کے تحت وہ مغرب زدہ نہ بن سکے ان کا خود کہنا تھا کہ وہ حسینوں کے نظارے میں حسن کامل کو ڈھونڈھتے ہیں:

ہر تقاضا عشق کی فطرت کا ہو جس سے خموش
آہ وہ کامل تجلی مدعا رکھتا ہوں میں
جستجو کل کی لئے پھرتی ہے اجزا میں مجھے
حسن بے پایاں ہے، دردِ لادوا رکھتا ہوں میں

بابِ چہارم

فوجی ملازمت اور اسکے اثرات

یوں تو دوسری عالمی جنگ ۱۹۳۹ء سے شروع ہوئی۔ لیکن اس جنگ کے پس منظر میں جو تحریک کار فرما تھی اس کا آغاز انیسویں صدی کی دوسری دہائی سے ہو چکا تھا۔ پہلی عالمی جنگ میں ہٹلر ایک سارجینٹ کی حیثیت سے داخل ہوا تھا لیکن اس کی خواہش بہت بلند تھی۔ چنانچہ وہ "فاشزم" کی نشو و نما کے درپے ہو گیا اور اٹلی میں مسولنی کا ہم خیال بن گیا، دونوں ایک دوسرے کے رفقائے کار بن گئے۔ دونوں کے دل و دماغ پر یہ جذبہ غالب آیا کہ ان کا تعلق سب سے اعلیٰ اور اشرف نسل آریا سے ہے اس لیے ساری دنیا ان کے زیر اقتدار رہنا چاہیئے اور ہٹلر فاشزم کی تنظیم کے لیے تگ و دو کرنے لگا اور اس کے ہم خیال مسولنی نے اسی جارحانہ جذبہ کے تحت عربوں کے زیر اقتدار جزیرے قبرص (CYPRUS) پر قبضہ کر لیا جسے انگریزوں کی حمایت حاصل تھی پھر اس نے امریکہ کے ان کمزور ملکوں پر نظر ڈالی جو اقتصادی طور پر کمزور تھے۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء حبشہ (ETHOPIA) پر جارحانہ فوج کشی کر کے وہاں کے فرماں روا ہلیری کو معزول کر دیا اور ایتھوپیا (ETHOPIA) کو اپنے زیر اقتدار کر لیا۔

اس تحریک نے بہت جلد اپنا دائرہ وسیع کر لیا۔ ہٹلر کو آریائی نسل سے رشتہ منسلک کرنے پر بڑا فخر تھا چنانچہ سواستی کا 卐 کو اس نے علامت بنایا۔ جرمنی میں ہٹلر کی قیادت اٹلی میں مسولنی کی رہنمائی

اسی طرح فاشزم کے پرستار اپنے سوا کسی دوسرے فرقے کو باقی رکھنا نہیں چاہتے۔ مختصر یہ کہ فسطائیت روئے زمین پر ایک قہر کی صورت میں نمودار ہوئی۔ حالانکہ لطف یہ ہے کہ فسطائی لوگ بھی اپنے اپنے ملکوں میں سوشلزم کے نعرے لگا لگا کر صاحب اقتدار ہوئے تھے فسطائیت کی بنیاد دو باتوں پر تھی۔ اول یہ کہ ہٹلر اور مسولنی آریائی نسل سے تعلق رکھنے کی وجہ سے دنیا پر حکومت کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے۔ دوم یہ کہ ان کی پشت پناہی ابھرتا ہوا سرمایہ دار طبقہ کر رہا تھا۔ جس کو اپنا سرمایہ بڑھانے کے لیے زیادہ سے زیادہ نئی تجارتی منڈیوں کی ضرورت تھی۔ اس جذبے کو چھپانے کے لیے کہ عوام کو ان کی طرف سے کوئی غلط فہمی نہ ہونے پائے انھوں نے "ڈیفنس آف فادر لینڈ" قسم کے نعرے ایجاد کئے۔

اس سلسلے میں ایک بات نہ بھولنا چاہیئے کہ خود کانگریس میں ایک پارٹی عالمی فاشزم کی حمایت کر رہی تھی اور تعجب تو یہ ہے کہ پارٹی کو مہاتما گاندھی سے قربت حاصل تھی۔ اور ان کا آشیرواد بھی ۱۹۴۲ء کی "ھندوستان چھوڑو" تحریک اس فسطائی حمایت کے جذبے تحت نمودار ہوئی اور برٹش حکومت کا تشدد اور مظالم بھگتنے کے بعد بہت جلد اس کو ختم کر دیا گیا۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد فسطائی فریق کے قدم اس تیزی اور

پامردی سے بڑھے کہ پاس پڑوس کے کمزور ملکوں کو روند ڈالا۔ اب وقت آگیا جب ذی ہوش سیاست دانوں کے سامنے دو صورتیں در پیش تھیں۔

(۱) فسطائی طاقتوں کے ہم نوا بن کر ان کی مدد سے اپنے ملک سے انگریزوں کو باہر کیا جائے۔ پہلے اشارہ ہو چکا کہ ہمارے ملک میں بھی فسطائی تنظیم کے ہم نوا اور ہم خیال موجود تھے اور یہاں کی تنظیموں کا براہ راست عالمی تنظیم سے رابطہ بھی تھا۔ چنانچہ سبھاش چندر بوس جو کانگریس کی تشدد پسند پارٹی کے لیڈر تھے اور اس وقت جیل میں تھے کسی طرح جیل سے بھیس بدل کر نکل بھاگے اور افغانستان ہوتے ہوئے برلن پہونچ گئے اور وہاں سے آکر جاپانیوں سے مل گئے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ انڈین نیشنل آرمی بنائی جو "آئی۔ این۔ اے" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس فوج میں بہت سے ہندوستانی جنگی قیدی بھی شامل ہو گئے اور جاپانی فوج کے اشاروں پر جاوا، سماترا، اور برما تک انگریزوں کے خلاف بلغار کرتے رہے۔ سبھاش چندر بوس کے علاوہ کیپٹن شاہ نواز، ڈھلوں سیگل اس فوج کے ایک سربرآوردہ شخص تھے۔ لیکن اس جذبے میں ایک خرابی تھی کہ ہم بھیڑیے کی درندگی سے چھٹکارہ پانے کے لئے شیر سے مدد لیں۔ جو اس سے زیادہ خونخوار ہے جس کے نتیجہ میں ملک فسطائیوں کی زیر اقتدار آجائے گا۔ جو انگریزی سامراج

سے زیادہ خوں ریز جابر اور ظالم ثابت ہوگا۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ ہم ایسی حالت میں اس چھوٹے دشمن کی مدد کریں، جو مشترک بڑے دشمن سے برسرپیکار ہے۔ اور اس فائز المرامی کے نتیجے میں ہم فسطائی درندگی سے محفوظ رہیں گے۔ اور چھوٹے دشمن سے چھٹکارہ پانے کے لیے کوشش کریں گے۔ اس خیال کے تحت بہتیرے ماہرین سیاست نے انگریزوں کا ساتھ دینا مناسب سمجھا۔

ان ابتدائی فتوحات سے مدمست ہو کر جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا۔ اس روس پر جو اس وقت تمام دنیا کے مزدوروں کی جنگ آزادی کا علم بردار تھا۔ اس کے اس فعل کے خلاف دنیا کے گوشے گوشے میں شدید رد عمل ہوا پھر بھلا وہ ترقی پسند سیاست داں انٹرنیشنل عزم و بین الاقوامیت کے حامی یہ کیسے دیکھ سکتے تھے کہ فسطائی آندھی دنیا کی اس مزدور ریاست کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔ فاشزم کے خلاف گوشے گوشے سے آوازیں اٹھنا شروع ہوگئیں جو آخرکار للکار بن گئیں۔ روس اتحادیوں میں شامل ہوگیا اور وی (V) علامت بن گئیں یہ "وی" "سواس ٹکا" کے مقابلے میں وکٹری (فتح) کی علامت سمجھی جانے لگی اور آخرکار ایک حقیقت ثابت ہوئی۔

اب سامراجیوں کو زیادہ سے زیادہ طاقت ور بننے کی ضرورت محسوس ہوئی اور انھوں نے بلا امتیاز ترقی پسند اور "بائیں بازو" کے

نظریات رکھنے والے نوجوانوں کو فوج میں جگہ دینے کا فیصلہ کرلیا۔ زیادہ سے زیادہ پروپیگنڈہ کرنے کے لیے بھی شاعروں اور ادیبوں کا سہارا لینا پڑا۔ خواہ وہ کسی خیال کے حامل ہوں اور آل انڈیا ریڈیو اس کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھا گیا۔ مسٹر احمد شاہ بخاری پطرس اس وقت آل انڈیا ریڈیو کے جنرل ڈائریکٹر اور کنٹرولر تھے۔ انھوں نے سعادت حسین منٹو۔ ن۔م۔ راشد۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری۔ کرشن چندر۔ اوپیندر ناتھ اشک۔ راجندر سنگھ بیدی۔ چراغ حسن حسرت یہاں تک ثناء اللہ ڈار۔ میراجی کو بھی شامل کرلیا اور سب کے سب لاہور سے دہلی آگئے

ان فوجیوں کے لیے جو ہندوستان سے باہر ملکوں میں جنگ کر رہے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو میں ایک سیکشن کا آغاز ہوا جو پروگرام ڈائریکٹر فار مڈل ایسٹ، کی نگرانی میں کام کر رہا تھا اور عربی فارسی اور ترکی زبانوں میں بھی خبر دیتا رہا۔

ادھر یہ بھی ہوا کہ یو۔ ٹی۔ سی (موجودہ این سی سی) کے تربیت یافتہ اشخاص اور کالجوں کے لیکچروں کو بھی رائل کمیشن ملنے لگا اور وہ بھی فوج میں بھرتی ہو گئے کچھ عارضی طور پر اور کچھ مستقل فوجی بن گئے۔ بڑے شہروں میں نیم فوجی "سول گارڈ" بھرتی کئے گئے جو عام باشندوں کو ہوائی حملوں سے بچنے کے طریقے بتاتے اور ان کی نگرانی کرتے تھے۔ یہ تو ہوا ایک سرسری جائزہ حالات وقت اور ماحول کا جس سے فیض دوچار ہو رہے

تھے۔ وہ ترقی پسند تحریک سے رشتہ رکھتے، آزادی اور سوشلزم کے حامی ہونے کے باوجود بھی کسی طرح فوجی ملازمت میں آ گئے۔ اس کا بیان انھیں کے الفاظ میں پڑھئے جو انھوں نے ڈاکٹر ایوب مرزا کے اسی سوال کے جواب میں 'ہم کہ ٹھہرے اجنبی' میں دیا ہے۔ ہم ابھی بتا چکے ہیں کہ بہت سے اساتذہ ادیب اور شاعر فوج میں بھرتی ہونے لگے تھے۔ ڈاکٹر فوق دین تاثیر پرنسپل ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر اور مجید ملک صاحب بھرتی ہو چکے تھے۔ فیض نے اپنی فوجی ملازمت کے بارے میں وہی سب کچھ بتایا جس کو ہم پہلے لکھ چکے ہیں یعنی فسطائی درندوں سے انسانیت کو محفوظ رکھنا اور وہ خود بتاتے ہیں۔

'مجھ سے پہلے مجید ملک صاحب فوج میں بھرتی ہو چکے تھے میں ان دنوں لاہور میں پڑھاتا تھا ایک دفعہ مجید ملک کا ٹیلیفون آیا، کہنے لگے فیض اب تم فوج میں آ جاؤ۔ تمہاری بڑی ضرورت ہے۔ فاشزم اس وقت خون خوار درندے کی طرح یورپ اور ایشیا میں دھاڑتا پھر رہا تھا۔ اور خون کی ہولی کھیل رہا تھا ہم جو فاشزم کے خلاف دل میں نفرت اور حقارت رکھتے تھے اور اس نفرت اور حقارت کی وجہ سے سیماب صفت ہر گھڑی بیقرار تھے کہ اس معرکے میں کیسے شریک ہوں، فی الفور فوج میں چلے گئے'[۱]

---

[۱] ہم کہ ٹھہرے اجنبی ڈاکٹر ایوب مرزا صفحہ ۵۶

آگے چل کر وہ بتاتے ہیں کہ فوج میں اگرچہ وہ ۱۹۴۲ء میں کیپٹن کے عہدے سے داخل ہوئے لیکن ان کے ذمہ سول خدمات تھیں۔

"میرے ذمہ مختلف محاذوں پر ہندوستانی سپاہیوں کے لیے پبلک ریلیشنز یا اطلاعات بہم پہنچانے کا کام تھا یعنی فوجی اخبارات اور رسائل وغیرہ کی اشاعات، ریڈیو پر فوجی پروگرام اور برٹش انڈین آدمی کی ہائی کمان، کبھی کبھی کچھ مفید مشورے دینا اور (یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ) ہم جو مشورے دیتے تھے وہ انگریز سرکار کو پسند آتے تھے (اور اسی صلے میں) انگریز سرکار نے ہمیں M.B.E (ممبر آف برٹش امپائر) کا خطاب دیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ انگریز فوجی

افسر جاپان کے خلاف جو پروپیگنڈا کراتے تھے وہ
عجیب اوٹ پٹانگ قسم کی باتیں ہندوستانی فوجیوں
سے کرتے تھے۔ مثلاً نمک حلال ہونا عین مذہب ہے
آپ لوگ ہمارا نمک کھاتا ہے لہٰذا ہمارا نمک حلال
بن جاؤ۔ تم اپنی رجمینٹ کا جھنڈا اونچا رکھو اور
اس کا بہادری قائم رکھو۔ وغیرہ [1]

فیض نے جب باتیں سنیں اور ان سے رائے دریافت کی گئی تو انھوں نے اپنی رائے لکھ کر بھجوائی کہ دونوں باتیں غلط ہیں جب افسران بالا چیں بجبیں ہوئے تو انھوں نے اس کی وضاحت اس طرح کی جس سے ان کی

---

[1] ہم کہ ٹھہرے اجنبی   ڈاکٹر ایوب مرزا   صفحہ ۵۷

حب الوطنی کا اظہار ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ ہمارے فوجی نمک اپنے ملک کا کھاتے ہیں یہ ان کا اپنا نمک ہے۔ دوسرے یہ کہ رجیمنٹ کا جھنڈا کوئی وطن کی آزادی کا جھنڈا تو نہیں ہے۔ (مذکورہ بالا باتیں) فوجی جوانوں کو متاثر نہیں کر سکیں اور انھوں نے جو مشورہ دیا وہ بڑی حد تک فوجی جوانوں کو نہ صرف متاثر کر سکتا تھا بلکہ ان میں جاپانیوں کے خلاف "دیش بچاؤ" کا جوش ابھار سکتا تھا انھوں نے جو مشورہ دیا انھیں کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے :-

"تمام فوجیوں کو یہ بتایا جائے کہ فاشزم درحقیقت کیا ہے اور اگر جاپان کے فاشسٹوں نے ہندوستان پر قبضہ کر لیا تو پھر اس ملک کی ایسی تباہی ہوگی جو کبھی نہ دیکھی نہ سنی (ہوگی) اور یہ کہ اپنے وطن کو اس تباہی سے بچانا ہر ہندوستانی سپوت کا فرض ہے اور جاپانیوں سے جنگ کرنا ناگزیر ہے۔ سرکل کے لیڈروں کو سیاسی حقائق سے پوری طرح آگاہ کیا جائے اور ہر یونٹ میں اسٹڈی سرکل قسم کی چیز قائم کیجائے"۔

فیض نے جو تجویز پیش کی اس پر بحث مباحثے ہوئے۔ مگر کمانڈر ان چیف فیلڈ مارشل نے تجویز قبول کرلی۔ لیکن وائسرائے ہند نے پھر بھی اتفاق نہیں کیا۔ پھر یہ معاملہ برطانوی لندن حکومت میں پیش کیا گیا اور فیض کی تجویز تسلیم کی گئی وہ ہمیں بتاتے ہیں :

.... چنانچہ 'جوش گروپ' کے نام ہر یونٹ میں سرکل

بنائے گئے اور ان کے لیڈروں کی تربیت کے لیے سیا تھو کے مقام پر میں نے ان کا کورس کیا۔ یہ تجربہ کافی کامیاب رہا۔"[1]

فیض مسلم لیگ کو محض رؤسا اور جاگیرداروں کی تنظیم نہیں سمجھتے تھے۔ جیسا کچھ دوسرے لوگ اور انگریز سمجھ رہے تھے۔ فیض کی رائے میں مسلم لیگ ایک باقاعدہ سیاسی تحریک تھی۔ ہندوستان کی ایک بہت بڑی عقلیت کے مفاد کے تحفظ کی تحریک اور اسی لیے جب کیبنیٹ مشن پلان کا اعلان ہوا تو ان سے استدعا کی گئی کہ وہ انگریز اور دیسی فوجی افسروں کو ہندوستان میں مسلم لیگ اور کانگریس کے بارے میں لکچر دیں موصوف نے یہ لکچر انگریزی میں افسروں کو بھری مجلس میں دیا۔ جس میں انھوں نے مسلم لیگ کی طرف سے پاکستان کے مطالبے کو ذرا وضاحت سے بیان کیا انھوں نے بتایا جب انگریز آئے تو یہاں اقتدار مسلمانوں کا تھا۔ مگر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کو پس ماندہ کر دیا۔ اب اگر ہندوستان کی اکثریت کو اقتدار سونپا گیا تو مسلمانوں کی بڑی اقلیت اپنے آپ کو سیاسی، اقتصادی، تہذیبی اور تعلیمی لحاظ سے محفوظ تصور نہیں کرے گی۔ اسی تصور کے پیش نظر مسٹر جناح کا یہ خیال تھا کہ مسلمان مجبور محض بن کر رہ جائیں گے اور اسی لیے وہ پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں۔

اسی وقفے میں فیض کی ملاقات ان امریکی اور انگریز پروفیسروں

---

[1] ہم کہ ٹھہرے اجنبی — ڈاکٹر ایوب مرزا — صفحہ ۶۴

صحافیوں اور دانشوروں سے ہوئی جن کا رشتہ کمیونسٹ پارٹی سے تھا۔
مگر وہ فاشزم کے خلاف لڑنے کے لیے بھرتی ہو گئے تھے۔ ایسے ہی
لوگوں میں ایک ہندوستانی کامریڈ وی۔ ڈی۔ چوپڑا تھا جو راولپنڈی
میں فیض کی جائے اقامت پر دوسرے غیر ملکی کامریڈ کے ساتھ میٹنگ کیا
کرتا تھا۔ اس کی خبر سی۔ آئی۔ ڈی نے ڈپٹی کمشنر کو دے دی اور فیض
کے پیچھے بھی سی آئی ڈی لگا دی گئی۔ فیض نے بڑے جرأت مندانہ انداز
میں بریگیڈیر سے اس کی شکایت کی بریگیڈیر نے ڈپٹی کمشنر کو اس کے
اس برتاؤ پر تنبیہہ کی اور فیض سی آئی ڈی کے چکر سے آزاد ہو گئے۔۔۔

مذکورہ بالا وسیع حفاظتی اقدامات اور فاشزم کے خلاف
خصوصًا جاپان کے خلاف پروپیگنڈے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستانی فوجوں
میں "دیش بچاؤ" کا جوش زیادہ پیدا ہو گیا۔ اور ان میں جرأت اور
بہادری کی قوت بھی پیدا ہوئی۔ سچ پوچھیے تو جاپان کے خلاف پروپیگنڈے
کی کامیابی کی بنیاد فیض جیسے ذہین اور صاحب فراست صلاح کار کے
مشورے ہیں جو وہ برٹش سرکار کے فوجی افسروں کو برٹش انڈین آرمی
کی ہائی کمان کو دیتے رہے ادھر یہ ہوا اور اُدھر فسطائیوں کے دلوں
میں خوف و ہراس پیدا ہوا اور وہ روس کی سرخ فوج کی یلغاروں
سے پریشان ہونے لگے اور ان کے قدموں میں لرزش پیدا ہونے لگی اور
تحریک پامردی (RESISTANCE MOVEMENT) سے وابستہ

سرخ فوجی دستوں نے جرمنیوں کے چھکّے چھوڑا دے۔

ان فوجی دستوں نے اپنی جرأت اور شجاعت کی بدولت برلن پر قبضہ کرلیا۔ جبکہ امریکی فوج بعد میں پہونچی اور اسٹالین گراڈ کی بالشت بالشت بھر زمین کی حفاظت میں سرخ فوجی دستوں نے جان کی بازی لگا کر اسے جرمن فوجوں سے نہ صرف بچالیا، بلکہ ان کو پیچھے ہٹنے اور بھاگنے پر مجبور کردیا۔ ہمارے ہندوستانی فوجیوں نے بھی اسی جرأت، شجاعت اور پامردی کا مظاہرہ کیا جیسا کچھ "تحریک پامروی" سے وابستہ سرخ فوجی دستوں نے دکھایا تھا۔ کہ اپنے بغلی حملوں سے فسطائیوں کا ناک میں دم کر دیا اور جرمن دستے پیچھے ہٹنے اور بھاگنے پر مجبور ہوئے۔ امریکا نے ہیرو شیما پر آٹیم بم برسا کر جاپان فسطائی حکومت کی چولیں ہلا دیں۔ اسطرح فاشزم کا خاتمہ ہوا اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

اب ایک سوال ابھرتا ہے کہ فیضؔ تقریباً پانچ سال فوج میں رہے۔ کیپٹن سے میجر اور پھر ۱۹۴۴ء میں لفٹیننٹ کرنل ہوئے۔ کیا اس وقفے نے ان کے شاعرانہ تخیل اور احساسات پر بھی کوئی اثرات چھوڑے اور انھوں نے اس درمیان میں شاعری بھی کی یا بالکل خاموش ہوکر رہ گئے؟

اس قسم کا سوال ڈاکٹر ایوب مرزا "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" کے مصنف نے فیضؔ سے کیا تھا۔ فیضؔ نے خود اس کا جواب دیا ہے ملاحظہ ہو:

"....... یہ بھی درست ہے کہ ہم نے اس زمانے میں بہت کم لکھا

لیکن پھر بھی لکھا ہے۔ بات دراصل یہ ہے جب عملی جنگ میں بذات خود شریک ہوں تو پھر تو شعر کم وارد ہوتے ہیں شعر تو اس استحصالی ماحول میں ایک ہتھیار کی صورت ہوتے ہیں اور اگر شاعری اپنے گرد و پیش کے ماحول میں دکھتے ہوئے جوڑوں اور رستے ہوئے ناسوروں سے پہلو تہی کرتے ہوئے آنکھوں پر پٹی باندھ لیتی ہے تو پھر یہ شاعری (OBJECTIVE REALISM) سے کوسوں دور ہوتی ہے۔ لیکن جب شاعری ان دکھتے جوڑوں اور رستے ناسوروں کا بغور جائزہ لیتی ہے اور اس معاشرے کے ان احساسات کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے جن کو یہ دکھتے جوڑ اور رستے ناسور جنم دیتے ہیں تو پھر شاعری یقیناً ایک کار آمد ہتھیار بن جاتی ہے۔" [1]

شاعری کے بارے میں فیض کا یہ خیال اگرچہ کچھ نیا نہیں ہے پھر بھی فاشزم کے استبداد اور جبر و تشدد نے جس کا اندازہ اور مشاہدہ انھیں فوجی ملازمت کے دوران ہوا اس نے اس جذبے کو تقویت پہونچائی اور فاشسٹوں کے عمل سے انھیں فاشزم سے سخت نفرت پیدا ہوگئی اور روسی سوشلزم سے عقیدت میں اضافہ ہوا۔ فسطائیوں کا غیر انسانی عمل جو بربریت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے فیض کے دل میں ایک ہیجان بے چینی، اضطراب اور بے تابی پیدا کر دیتا ہے اور وہ بول اٹھتے ہیں :

---

[1] ہم کہ ٹھہرے اجنبی — ڈاکٹر ایوب مرزا — صفحہ ۸۱

تیرگی ہے کہ امنڈتی ہی چلی آتی ہے
شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے
صبح ہونے ہی کو ہے اے دل بے تاب ٹھہر

تیرگی پر تیرگی امنڈنا انسانی جبر و تشدد کا نتیجہ ہے مگر فیض اس سے مایوس نہیں ہو رہے ہیں بے چین اور مضطرب ضرور ہیں اس لیے کہ انھیں سوشلزم کی صبح نمودار ہونے کی قوی امید ہے اور وہ اپنے بے تاب دل کو یہ کہہ کر تسلی دیتے ہیں " اے دل بے تاب ٹھہر" اور

جلد یہ سطوت اسباب بھی اٹھ جائے گی یہ
گرانبادی آداب بھی اٹھ جائے گی خواہ زنجیر
چھنکتی ہی چھنکتی ہی رہے

انھیں امید قوی ہے کہ " پایاب ہے جو موج وہ سر سے گذر جائے گی " اور " آج جو دیدہ تر ہے اس کے آنسو آتشیں شعلہ بن جائیں گے ۔ پوری غزل ملاحظہ فرمائیے تو اندازہ ہوگا کہ اس غزل میں ایک خاص قسم کا جوش اور ولولہ ہے اور انداز ترسیل جوش ملیح آبادی کو چھونے لگا ہے یہ اثر فوجی ملازمت کی دین ہے جہاں انھوں نے ہندوستانی اور غیر ملکی فوجی جوانوں کے حالات خود اپنی آنکھوں سے دیکھے اور بہت کچھ کانوں سے سنے ۔

پھر لوٹا ہے خورشیدِ جہاں تاب سفر سے
پھر نورِ سحر دست و گریباں ہے سحر سے
پھر آگ بھڑکنے لگی ہر سازِ طرب سے
پھر شعلے لپکنے لگے ہر دیدۂ تر سے
پھر نکلا ہے دیوانہ کوئی پھونک کے گھر کو
کچھ کہتی ہے ہر راہ ہر اک راہ گذر سے
وہ رنگ امسال گلستاں کی فضا کا
اوجھل ہوئی دیوارِ قفس حدِ نظر سے
ساغر تو کھنکتے ہیں شراب آئے نہ آئے
بادل تو گرجتے ہیں گھٹا برسے نہ برسے
پاپوش کی کیا فکر ہے دستار سنبھالو
پایاب ہے جو موج گذر جائے گی سر سے

جنگ ختم ہونے کے بعد انڈین نیشنل آرمی کے قیدیوں کا مسئلہ در پیش ہوا۔ اس وقت فیض راول پنڈی میں تھے اور اس علاقے کے فوجی تعلقات عامہ کی نگرانی کر رہے تھے۔ راول پنڈی کینٹ ناردن کمانڈ کا ہیڈ کوارٹر تھا جس میں سرحدی صوبہ سندھ اور بلوچستان شامل تھا۔ انھیں دہلی بلایا گیا اور (INTER SERVICES MORALE DIRECTORATE) میں کرنل حق نواز اور فیض کو سربراہ اور مشیر بنایا گیا۔ وقت ایسا آ گیا تھا جب

I.N.A کے قیدیوں کے علاوہ بمبئی کے نے وی دستوں جبل پور میں فوجی ہوائی دستوں کی بغاوت کے مسائل بھی وجود میں آ چکے تھے۔

مذکورہ بالا مسائل کے بارے میں فیض انگریز حکّامان بالا کی رائے کے بالکل خلاف تھے اور فوجی ملازمت کے دوران جو مشاہدہ ہوا اس کی رو سے حق گوئی اور راست بازی کے لیے بڑی بے باکی سے تیار ہو گئے اور ان کے سامنے غلامی کے شکنجے میں پھنسے کمزور ممالک آنے لگے۔ خواہ ملایا کے سوئیکارنو ہوں جو ولندیزیوں (ہیر لنگایوں) کے زیر اثر سسک رہے تھے یا چیانگ کیائی شیک کے خونخوار پنجوں سے نجات پانے کے لیے چین کی کمیونسٹ پارٹی کے ممبر ہوں یا ایران کے قاچاری سلاطین کے جبر و ظلم سے دبے ہوئے ایرانی یا جنوبی مشرقی افریقہ کے سیاہ فام حبشی یا خود اپنا ملک۔ فیض کی نظم سیاسی لیڈر کے نام جو مہاتما گاندھی پر کہی گئی ہے انھیں فوجی مشاہدات کا نتیجہ ہے۔

سالہا سال یہ بے آسرا جکڑے ہوئے ہاتھ
رات کے سخت و سیہ سینہ میں پیوست رہے
جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرم ستیز
جس طرح تیتری کہسار پہ یلغار کرے
اور اب رات کے سنگین و سیہ سینہ میں
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے

جا بجا نور نے اک جال سا بن رکھا ہے
دور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے
تیرا سرمایہ تری آس یہی ہاتھ تو ہیں
اور کچھ بھی تو نہیں پاس یہی ہاتھ تو ہیں
تجھ کو منظور نہیں غلبۂ ظلمت لیکن
تجھ کو منظور ہے یہ ہاتھ قلم ہو جائیں
اور مشرق کی کمیں گہہ میں دھڑکتا ہوا دن
رات کی آہنی میت کے تلے دب جائے

یہ وہ وقفہ ہے جب فیض کے دل میں حصول آزادی کے جذبے سے ایسا جوش پیدا ہوا کہ ان کی زبان پر یہ بول آ گئے۔

تجھ کو منظور نہیں غلبۂ ظلمت لیکن
تجھ کو منظور ہے یہ ہاتھ قلم ہو جائیں

اور یہیں سے برسہا برس سے غلامی کی زنجیروں میں بے آسرا جکڑے ہاتھ دکھائی دینے لگے اور ان کے اس احساس میں تیزی پیدا ہوئی کہ شاعر کا کام صرف مشاہدہ ہی نہیں بلکہ مجاہدہ بھی ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ مشرق کی کمیں گاہ میں دھڑکتا ہوا دل رات کی آہنی میت (فاشزم اور سامراجیت) کے نیچے دب جائے۔

فیض کا یوں تو تعلق (پبلک ریلیشن۔ رابطہ عامہ) اور اطلاعات

سے رہا ہے۔ پھر بھی ان کے کانوں کے پردوں سے ان نوجوان فوجیوں کی آہ و زاری ٹکرائی ہوگی جو اپنے ہاتھ، ٹانگیں اور بازو اپنے نام نہاد آقاؤں کی بھینٹ چڑھا چکے تھے۔ جن کے سینوں کے اندر دشمن کی مشین گنوں کی گولیاں کھیل رہی تھیں ان کے چہروں پر خواہ مسکراہٹ ہی رہی ہو لیکن دل رو رہے تھے اور ریڈ کراس والوں کی بے لوث خدمات بھی ان کی نظروں کے سامنے آتی جاتی رہی ہوں گی۔ فیض کا دل تڑپ اٹھتا ہے اور بنی نوع انسان کی خدمت کرنے کا جذبہ انھیں ابھارتا ہے اور اسی لیے وہ اگر کچھ اور نہیں کر سکتے تو انھیں خود اعتمادی اور پامردی کی تلقین تو یہ کہہ کر کر سکتے ہیں:

روز و شب، شام و سحر میں تجھے بہلاتا رہوں
میں تجھے گیت سناتا رہوں ہلکے شیریں
آبشاروں کے بہاروں کے چمن زاروں کے گیت
آمد صبح کے مہتاب کے سیاروں کے گیت
جی اٹھے پھر ترا اجڑا ہوا بے نور دماغ
تیری پیشانی سے ڈھل جائیں یہ تذلیل کے داغ
تیری بیمار جوانی کو شفا ہو جائے
یوں ہی گاتا رہوں گاتا رہوں تیری خاطر
گیت بنتا رہوں، بیٹھا رہوں تیری خاطر

اور وہ آخر میں غلامی کے شکنجے میں پھنسے انسانوں کو خود اعتمادی اور

اپنی مدد آپ کا درس دیتے ہیں ۔

پر مرے گیت ترے دکھ کا مداوا ہی نہیں
نغمۂ جرّاح نہیں، مونس و غم خوار سہی
گیت نشتر تو نہیں، مرہم آزار سہی

اور اسے کیا کہا جائے کہ :

تیرے آزار کا چارہ نہیں نشتر کے سوا
اور یہ سفاک مسیحا مرے قبضے میں نہیں
اس جہاں کے کسی ذی روح کے قبضے میں نہیں
ہاں مگر تیرے سوا تیرے سوا تیرے سوا

دوسری[1] جنگ عظیم کے خاتمے پر آئی۔ این۔ اے کے قیدیوں کے علاوہ ہوائی فوجی دستوں اور جبل پور میں فوجی دستوں کے باغیوں کا مسئلہ بھی درپیش تھا ان کے مقدمات اور فیصلے کے دوران فیض کو تجربہ ہوا کہ بغیر سوچے سمجھے اور صحیح تجزیہ کئے بغیر دوسروں کو مورد الزام قرار دینا ایسے سیاسی لیڈروں اور سماجی رہنماؤں کا معمولی کام ہے ۔ جو اپنے کھوکھلے نعروں سے سادہ لوح عوام کو چھل دیتے رہتے ہیں، لیکن ہمارا اشعار فن کی بقا اور حق گوئی کو بارآور کرنا ہونا چاہئے ۔ مگر اسے کیا کیا جائے کہ ہمارے یہاں سیاسی لیڈر سستی

---

[1] ہم کہ ٹھہرے اجنبی ڈاکٹر ایوب مرزا صفحہ ۷۵ تا ۷۶

شہرت کے لیے ہر وہ کام کر گذرتے ہیں جسے ایک بالغ نظر حق پرست اور باشعور شہری تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ایسے لیڈروں پر بالکل بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے اور انھیں بالکل نظر انداز کر دینا چاہیئے جو ایک طرف تو فاشزم کے خلاف مشترکہ جد و جہد میں کود پڑے پھر دوسری طرف انڈین نیشنل آرمی کے لوگوں کے لیے جلوس نکالتے پھر رہے ہیں اور سچ پوچھئے تو آئی۔ این اے کے پرجوش ممبر جب جاپانیوں کے ہاتھوں قید ہوئے تھے تو اس میں اکثر لوگوں نے خیریت اسی میں سمجھی کہ قید بند کی صعوبتیں اٹھانے کے بجائے جاپانیوں سے مل کر حلوے مانڈے کیوں نہ اڑائیں اور ملک میں ہیرو بھی کہلائیں اور جاپانیوں سے کرنل جنرل کے عہدے بھی لیں۔

یہ تو ہوا وہ تجربہ جو انھیں سماجی رہنماؤں اور سیاسی لیڈروں کے بارے میں فوجی ملازمت نے دیا اور ان کے سیاسی جذبات میں ایک جوش پیدا کیا اور انھیں دنیا کے ان تمام کمزور ملکوں سے ہمدردی پیدا ہوئی جو اپنی آزادی کے لیے مجاہدانہ کوشش کر رہے تھے اور اسی آفاقی جذبہ اخوت اور ہمدردی کے تحت آگے چل کر ان کی بہت سی نظمیں اور غزلیں وجود میں آئیں۔ "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" "آجاؤ افریقہ" وغیرہ ان میں وہ عمومیت ہے جو تلنگانہ، مراکش، تیونس، لیبیا، ایران۔ وغیرہ کے ان مجاہدین آزادی کی صعوبتوں کو اپنے اندر سموئے ہیں، جو ہندوستان کے مجاہدین آزادی کے لیے بھی، جہاں کے باشندوں پر جمہوریت

اور آزادی کے علم برداروں کے ہاتھوں بے پناہ ظلم و ستم فیضؔ کے لیے سوہان روح بن چکے تھے جو آگے چل کر ان کی تخلیقات میں جلوہ گر ہوئے۔

فوجی ملازمت کے دوران سیاسی لیڈروں، سماجی رہنماؤں وغیرہ کے اعمال سے انھیں جو تجربات ہوئے خصوصًا آئی۔این اے کے قیدیوں، دوسرے جنگی اسیروں اور فیصلوں نے موصوف کے احساسات پر جو اثرات چھوڑے ان کا اظہار جنگ کے دوران کی نظموں اور غزلوں سے صاف ظاہر ہے اور آگے چل کر جس نے بنی نوع انسان کے لیے آفاقی ہمدردی اور اخوت پیدا کردی وہ بہتیری غزلوں اور نظموں میں نمودار ہوا اور یہاں سے فیضؔ ایک ماہر سیاسی کی حیثیت سے ہمارے سامنے جلوہ گر ہونے لگے۔ جو اب تک ایک اچھے شاعر اور ماہر استاد سمجھے جاتے رہے۔

ایک بات یہ بھی واضح کردی جائے کہ فیضؔ فوجی ملازمت سے کیوں سبکدوش ہوئے۔ وقت وہ تھا جب ہوائی فوجی دستوں اور جبل پور میں فیلڈ فوجی دستوں نے برٹش راج کے خلاف بغاوتیں کردیں تو انگریز گھبرا گئے اور اس بارے میں خفیہ کانفرنسیں کرنے لگے۔ فیضؔ اور کرنل حق نواز کو پتہ لگ گیا وہ انگریز جو کل روس کے دوش بدوش فاشزم کے خلاف جنگ کر رہے تھے، آج اسی سوویت روس سے جنگ کرنے کی پیش بندیاں کر رہے ہیں اور لارڈ ویول سامراجی ہندوستان کو محاذ بنانا چاہتے ہیں۔ فیضؔ فطری طور پر ایک حساس انسان واقع ہوئے تھے

اس تجویز سے آپے سے باہر ہو گئے اور انھیں اس فریب کاری نے بدظن کر دیا اور یقین ہو گیا کہ انگریز ہندوستان کو نہ تو آزاد کرنا چاہتے ہیں اور نہ پاکستان بنانے کی حمایت میں ہیں۔ فیض اب نئی جنگ کے میدان میں آ گئے ہندوستان کی مکمل آزادی، قیام پاکستان کے لیے جدوجہد اور سوشلسٹ روس کے خلاف برٹش سازشوں کا پول کھولنا فرض سمجھا اور ملازمت سے سبکدوش ہو گئے اور دوسری نئی جنگ میں شریک ہو گئے۔ اپنے وطن کی آزادی اور بین الاقوامی سوشلزم کی حمایت میں کوشاں رہے کیونکہ وہ اپنے ملک اپنے وطن اپنے اصولوں اور سوشلزم سے غداری نہیں کر سکتے تھے۔

یہ تھے وہ حالات جن سے فیض دوچار رہے اور ان کی شاعری انھیں حالات کی آئینہ دار رہی۔ جس کا تجزیہ اگلے صفحات میں تفصیل سے کیا جائے گا۔

بابِ پنجم

فیضؔ کی شاعری کے سرچشمے

ہر شاعر اور ادیب اپنے اسلاف شعراء اور ادباء سے متاثر ہوتا ہے۔ جس طرح ادب سماج کا آئینہ ہے بالکل اسی طرح شاعر اور ادیب سماج کو نئی راہیں دکھانے کا ذمہ دار بن جاتا ہے۔

عربی زبان کے مشہور نقاد اور شاعر ابن قدامہ نے ہر نئے شاعر کے لیے اپنے پیش رو شاعروں کے کلام سے پانچ سو سے ہزار اشعار تک حفظ کرنے کی ہدایت کی تھی۔

اس سے پہلے کے باب میں فیضؔ کی شاعری کا ادبی اور شعری پس منظر بہت تفصیل سے لکھا جا چکا ہے لیکن یہاں پھر بھی ایک تو اس انٹرویو کا جو مرزا ظفر الحسن نے موصوف سے لیا تھا اور دوسرا ان کے ایک کلاس فیلو شیر محمد حمید کے اس بیان کا خلاصہ دینا نامناسب نہ ہوگا جو انھوں نے اپنے ایک مضمون "فیضؔ سے میری رفاقت" میں لکھا ہے۔

فیضؔ خود لکھتے ہیں:

"جب میں اسکول میں پڑھتا تھا اس زمانے میں رات کو ابّا بلا لیا کرتے خط لکھنے کے لیے اور انھیں انگریزی اخبار بھی پڑھ کر سناتے تھے اس زمانے میں انھیں خط لکھنے میں دقت محسوس ہوتی تھی۔" [۱]

"(شاید بصارت میں کمی ہو گئی ہو) ان مصروفیات کی وجہ سے ہمیں بچپن میں بہت فائدہ ہوا۔ اردو انگریزی اخبارات پڑھنے، خطوط لکھنے کی وجہ سے ہماری استعداد میں کافی اضافہ ہوا"

ایک بات انھوں نے اور بتائی جس سے ان کے مطالعہ کے ذوق

---

[۱] خون دل کی کشید مرتبہ مرزا ظفر الحسن صفحہ ۱۰

پر گہری روشنی پڑتی ہے اور یہ کہ اردو داستانی ادب پر ان کی گہری نظر ہو گئی تھی۔

"شاعروں کا کلام پڑھنا شروع کیا۔ داغ کا کلام پڑھا میر کا کلام پڑھا۔ غالب تو اس وقت بہت ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ دوسروں کا کلام آدھا سمجھ میں آتا تھا اور آدھا نہیں آتا تھا۔ لیکن ان کا دل پر اثر کچھ عجیب قسم کا ہوتا تھا شعر سے لگاؤ پیدا ہوا اور ادب میں دلچسپی ہونے لگی۔"[1]

"ہم نے اپنے والد بزرگوار کے مشورہ پر قلعہ لائبریری لاہور سے انگریزی ناول لاکر پڑھنا شروع کیے انگریزی میں ڈکنس، ہارڈی وغیرہ کے ناول پڑھ ڈالے وہ بھی آدھا سمجھ میں آتا تھا آدھا پلے نہ پڑتا تھا اس مطالعہ کی وجہ سے ہماری انگریزی بہتر ہو گئی۔"[2]

"ہمارے گھر سے ملی ہوئی ایک حویلی تھی جہاں سردیوں کے زمانے میں مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ سیالکوٹ میں پنڈت راج نرائن ارمان

---

[1] خون دل کی کشید مرتبہ مرزا ظفر الحسن صفحہ ۱۱

[2] خون دل کی کشید مرتبہ مرزا ظفر الحسن صفحہ ۱۱

دل تھے جوان مشاعروں کے انتظامات کرتے تھے ۔ ایک بزرگ منشی سراج الدین مرحوم تھے اس وقت میں ہائی اسکول میں تھا اور شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔"[1]

ہم نہیں کہہ سکتے کہ ابن قدامہ کا مقولہ فیضؔ تک پہنچا یا نہیں ؟ مگر اندازہ ایسا ہوتا ہے کہ موصوف نے عنفوان شباب سے ہی اکابر شعرائے اردو کے کلام کا مطالعہ شروع کر دیا تھا ۔ چنانچہ میرؔ غالبؔ سوداؔ اور بعد میں اقبالؔ کے کلام سے انھیں خاصی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی ۔ ان سے جب کسی نے اکابر شعرائے اردو سے تاثر کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے برجستہ جواب دیا کہ میرؔ غالبؔ اور اقبالؔ سے بہت زیادہ متاثر ہیں اور ان اکابرین شعراء کا کلام اس وقت بہت کچھ ان کی سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا ۔ مگر وہ پڑھتے ضرور رہتے تھے ۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ابن قدامہ کے اصولی نظریے کے تحت وہ اکابرین شعراء کے کلام کا مطالعہ کرنے کے شائق رہے ۔ اور انھوں نے ان کا بہت گہرا مطالعہ کیا ۔

فیضؔ کے غزلیاتی کلام اور قطعات کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے سے اس بات کا اندازہ اور بھی ہو جاتا ہے جب ہم ان کے بے پناہ مشہور اور مقبول قطعہ کا یہ شعر پڑھتے ہیں ۔

---

[1] خون دل کی کشید   مرتبہ مرزا ظفر الحسن   صفحہ ۱۲

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے

تو کیا مرزا غالب کا یہ شعر سامنے نہیں آجاتا :-

لکھتے رہے جنوں میں حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اسی طرح

شیخ صاحب سے رسم و راہ نہ کی
شکر ہے زندگی تباہ نہ کی

شیخ اور محتسب پر طنز کرنا حافظؔ اور اردو کے شعراء کا عام دستور بن گیا تھا۔ ان کی وہ غزلیں جو انھوں نے نذرِ سوداؔ نذرِ غالبؔ وغیرہ کی ہیں ان سے بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں شعراء سے اثر لیا گیا ہے اور ان کا لب و لہجہ اور رنگ و آہنگ بھی بہت کچھ مماثلت رکھتا ہے۔

مرے کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور کے شعری اور ادبی ماحول کے بارے میں وضاحت سے بیان کیا جاچکا ہے۔ لیکن یہاں پر ان کے ایک ساتھی شیر محمد حمید کے الفاظ میں مزید بیان کرنا چاہتا ہوں کہ کس طرح فیضؔ جیسے خاموش سنجیدہ اور شرمیلے نوجوان طالب علم سے ان کی رفاقت ہوئی اور کس طرح احمد شاہ بخاری پطرسؔ کی قائم کردہ ایک ادبی سوسائٹی "مجلس" میں

شرکت نے فیضؔ کے تخیل اور احساسات پر اثر چھوڑے۔ اس مجلس کے رکن پطرسؔ بخاری نے طلبہ کے ذوق مطالعہ اور استعداد کا لحاظ رکھتے ہوئے منتخب کئے "فیضؔ۔ ن۔م۔ راشدؔ۔ آغا عبدالحمید۔ نبی احمد حفیظ ہوشیار پوری وغیرہ اور خاکسار یعنی شبیر محمد حمیدؔ۔ یہ مجلس یوں تو طلبہ سے متعلق تھی مگر پروفیسر بخاریؔ صاحب کی دعوت پر لاہور کے برگزیدہ ادیب اور دانشور شریک ہوتے تھے۔ ڈاکٹر تاثیر مولانا سالک۔ امتیاز علی تاجؔ۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم۔ مالک رام۔ چراغ حسن حسرتؔ تو برابر شریک ہوتے اور حفیظ جالندھری بھی کبھی کبھی تشریف لاتے تھے"۔[1]

"یوں تو فیضؔ میں شاعری کا مادّہ فطری و وہبی تھا لیکن اس "مجلس" کے اکابر احمد شاہ بخاری پطرس۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے فیض اور التفات نظر کے باعث ہم لوگوں میں شعر و ادب سے دلچسپی پیدا ہوگئی ہر شام ہاسٹل کے کسی کمرے میں مشاعرہ برپا کر بیٹھتے تھے۔ مصرعہ طرح پر کوئی دو چار شعر لکھ کر لاتا۔ محفل کے ختم ہونے پر غزل سے انتخاب کر کے ایک غزل مرکب تیار کر لیتے جو کالج کے مجلّہ راوی میں "احباب" کے نام سے چھپتی۔

---

[1] خون دل کی کشید   مرتبہ مرزا ظفر الحسن   صفحہ ۴۶

ظاہر ہے اس میں حقہ وافر فیضؔ کا ہوتا"۔[1]

یہ حالات جن کو ہم ابتدائی سرچشموں سے تعبیر کر سکتے ہیں ان کی طالب علمانہ زندگی سے ان کی ملازمت امرتسر تک سمجھئے۔ اس سلسلے میں اگر علامہ اقبالؔ کو بھی شامل کر لیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ جیسا کہ فیضؔ نے خود ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ علامہ اقبالؔ ان کے والد کے احباب میں تھے اور وہ ان کے ساتھ دو ایک بار علامہ موصوف سے ملنے بھی گئے مگر خاموش چپ چاپ بیٹھے رہتے تھے اور کچھ شعر و شاعری کے بارے میں کبھی ان سے گفتگو کرنے کی جرأت نہ کی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے علامہ کی شاعری سے گہرا اثر قبول کیا ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ فیضؔ ان کی شاعری کی زبان لب و لہجہ اور آہنگ سے خواہ متاثر ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں پھر بھی مغربی جمہوری نظام کی حقیقت، مزدور، محنت کش اور کسان طبقے کی خستہ حالی اور ان کے ساتھ ہمدردی اور ان کی حالت سنوارنے کے جذبات جو علامہ کی شاعری میں اجاگر ہیں ان سے ضرور متاثر ہوئے۔

(۲)

امرتسر کالج کی ملازمت کے دوران فیضؔ کو جن احباب کی قربت

---

[1] نجومِ دل کی کشید مرتبہ مرزا ظفر الحسن صفحہ ۴۷

نصیب ہوئی اور ان کے خیالات اور احساسات نے انھیں بے حد متاثر کیا وہ ہیں ڈاکٹر فوق دین تاثیر (جو بعد میں ان کے ہم زلف ہوئے) محمود الظفر اور ڈاکٹر رشیدہ جہاں۔ ان لوگوں سے قربت اور مخلصانہ ملاقاتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں سوشلزم سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ ایسا عمیق شغف کہ لاہور میں "ترقی پسند سوسائٹی" کے وہ بانی شمار کیے جانے لگے اس تحریک سے فیضؔ کی مخلصانہ اور سنجیدہ وابستگی کا بیان ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ ہوا یہ کہ کسی دن ڈاکٹر رشیدہ جہاں نے حالت دیکھ کر موصوف سے پوچھا۔

"کسی کام میں تیرا جی نہیں لگتا معاملہ کیا ہے[1]" فیضؔ خاموش رہے تو وہ تاڑ گئیں اور بلا تکلف بولیں "محبت میں ناکامی" فیضؔ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ڈاکٹر محترمہ نے کہا یہ حادثہ تمہاری ذات واحد کا بہت بڑا حادثہ ہو سکتا ہے مگر یہ اتنا بڑا بھی نہیں کہ زندگی بے معنی ہو جائے اور انھوں نے موصوف کو ایک کتاب مطالعہ کے لیے دی (یہ کتاب کارل مارکس کی کمیونسٹ مینی فسٹو تھی) فیضؔ اس کتاب کے مطالعہ سے بے پناہ متاثر ہوئے اور یک بیک ان کے منہ سے نکل گیا":

"مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ" اسطرح فیضؔ نئی منزلوں کے جادہ پیما بن گئے اب کیا تھا[2]۔

---

[1] شبستاں فیضؔ نمبر صفحہ ۶۳

[2] شبستاں فیضؔ نمبر صفحہ ۶۳

مقامِ فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

اور ان کے بارے میں یہ مقولہ زبان زد ہو گیا۔ رومان سے حقیقت کی طرف مردمان کہیئے یا کوئے یار" کہہ لیجئے۔ ہمارے خیال میں ان کا رومان بھی اپنے پس منظر میں حقیقت سموئے تھا۔ یہ بات ضرور ہے کہ اس حقیقت کا رشتہ محض ایک ذات فیضؔ سے تھا۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنے ایک مقالہ بعنوان "فیضؔ کے دو عشق"[1] میں کوئے یار سے بڑی چابکدستی سے پردہ اٹھایا ہے۔ کہ فیضؔ جب گورنمنٹ کالج لاہور میں (۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء) زیر تعلیم تھے تو پہلے عشق کا تیر ان کے سینے میں لگا اور میر تقی میرؔ کے عشق کی طرح زخم اتنا کاری تھا کہ ساری زندگی مندمل نہ ہو سکا۔ اسی طرح ڈاکٹر ایوب مرزا نے اپنی کتاب " ہم کہ ٹھہرے اجنبی" میں اس بارے میں لکھا ہے جب ڈاکٹر موصوف نے فیضؔ سے پوچھا ' فیضؔ صاحب آپ نے کبھی محبت کی ہے؟ انھوں نے اثبات میں جواب دیا۔ پھر انھوں نے پوچھا؟ سیریس محبت ہے؟ فیضؔ صاحب بولے ہاں ہاں تمہارا مطلب پہلی محبت سے ہے نا۔ محبت پہلی ہی ہوتی ہے اس کے بعد سب ہیرا پھیری .... اس کے بعد انھوں نے

---

[1] شبستاں فیضؔ نمبر صفحہ ۵۹

دریافت کیا اس کا انجام؟ بولے " بھئی وہی جو ہوا کرتا ہے اس کی شادی ہو گئی اور ہم نوکر ہو گئے "

کام دیو نے میر تقی میر اور فیض کے جو تیر لگائے اور عشق و محبت میں ناکامی کے جو زخم دیئے اور دونوں نے غزل کی صورت میں جو دردناک اور پُر درد آہیں بھریں کیا وہ محض غزل کے عام روایاتی عشق کی طرح رومان محض کہا جا سکتا ہے؟ کیا اس کے پس پردہ حقیقتیں نہیں جھانک رہی ہیں اور اس لیے میر نے تو صاف صاف کہہ دیا۔

مجھکو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
دردِ غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

اور فیض کس المناک لہجے میں کہہ رہے ہیں

وہ جس کی دید میں لاکھوں مسرتیں پنہاں
وہ حسن جس کی تمنا میں جنبش پنہاں

(۳)

اگر ہم کسی شاعر اور ادیب کی زندگی کے ان سانحات کو اس کی تخلیقات کا سرچشمہ کہہ سکتے ہیں جنھوں نے اس کی سوجھ بوجھ احساسات اور جذبات

میں نئے موڑ پیدا کیے اور اس کے تخیل میں درخشانی، تابانی اور ایسی جولانی پیدا کی جس سے عوام کے دکھ درد کی ترجمانی ہو رہی ہو اور شاعر یا ادیب کی تخلیق ان کا مداوا بن سکی ہو اور وہ جمہور کے مصائب اور مصائب میں شریک رہا ہو تو وہ فیض احمد فیض کی فوجی ملازمت ہے جس سے وہ فاشزم کے جبر و ظلم سے واقف ہوئے اور تسلطائی جارحیت کے خلاف آواز اٹھائی اور جمہور کو اس سے بچانے کے لیے تیار ہوئے۔ فوجی ملازمت کے باب میں ہم اس پر تفصیلی روشنی ڈال چکے ہیں۔ دوسرے پاکستان ٹائمز (انگریزی) اور امروز (اردو) کی چیف ایڈیٹری جس نے انھیں پس ماندہ طبقے خصوصاً مزدور اور کسانوں کے مصائب اور مطالبات پیش کرنے کا موقع دیا۔ اور تیسرے اسیرانہ زندگی بھی ان کی شاعری کا سرچشمہ بن سکتی ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ فیضؔ نے اپنی غزلوں میں عشق سیاست اور سماج سے تعلق رکھنے والے مختلف موضوعات کے ساتھ ساتھ تصوف کی جھلکیاں بھی پیش کی ہیں اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فیضؔ کی غزلیں تصوف اور صوفیانہ خیالات سے متاثر ہیں جس کا اعتراف انھوں نے جا بجا کیا ہے۔ اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں۔

"میرا تصوف سے بھی لگاؤ ہے اگر شاعرانہ طریقے سے
دیکھا جائے تو میرا ذہنی رشتہ تو صوفیا ہی سے ہے۔

ہماری غزل میں اہل وطن اور اہل ظاہر کی کشمکش شروع سے ہی

موجود ہے۔ طریقت اور شریعت، انسان دوستی اور محبت کا درس دیتے تھے۔ دنیاداری اور ظاہر پرستی، تعصب، نفرت اور تحکم کے خلاف تھے۔"[1]

چونکہ فیض کی طبیعت میں اختراع اور جدت کا عنصر ہر جگہ نظر آتا ہے۔ لہٰذا ان کے خیالات ہر جگہ روایت سے کافی قریب نظر آتے ہیں مثلاً :

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گذار کے

اگرچہ یہ شعر عشقیہ شعر ہے لیکن یہاں بھی فیض کی جدت اور روانیٔ طبع نے اسے ایسا رنگ دیا ہے کہ یہ شعر سماج، ماحول اور سیاست کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ روایتی انداز کے ساتھ ساتھ فیض سماجی اور سیاسی حالات کا دامن کبھی نہیں چھوڑتے۔ فیض کی غزلیں کلاسیکی انداز میں ضرور ہوتی ہیں ان کی بندش اور تراکیب یقیناً کلاسیکی انداز میں ہوتی ہیں جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فیض غزل کے قدیم اکابر شعراء سے جن کا ذکر ہم نے جابجا کیا ہے متاثر رہے۔ ان کے کلام میں سلاست روانی اور تہہ

---

[1] فیض سے ایک انٹرویو اخبار جنگ (لاہور) حسن رضوی

داری کے ساتھ ساتھ بلا کی شگفتگی پائی جاتی ہے۔ ایک اچھی غزل کی پہچان یہ ہے کہ جو دل کی گہرائیوں سے نکلے اور ہمارے دلوں کے تار کو جھنجھوڑ دے فیض کی غزلیات اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ نظر آتی ہیں ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن، نہ تھی تری انجمن سے پہلے
سزا، خطائے نظر سے پہلے، عتاب جرمِ سخن سے پہلے
جو چل سکو تو چلو کہ راہِ وفا بہت مختصر ہوئی ہے
مقام ہے اب کوئی نہ منزل، فرازِ دار و رسن سے پہلے
غرورِ سرو سمن سے کہہ دو کہ پھر وہی تاجدار ہوں گے
جو خار و خس والیٔ چمن تھے عروجِ سرو و سمن سے پہلے
ادھر تقاضے ہیں مصلحت کے، ادھر تقاضائے دردِ دل ہے
زباں سنبھالیں کہ دل سنبھالیں، اسیر ذکرِ وطن سے پہلے

ان کی غزلوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں صنائع اور بدائع پر قدرت کاملہ حاصل ہے۔ تشبیہات، استعارات، کنایات اور دیگر صنائع کو اس انداز سے نہایت سادہ اور سلیس ترکیب کے ساتھ استعمال کرتے ہیں کہ غزل کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔

کلام فیض کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزی شعراء اور ادب سے متاثر رہنے کے باوجود بھی انھوں نے قدیم روایتی شاعرانہ رنگ اور آہنگ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا چنانچہ یہی قدیم رنگ اور آہنگ ہی ان کی غزل اور خود ان کی مقبولیت کا باعث بنا۔ ان کی بہت سی نظمیں غزل کی شکل اور ہیئت میں ہیں۔ جن میں چند قابل ذکر ہیں۔ داسوخت مرگ سوزِ محبت، بعد از وقت، انجام، ترانہ، اگست ۱۹۵۲ء اور شہر یاراں وغیرہ ہیئت کے اعتبار سے غزل ہے۔ اگر شہر یاراں کو الگ کر دیا جائے تو باقی تمام نظمیں مسلسل غزلیں نظر آئیں گی۔ زبان و بیان ہیئت اور اسلوب کے اعتبار سے بھی یہ تمام نظمیں روایتی رنگ لیے ہوئے غزل سے بہت زیادہ نزدیک ہیں۔ جس کی وجہ سے کبھی کبھی ان کے غزل ہونے کا دھوکا ہوتا ہے۔

اردو شاعری میں میر ایک ایسا شاعر ہے جس کا اثر کسی نہ کسی اعتبار سے ہر شاعر نے لیا اگرچہ فیض کے کلام میں براہ راست یہ اثر نہیں ملتا لیکن بہ نظر غائر فیض کے کلام کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ میر کی اہم خصوصیات مثلاً فنی توازن ضبط و اعتدال اور دل کی گہرائی کا چھپا سوز اور تاثر جو میر کی خاص خصوصیات تھیں فیض کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ فیض اپنے تجربات کو فنی پیرائے میں بیان کرتے وقت ہمیشہ ضبط و اعتدال سے کام لیتے ہیں اور کبھی بھی وہ غزل کے کلاسیکی سرمائے سے بے تعلق نظر نہیں آتے اسی وجہ سے ان کی غزلوں میں بلا کا تاثر اور جادو نظر آتا ہے۔ ان کی غزلوں

میں لفظوں کی آواز بحروں کے اوزان، قافیوں کی تکرار، الفاظ کی مناسب ترتیب اور بندش ایسی ہوتی ہے جس سے موسیقی سے بھرا ہوا ان کا لہجہ ایک مخصوص آہنگ پیش کرتا ہے۔ جس کے باعث ان کی غزلیں میر کی سی شعریت اور ہم آہنگی پیدا کرتی ہے جیسے

ع اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں (میر)

میری خاموشیوں میں لرزاں ہے
میرے نالوں کی گمشدہ آواز (فیض)

غزلوں میں کہیں کہیں مصحفی کا انداز بھی جھلکتا ہے۔ مصحفی کی خصوصیات نرمئی آواز، اعتدال پسندی، حلاوت رنگینی اور صوتی ہم آہنگی ہیں جو فیض کے اشعار میں جابجا زیادہ واضح اور صاف انداز میں ظاہر ہوتی ہے۔

اردو شاعری میں غالب ایک ایسا ستون ہے جس سے بعد میں آنے والا کوئی بھی شاعر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا اگرچہ ان کا رنگ کوئی نہ اپنا سکا لیکن بعد کے آنے والے شعراء کے کلام سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کا اثر خواہی نہ خواہی ہر شاعر کے کلام میں جھلکتا ہے چنانچہ فیض کے یہاں بھی ہمیں اس کا بیّن ثبوت ملتا ہے۔ فیض کی شاعری کے رنگ و آہنگ پر تو غالب کا اثر خاصا نمایاں ہے۔ ان کا انداز فکر غالب جیسا ہے البتہ

کیفیت قدرے مختلف ہے۔ شلاً غالب کہتے ہیں :

؎ غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا !

فیض کی ندرت کوش فطرت نے اس خیال کو اس انداز میں پیش کیا ہے :-

؎ دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

لہٰذا اختصار کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ فیض تمام انقلابی فکر اور ترقی پسند تحریک کے دل دادہ ہونے کے باوجود غزل کے کلاسیکی اسلوب کو ترک نہیں کرتے بلکہ وہ اس کے اس حد تک دل دادہ نظر آتے ہیں کہ ان کی بعض نظمیں اور غزلیں غالب کی غزل معلوم ہوتی ہیں ۔ جن میں غالب کا سا انداز اور ان کی زبان صاف طور پر نمایاں نظر آتی ہے ۔ شلاً

؎ یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی

نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

یہ درست ہے کہ ان کی نظمیں پچاس سال تک فضا میں گونجتی رہیں اور آئندہ بھی گونجتی رہیں گی لیکن اس سلسلے میں عرض کرنا چاہوں گا کہ انھوں نے کبھی غزل کو ترک نہیں کیا اور خود بھی ایک انٹرویو میں کہا ہے۔

" یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے غزل کو ترک نہیں کیا۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ اس میڈیم میں ہم نے نئے مضامین نظم کے رنگ میں باندھے ہیں مگر یہ غلط ہے کہ اس کی ابتداء ہم نے کی ہے۔ ہم نے تو محض غالب اور علامہ اقبال کی پیروی کی ہے۔ ہم نے غزل کو ترک نہیں کیا۔ جیسا کہ غالب اور اقبال نے اس میڈیم کو ترک نہیں کیا تھا۔ یہ خوبصورت میڈیم ہے لیکن وقت کے تقاضوں کے ساتھ اس میں تبدیلی آنا ضروری ہے۔ یہ انقلاب ہم نہیں لائے۔ اس کا سہرا تو غالب اور اقبال کے سر ہے۔ بھئی وہ بہت بڑے استاد ہیں ہم نے تو ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔" [۱]

فیض کے اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ وہ غالب اور اقبال

۱۔ فیض احمد فیض   مصنف کے کھاتے   صفحہ ۶۶

سے حد درجہ متاثر تھے اور اقبال کے متعلق جو الفاظ اور بیانات انھوں نے دیئے ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اقبال کے براہ راست شاگرد نہ ہونے کے باوجود بھی انھیں اپنا مُربی سرپرست، مشفق، محسن اور استاد مانتے رہے۔ ایک انٹرویو میں جب فیض سے پوچھا گیا کہ علامہ اقبال سے اتنی عقیدت رکھنے کے باوجود ان کی شاعری کا اثر آپ کی شاعری میں نمایاں نہیں تو فیض نے جواب دیا :

"اقبال سے نیاز مندی کا شرف حاصل رہا ان کی صحبت سے فیض اٹھانے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ لیکن آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ ان کی شاعری سے میں متاثر نہیں ہوا ہوں میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی طور سے ان کا کلام اور میرے کلام میں اتحاد پایا جاتا ہے ظاہر ہے کہ ان کا طرز کلام دوسرا ہے اور میرا دوسرا۔ لیکن جہاں تک انسانی دوستی، انسان کی عظمت، عدل و انصاف، استحصال کا خاتمہ، آزادی، ظلم و جبر کے خلاف احتجاج، یہ ہم دونوں میں مشترک ہے"[1]

علامہ کے انتقال پر فیض نے جو نظم لکھی اس سے ان کی عقیدت اور محبت صاف ظاہر ہے۔

---

[1] فیض احمد فیض   مصنف کے کے کھلّر   صفحہ ۶۶

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں گزر گیا
سنسان راہیں خلق سے آباد ہو گئیں
ویران مے کدوں کا نصیبہ سنور گیا
تھی چند ہی نگاہیں جو اس تک پہنچ سکیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں پر اثر گیا
اب دور جا چکا ہے وہ شاہِ گدا نما
اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اداس ہیں
چند اک کو یاد ہے کوئی اس کی ادائے خاص
دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں

سیاسی اور سماجی بیداری کو سب سے پہلے اقبال نے اپنی شاعری میں سمویا اسی وجہ سے ہر ترقی پسند شاعر نے کلام اقبال کو اس راہ میں سنگ میل جانا اور فیض نے تو اقبال کے دکھائے ہوئے راستے کو ہر دم سامنے رکھ کر اپنے کاروانِ شاعری کو آگے بڑھایا اگر میں کہوں کہ اسی کی بدولت ان کی شاعری پروان چڑھی تو نہ کوئی مبالغہ ہو گا اور نہ کوئی بیجا بات ۔

یہاں ایک دوسرے نکتہ کی طرف اشارہ کرنا بیجا نہ ہو گا چونکہ

فیض عربی فارسی اور انگریزی پر دسترس رکھتے تھے اس وجہ سے وہ یقیناً اس ادب کی باریکیوں اور لطافتوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے جس کا اندازہ ہمیں ان کے اشعار سے جا بجا ہوتا ہے ۔ اثبات میں ان کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔ فیض کا یہ شعر۔

ہے اہل دل کے لیے اب یہ نظم بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

ہمیں فارسی کے پیمبر سخن شیخ سعدی کے زرّیں مقولہ
"سنگ را بستند و سگاں را کشادند"

کی یاد دلاتا ہے ۔

فیض نے فارسی شعراء کی طرح صبا کو پیغام پہنچانے اور لانے کا وسیلہ قرار دیا ہے کہتے ہیں۔

صبا نے پھر در زنداں پہ آکے دی دستک
سحر قریب ہے، دل سے کہو نہ گھبرائے

دیکھیے حافظ نے کسطرح سے اسی مضمون کو ادا کیا تھا ۔

؎ صبا بہ لطف بگو آں غزالِ رعنا را
کہ کوہ و دشت و بیاباں تو دادۂ مارا

حافظ کی طرح فیضؔ بھی تلطف اور مدارا کے دلدادہ تھے۔ کہتے ہیں۔

؎ بجھم جہاں ہو، رُخِ یار ہو کہ دستِ عدو
سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا

کیا فیضؔ کا یہ شعر ہمیں حافظؔ کے مشہور شعر

؎ آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

کی یاد نہیں دلاتا۔
یہی نہیں فیضؔ نے کہا کہ

؎ ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

یقیناً حافظ کے اس شعر سے متاثر نظر آتے ہیں۔

؎ در ایں زمانہ نشد کس حریفِ فریادم
بہ بلبلانِ چمن ہم گلے فرستادم

چونکہ حافظ کی طرح فیض بھی پیامِ انسانیت اور بشر دوستی کے علم بردار تھے ۔ اسی وجہ سے انھوں نے حافظ کے خیالات کو جا بجا اپنے اشعار میں سمونے کی کوشش کی ہے ۔ یہاں تک کہ اپنے ایک بند میں یوں شعر کی تضمین کر دی ہے ۔

یہ شعرِ حافظِ شیراز، اے صبا! کہنا
ملے جو تجھ سے کہیں وہ حبیبِ عنبر دست
"خلل پذیر بود ہر بنا کہ مے بینی
بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است"

اور تو اور سہی فیض نے اپنے بعض شعری مجموعوں میں فارسی کے شعر بطور سرنامہ پیش کئے ہیں ۔ حافظ اور سعدی کے علاوہ فارسی کے بہت سے شعرا ہیں جن کا رنگ فیض کے یہاں کسی نہ کسی انداز میں مل جاتا ہے ۔ اس کے علاوہ فیض نے جب آنکھ کھولی اس وقت انگریزی کا غلبہ تھا اور ان کے گھر کا ماحول بھی دینی ہونے کے ساتھ ساتھ انگریزی رسم و رواج کا آشنا اور دلدادہ تھا لہٰذا فیض کو بھی انگریزی تعلیم دی گئی جس سے انھیں انگریزی اور یوروپین ادب سے قریب ہونے کا موقع ملا فیض نے انگریزی اور یوروپین ادب کا گہرا مطالعہ کیا جس سے ان کے فکر میں تبدیلی آئی جس کے اثرات ان کے کلام میں نمایاں ہیں ۔

فیضؔ مغربی شعراء اور ان کے آراء و افکار سے از حد درجہ متاثر ہیں انھوں نے نہ صرف انگریزی شاعری کے رنگ و آہنگ کو فیشن کے طور پر اپنایا بلکہ انگریزی کی تراکیب اور استعارات کو پہلے اردو کے مزاج کے مطابق ڈھالا پھر اپنے اشعار میں پیش کیا۔ اسی وجہ سے غیر مانوس استعارات بھی ان کے اشعار میں کبھی بھی پیوند نظر نہیں آتے۔ یہ اثرات ان کی نظموں میں زیادہ نمایاں ہیں۔ چونکہ ہمارے احاطۂ مضمون سے ان کی نظمیں باہر ہیں اسی وجہ سے ہم اردو کے مشہور ناقدین کی آراء پر اکتفاء کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر لکھتی ہیں۔

”فیضؔ نہ صرف انگریزی شاعروں کی طرزِ فکر سے متاثر ہیں بلکہ ترسیل کے نئے مرقعوں کی پیش کشی میں بھی انھوں نے ان شاعروں کے طرزِ ادا سے اثر قبول کیا۔ نظم تنہائی، آرتھر سائمن کے بروکن ٹرسٹ (BROKEN TRUST) اور ہارڈی کی دی بروکن اپائنٹمینٹ (THE BROKEN APPOINTMENT) کی یاد دلاتی ہے۔ فیضؔ وہاں سوئن برن (SWIN BURNE) کے ہم مسلک نظر آتے ہیں۔ جہاں انھوں نے ادعائیت سے ٹکر لی ہے اور جہاں وہ انسانی مسائل کو تاریخ و ثقافت کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں ترکیبوں کی تراش خراش صنعت کے مخصوص استعمال اور طرزِ ادا پر انگریزی شاعری کی چھاپ نمایاں ہے۔“[1]

---

[1] فن اور شخصیت فیضؔ نمبر صفحہ ۳۹

ڈاکٹر ثمینہ شوکت اپنے ایک مضمون میں یوں رقم طراز ہیں۔

"جس طرح کلام کی بے پناہ خوبیوں کے باوجود کیٹس رومانی شاعر ہی ہے۔ کلاسیکی شاعر نہیں۔ فیض بھی بنیادی اعتبار سے رومانیت کا شاعر ہے۔ محسوسات کا دلدادہ بہترین جدید شاعر"۔[۱]

فراق گورکھپوری اپنی تصنیف میں لکھتے ہیں۔

"فیض اس لحاظ سے انگریزی رومانی شاعری سے بہت قریب ہو جاتا ہے کہ اس کی شاعری کی بنیادیں اپنے وقت اور اپنے زمانے کی بعض اقدار پر قائم ہیں"۔[۲]

پروفیسر سلامت اللہ خاں اپنے ایک مضمون "انتظار اور تنہائی کا شاعر" میں لکھتے ہیں۔

"فیض جذبی اور اختر الایمان کی شاعری میں اگر ورڈسورتھ کے ادراک اور تخیل کا ملاپ اور تخیل بصیرت ہے تو وکٹورین شاعری کی طرح ان کی شاعری میں مرکزی مقصد اور محرک عقلی یا ذہنی بھی ہے، ان میں ارنلڈ کا انکسار اور اعتدال ہے۔"[۳]

۱ھ	فن اور شخصیت	فیض نمبر	صفحہ ۴۵
۲ھ	اردو کی عشقیہ شاعری	فراق گورکھپوری	صفحہ ۱۲۵
۳ھ	فن اور شخصیت	فیض نمبر	صفحہ ۱۰۸

اسی مضمون میں آگے فیضؔ کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے پروفیسر سلامت اللہ لکھتے ہیں :-

" فیضؔ کی شاعری میں جو چیز ابتداء سے کھٹکتی ہے وہ ان کی روح کی تنہائی ہے خواہ وہ ایک نظم ہو یا پورا مجموعہ لیکن پڑھتے ہوئے قاری ان کی روح کی تنہائی کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ بہت کچھ شیلیؔ کی طرح ان کی اکتائی اکتائی سی نظریں اپنے گرد و پیش پر پڑتی ہیں"[1]۔

اپنے ایک مضمون ' جدید اردو شاعری میں فیضؔ کا مقام ' میں پروفیسر عبدالمغنی نے فیض کو شیلیؔ سے بہت زیادہ قریب بتایا ہے لکھتے ہیں :-

" اردو شاعری میں فیض احمد فیضؔ کی ادبی شخصیت شیلیؔ سے بہت زیادہ مشابہ ہے"[2]

ان نامور نقادوں کی آراء کے بعد ہم یہ آسانی کہہ سکتے ہیں کہ فیضؔ

۱؎	فن اور شخصیت	فیض نمبر	صفحہ ۱۰۹
۲؎	فن اور شخصیت	فیض نمبر	صفحہ ۳۳۵

نے یقیناً مغربی شعراء کے اثرات قبول کئے مغرب کی پذیرائی اور مشرقی روایات
نے ان کے کلام میں بڑی تہہ داری اور معنوی وسعت پیدا کر دی جس کی
وجہ سے ان کا کلام رومان و انقلاب کا بامعنی اور بصیرت افروز مرقع
نظر آتا ہے ۔

بابِ ششم

شعری مجموعوں کا نقد و تبصرہ

نقش فریادی

فیض احمد فیض کا پہلا شعری مجموعہ "نقش فریادی" کے نام سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا۔ جو ان کی غزلوں، نظموں، قطعات وغیرہ پر مشتمل ہے۔ ہمیں اپنے موضوع کے مطابق صرف غزلوں کا جائزہ لینا ہے۔

محقق کو سب سے پہلے جس دشواری کا سامنا ہوتا ہے وہ ہے غزلوں کی تعداد میں اختلاف جیسا کہ "فن اور شخصیت" کے فیض نمبر ۱۹۸۱ء میں پروفیسر مجتبیٰ حسین نے اپنے مقالے "نقش فریادی کی غزلیں" میں غزلوں کی تعداد تیرہ بتائی ہے اور "اشاریہ کلام فیض" ۱۹۷۸ء ڈاکٹر معین الدین عقیل نے صرف چودہ کی تعداد دی ہے۔ اور ہم نے کلیات فیض پردیپ بک ڈپو دلّی، اور نقش فریادی کے پاکستانی ایڈیشن ۱۹۸۲ء اور ورق ورق مرتبہ کرشن کانت آزاد بک ڈپو امرتسر اور نسخہ ہائے وفا فیض احمد فیض مکتبۂ کارواں کچہری روڈ، لاہور کی مدد سے کل اٹھارہ ۱۸ غزلیں منتخب کی ہیں۔ یہ اختلاف اس لیے پیدا ہوا کہ فیض کی غزلوں پر نظموں کے مثل عنوانات دیئے ہیں اس لیے جن لوگوں نے سرسری نظر سے اعداد شمار کئے ہیں ان سے تسامح ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر آپ "انجام" "بعد از وقت"۔ "اشعار" "سرود"

"مرگ سوز محبت" کو ہی لیجئے بظاہر نظم کے عنوانات معلوم ہوتے ہیں حالانکہ شعری ہیئت غزل کی ہے۔

نقشِ فریادی کی غزلوں کی فہرست حسب ذیل ہے اس طرح غزلوں کی تعداد اٹھارہ ۱۸ اور اشعار کی تعداد ۱۰۱ ہوتی ہے۔

نمبر شمار (۱)	ردیف (۲)	غزل کا پہلا مصرعہ (۳)	تعداد اشعار (۴)	(۵)
(۱)	ز	حسن مرہون جوش بادۂ ناز	۷	
(۲)	ں	ہیں لبریز آہوں سے ٹھنڈی ہوائیں	۵	انجام
(۳)	ں	عشق منت کشِ قرار نہیں	۷	
(۴)	ے	ہر حقیقت مجاز ہو جائے	۶	
(۵)	ا	دل کو احساس سے دوچار نہ کر دینا تھا	۵	لعد از وقت
(۶)	ے	وہ عہد غم کی کاہشہائے بے حاصل کو کیا سمجھے	۵	اشعار
(۷)	ا	موت اپنی، نہ عمل اپنا، نہ جینا اپنا	۵	سرود
(۸)	ی	ہمت التجا نہیں باقی	۵	
(۹)	ے	چشم میگوں ذرا ادھر کر دے	۶	
(۱۰)	ے	دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے	۵	

(١)	(٢)	(٣)	(٤)	(۵)
(١١)	ن	وفائے وعدہ نہیں وعدۂ دگر بھی نہیں	۵	
(١٢)	ا	رازِ الفت چھپا کے دیکھ لیا	۵	
(١٣)	ے	کچھ دن سے انتظارِ سوالِ دگر میں ہے	۴	
(١۴)	ے	پھر حریفِ بہار ہو بیٹھے	٦	
(١۵)	م	آؤ کہ مرگِ سوزِ محبت منائیں ہم	٧	مرگِ سوزِ محبت
(١٦)	ے	پھر لوٹا ہے خورشیدِ جہاں تاب سفر سے	٦	
(١٧)	ی	کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسنِ دوعالم سے	٦	
(١٨)	ں	نصیب آزمانے کے دن آ رہے ہیں	٦	
			١٠١	

نقشِ فریادی کا مجموعہ مختصر سہی دو حصوں پر مشتمل ہے اور ان دونوں حصوں کی شاعرانہ تخلیقات میں قاری کو ایک فرق سا نظر آئے گا۔ اس لیے اظہارِ خیال سے پیشتر اس پس منظر کو سامنے لانا ہوگا جس وقفے کی یہ تخلیقات ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ مولانا حالی نے سب سے پہلے تغزل کے روایتی حسن اور عشق و عاشقی کے تصورات کے خلاف آواز اٹھائی اور اسے قومی شعور اور ملی درد سے آشنا کیا۔ آج مولانا حالی کی غزلوں کی کوئی اہمیت

ہو یا نہ ہو لیکن وہ اس بناء پر اہم سے اہم تر معلوم ہوتی ہیں کہ ان کی بدولت اردو غزل بے مقصد ماورائیت سے نکل کر پہلے پہل مقصد پسندی اور افادیت کی طرف مائل ہوئی۔ چنانچہ علامہ اقبال نے اس روش کو نہ صرف پسند کیا بلکہ اسی کے ذریعے سے قوم کے نام پیغام پہنچایا اور ملّی فلسفے کی ترسیل کی۔ یہاں تک کہ ترقی پسند شعراء نے بھی اسی مقصدیت اور افادی پہلو پر زیادہ زور دیا۔ فیض احمد فیض بھی اسی روش کے پابند نظر آتے ہیں۔

فیض نے زمانۂ طالب علمی سے ہی شاعری شروع کردی تھی اور نقشِ فریادی کے پہلے حصّے کے کلام کے بارے میں وہ خود رقم طراز ہیں:-

"شعر گوئی کا کوئی واحد عذر گناہ تو ہمیں معلوم نہیں لیکن اس میں بچپن کی فضا گرد و پیش کا چرچا دوست احباب کی ترغیب اور دل کی لگی سبھی کچھ شامل ہے یہ نقشِ فریادی کے پہلے حصّے کی بات ہے۔ ۱۹۲۷ء ۱۹۲۹ء سے ۳۴۔۱۹۳۵ء تک کی تحریریں شامل ہیں، جو ہماری طالب علمی کے دن تھے یوں تو ان سب اشعار کا قریب قریب ایک ہی ذہنی اور جذباتی واردات سے تعلق ہے اور اس واردات کا ظاہری محرک تو وہی ایک حادثہ ہے جو اس عمر میں اکثر نوجوان دلوں پر گزر جایا کرتا ہے۔"[1]

---

[1] نسخہ ہائے وفا — دستِ تہِ سنگ — صفحہ ۳۰۷

اور "حادثہ" کی پوری تفصیل اپنے ایک مقالہ بعنوان "معتدل گرمیٔ گفتار کا غزل گو فیض" میں سلیم اختر نے اس طرح دی ہے کہ اس حادثے کی یادگار ایک نظم "نذر" (مطبوعہ راوی ۱۹۳۲ء) میں ملتی ہے اور یہ نظم نقش فریادی میں شامل نہیں ہے اس لئے تاریخی دلچسپی اور ریکارڈ کے لئے درج کی جاتی ہے[۱]...

طرب زارِ تخیل شوق، رنگین کار کی دنیا
مرے افکار کی جنت مرے اشعار کی دنیا
شبِ مہتاب کی سحر آفریں مدہوش موسیقی
تمہاری دل نشیں آواز میں آرام کرتی ہے
بہار آغوش میں مہکی ہوئی رنگینیاں لے کر
تمہارے خندۂ گل ریز کو بدنام کرتی ہے
تمہاری ہر نظر سے سینکڑوں ساغر چھلکتے ہیں
تمہارا دل حسیں جذبوں سے یوں آباد ہو گویا
شفق زارِ جوانی میں فرشتے رقص کرتے ہیں
جہانِ آرزو پر بے رُخی دیکھی نہیں جاتی

اور آگے چل کر انھوں نے جو اشعار پیش کئے ہیں ان سے اندازہ

۱؎ فیض احمد فیض: عکس اور جہتیں مرتبہ شاہد ماہلی صفحہ ۲۴۱

ہوتا ہے کہ فیض احمد فیض رومانیت کے دلدادہ رہے۔

خود انھوں نے نقشِ فریادی کے پہلے ایڈیشن میں بطور انکسار تحریر کیا ہے اور یہ واقعہ ۱۹۴۱ء سے پہلے کا معلوم ہوتا ہے۔

"...... آج سے کچھ برس پہلے ایک معین جذبے کے زیر اثر اشعار خود بخود وارد ہوتے تھے، لیکن اب مضامین کے لئے تجسس کرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں ان نوجوانی کے تجربات کی جڑیں بہت گہری نہیں ہوتی ہیں ہر تجربہ زندگی کے بقیہ نظام سے الگ کیا جا سکتا ہے اور ایک کیمیاوی مرکب کی طرح اس کی ہیئت مطالعہ کی جا سکتی ہے اس منفرد اور معین تجربے کے لئے کوئی موزوں پیرایۂ بیان اختیار کر لینا بھی آسان ہے لیکن اب یہ تمام عمل مشکل بھی دکھائی دیتا ہے اور بیکار بھی۔ اوّل تو تجربات ایسے خلط ملط ہو گئے ہیں ...... اور ان کی پیچیدگی (کے تحت) ان کو دیانت داری سے ادا کرنے کے لئے کوئی تسلی بخش پیرایۂ بیان نہیں ملتا[۱] ......"

غالباً "ایک معین جذبہ" ہوگا جس کا ذکر ہو چکا ہے اور نوجوانی کے تجربات

سلہ شبستان دہلی فیض نمبر صفحہ ١٦٢

بھی کچھ کھوکھلے سے نظر آنے لگتے ہیں۔ جو کچھ بھی ہو اس سے ضرور ثابت ہوتا ہے کہ میر تقی میر کے مثل فیض احمد فیض کو عشق میں جو ناکامی ہوئی اس نے انھیں زخم خوردہ بنا دیا اور ایسا کہ ساری عمر اس کی کسک باقی رہی۔

اس دیباچے میں انھوں نے صرف نقش فریادی کی نظموں کو پیشِ نظر رکھا ہے اور غزلوں کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ اسی سلسلے میں انھوں نے اندازِ ترسیل کی ہیئت کے بارے میں اس طرح اشارہ کیا ہے:

"......ان نظموں میں میں نے روایتی اسالیب سے غیر ضروری انحراف مناسب نہیں سمجھا۔ بحور میں کہیں کہیں بہت ہلکا سا تصرف ہے اور قوافی میں دو ایک جگہ صوتی مناسبت کو لفظی صحت پر ترجیح دی گئی ہے۔"[1]

غزلوں میں روایتی اندازِ ترسیل ہی کو اختیار کیا ہے البتہ ایک غزل ایسی ضرور ملتی ہے جس کا ذکر ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ جس میں صوتی مناسبت کو لفظی صحت پر ترجیح دی گئی ہے اور یہ غزل نقش فریادی میں شامل نہیں[2] ہے۔

شباب کو مئے الفت کی احتیاج سہی
بساطِ دہر پہ جور و ستم کا راج سہی

---

[1] شبستاں دہلی — فیض نمبر — صفحہ ۱۶۲
[2] خونِ دل کی کشید — مرتبہ مرزا ظفر الحسن — صفحہ ۱۲۵

یہ مانا نگہہ طلب سرفرازِ دہر نہیں
اک آرزو ہے سو شرمندۂ امید نہیں
ٹھہر ٹھہر دلِ بے تاب آخرش کب تک
کبھی تو سوختہ جانوں کو نیند آئے گی

اس میں "سہی" "نہیں اور" "آئے گی" (پنجابی صوتی لہجے میں آگے گی کے پیشِ نظر) قوافی بنائے گئے ہیں یہ وہ وقفہ ہے جب ان کے مزاج پر رومانیت اور عادات و اطوار پر بورژوا ہیئت کی چھاپ تھی۔ ان کے والد محترم ایک کامیاب بیرسٹر تھے اور ان کی پرورش اسی ماحول میں ہوتی رہی صاف ظاہر ہے جب مزاج اور زندگی کے ماحول میں مغایرت ہو تو وہ انسان کو مکمل انقلابی ہونے سے روکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نقشِ فریادی کے پہلے حصے کی غزلوں اور دوسرے حصے کی غزلوں میں ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ پہلے حصے کی غزلیں نہ صرف ہیئت، اندازِ ترسیل اور جذبات کے لحاظ سے روایتی غزل کی ہم نوائی کرتی ہیں بلکہ عشق، حسن، محبوب کی تغافل شعاری، فراق، سوزشِ دل انتظار، یاد، بے کسی، بے لبسی، جور و ستم، محبوبانہ ادائیں، تبسم رخسار و لب، چہرہ، رقیب، چاک دامنی، گریبان اور رہگزر وغیرہ ان سبھی چیزوں کی عکاسی کرتی ہیں۔

اسی ضمن میں اگر کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ فیض نے اپنے عنفوان

شباب میں سودا، غالب، مومن اور بہت سے شاعروں کے دواوین کا مطالعہ بڑے ذوق و شوق سے کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں کے بعض اشعار ان شاعروں کے اشعار کی یاد دلا دیتے ہیں مثلاً یہ شعر لیجئے۔

یہاں وابستگی، واں برہمی، کیا جانئے کیوں ہے؟ نہ ہم اپنی نظر سمجھے نہ ہم ان کی ادا سمجھے۔

تو ہے اور اک تغافل پیہم
میں ہوں اور انتظار بے انداز
نہ گئی تیرے بے رخی نہ گئی
ہم تری آرزو بھی کھو بیٹھے

اور غالب فرماتے ہیں:۔

ہم ہیں مشتاق اور وہ بے زار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

محبوب کی تغافل شعاری کا جذبہ دونوں میں موجود ہے صرف الفاظ کا فرق ہے۔

منت چارہ ساز کون کرے
درد جب جاں نواز ہو جائے

اور مرزا غالب فرماتے ہیں :

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
وہ مرے ہو کے بھی مرے نہ ہوئے
ان کو اپنا بنا کے دیکھ لیا

اور

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

'نذر' اور معصوم قاتل کا شاعر جو زخم خوردہ اور اپنی محبت میں ناکام رہا ہے صاف ظاہر ہے اس کے کلام میں یاس و حسرت سوز و گداز کے سوا اور کیا مل سکتا ہے ۔ چند اشعار پڑھیے ۔

فیضِ تکمیلِ غم بھی ہو نہ سکی
عشق کو آزما کے دیکھ لیا

وفائے وعدہ نہیں، وعدۂ دگر بھی نہیں
وہ مجھ سے روٹھے تو تھے، لیکن اس قدر بھی نہیں

نہ جانے کس لئے امیدوار بیٹھا ہوں
اک ایسی راہ پہ جو تیری رہگذر بھی نہیں

جوشِ وحشت ہے تشنہ کام ابھی
چاکِ دامن کو تا جگر کر دے

اک تری دید چھن گئی مجھ سے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں باقی
اپنی مشقِ ستم سے ہاتھ نہ کھینچ
میں نہیں یا وفا نہیں باقی

اس مایوسی، ناکامی اور بے بسی کے باوجود فیضؔ امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور اسی امید پر وہ فرماتے ہیں۔

ناخدا دور، ہوا تیز، قریں کامِ نہنگ
وقت ہے پھینک دے لہروں میں سفینہ اپنا
عرصۂ دہر کے ہنگامے تہِ خواب سہی
گرم رکھ آتشِ پیکار سے سینہ اپنا

اور یہیں سے وہ اپنی انفرادی شخصیت کے مالک نظر آنے لگتے ہیں اور ان کی شاعری ایک نیا موڑ لیتی ہے جسکی بنا پر وہ خود کہہ اٹھتے ہیں۔

ع مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

اس نظم سے ہی ان کی شاعری کا رنگ اور آہنگ بھی بدلنے لگتا ہے اور روحانیت اور عشقیہ شاعری کے دائرے سے نکل کر پکار اٹھتے ہیں۔ "اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا"

نقش فریادی کی اشاعت خواہ ۱۹۳۹ء میں ہوئی ہو[1] - یا ۱۹۴۱ء میں بہر[2] حال ابتدائی کلام خصوصاً غزل میں اور نقش فریادی کے دوسرے حصے کی غزلوں میں ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ایم۔ اے۔ او۔ کالج امرتسر میں ملازمت کے دوران جناب محمود الظفر اور اس سے زیادہ ان کی بیگم محترمہ ڈاکٹر رشیدہ جہاں کی فیض صحبت نے فیض احمد فیض کے شاعرانہ رجحانات میں خاصا تغیر برپا کر دیا ۱۹۳۶ء میں پنجاب میں مذکورہ بالا حضرات اور سجاد ظہیر وغیرہ کی کوششوں سے ترقی پسند مصنفین کی انجمن بنی جس نے فیض کو کافی حد تک متاثر کیا اس پر تفصیلی گفتگو پہلے کی جا چکی ہے۔

سچ پوچھئے تو یہ وہ وقت تھا جب نیا شعری اور ادبی ماحول قدیم ماحول سے بہت کچھ انحراف پذیر تھا۔ نئی نسل نہ صرف سرمایہ دارانہ استحصال اور جاگیردارانہ وقار کو نفرت کی نظروں سے دیکھنے لگی تھی بلکہ مذہبی روایات

---

[1] فیض احمد فیض   کے کے کھلر ، فیض نامہ   صفحہ ۱۳۴

[2] عام روایات

اخلاقی اقدار اور ادب کے قدیم انداز ترسیل سے بھی بیزار نظر آنے لگی تھی۔ صاف ظاہر ہے کہ فیضؔ کا بھی ان جذبات اور تصورات سے متاثر ہونا بالکل فطری تھا۔ لیکن فیضؔ ترقی پسندانہ رجحانات کی انتہا پسندی سے ہمیشہ الگ نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں اور نظموں میں نئی اور پرانی قدروں کی باہمی آویزش کے بحرانی دور میں بھی سلامت روی اور اعتدال پسندی پائی جاتی ہے۔

فیضؔ کی غزلیں نہ صرف ان کی ذات کی ترجمان ہیں بلکہ اس زمانے اور ماحول کی بھی ترجمان ہیں جس میں فیضؔ سانس لے رہے تھے۔

نقشِ فریادی کے دوسرے حصے کی غزلوں اور نظموں میں سماج کے پست طبقے خصوصاً کسان مزدور اور دستکار کی زندگیوں سے ہمدردی دا عوت پیدا ہوتی نظر آتی ہے۔ لیکن انھوں نے اشتراک پسندی شاعروں کے مثل سحر انقلاب، سُرخ سویرا وغیرہ کے الفاظ استعمال نہیں کئے اور نہ انھوں نے مزدوروں اور کسانوں کو اس طرح مخاطب کیا۔

جاگو اے مزدور کسانو

اٹھو اے مظلوم انسانو

یوں کہنے کو تو فیضؔ نے کہہ دیا۔

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

لیکن فیض فطری طور پر حسن و عشق اور رومان پرور شاعر تھے۔ چنانچہ اس مجموعے کے ابتدائی دور میں عموماً رومانی جذبات پائے جاتے ہیں یہی نظم 'مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ' میں وہ محبوب کے دیدار کو بہاروں کا ثبات سمجھ رہے ہیں اور محبوب کی آنکھوں کے سوا انھیں دنیا میں کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا یہاں تک فرما دیتے ہیں۔

تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے

یہی وہ وقت ہے جب انھوں نے نظموں پر غزل کا سوز و گداز یاس و حرمان اور غزلوں پر نظم کی چھاپ لگا دی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بعض غزلوں پر نظم کا دھوکا ہونے لگتا ہے اور اس پر نظم کا عنوان دے دیا گیا ہے مثلاً 'مرگ سوز محبت' 'بعد از وقت' 'اشعار' وغیرہ غزلیں ہیں لیکن عنوان ہونے کی وجہ سے اعداد شمار میں ان سے انحراف کیا گیا ہے۔

ان کی نظم 'رقیب سے' میں ابتدائی اٹھارہ مصرعے بالکل غزل کے رنگ میں ہیں اور وہ رقیب کو یاد دلاتے ہیں جو ان کی محبت کو جانتا ہے کہتے ہیں۔

آشنا ہیں ترے قدموں سے وہ راہیں جن پر
اس کی مدہوش جوانی نے عنایت کی ہے
تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی و رخسار وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے

تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

ان یادوں کے ساتھ ساتھ فیض نے

ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب
بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے

اور فیض کے دل پر گہری خاموشی سے یہ تاثر ہوتا ہے

آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

وہ کسانوں کی زبوں حالی اور شکستہ دلی کی ترجمانی اس طرح کرتے ہیں۔

یہ حسین کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
کس لیے ان میں فقط بھوک اگا کرتی ہے

مختصر یہ کہ نقشِ فریادی کی شاعری رومان اور حقیقت کا ایک بڑا حسین امتزاج ہے۔

اسی روشنی میں نقشِ فریادی کی اہم غزلوں کا تجزیہ قدرے تفصیل سے ملاحظہ فرمائیے۔

جس وقت فیض نے شاعری شروع کی عام طور سے اقبال کی شاعری اور مشرق و مغرب اسلوب کا چرچا تھا۔ ظاہر سی بات ہے کہ اقبال کا سا انداز لانا بہت ہی دشوار گزار تھا لہٰذا انھوں نے اپنی شاعری کو غزل کے عام موضوعات تک ہی محدود رکھا اور صرف معاملاتِ حسن و عشق اور واردات قلب کی ترجمانی کرتے رہے۔ اس کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ شروع میں محض ایک روایتی غزل گو رہے۔ ان کے ابتدائی کلام میں ہی فنی پختگی کے عناصر صاف نمایاں ہیں بعض ناقدین کے یہاں فنی پختگی کی کوئی اہمیت نہیں اور خاص طور سے فیض پر یہ بات صادق بھی آتی ہے کہ انھیں جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ فنی پختگی کی بدولت نہیں۔ بلکہ یہ خصوصیت اس درجہ اہم ہے کہ اس نے ابتدائی غزلوں میں میں فنی نکھار پیدا کرنے کے بعد انھیں ایک منفرد رنگ عطا کیا جس کی بنا پر ان کی شخصیت ایک انفرادی شاعر کی حیثیت سے وجود میں آئی یہ ان کی انفرادیت ہی ہے جس نے انھیں کم غزل کہنے کے باوجود بھی صف اوّل کے غزل گو شعراء میں ممتاز مقام عطا کیا۔ اپنے مخصوص اسلوب اور طرز ادا کی بنا پر انھوں نے غزل کے مضامین میں اضافہ کیا لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمیں

یہ کہنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ ان کی غزلیں ترقی پسندانہ مزاج سے کافی حد تک عاری ہیں اسے خوبی اور خامی دونوں پر محمول کہا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں فیض کا مندرجہ شعر خود ان کے خیالات کے تشریح کے لیے کافی ہے۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

دوسرے مصرعے میں خونِ دل میں انگلیاں ڈبونے کی ترکیب اور بندش نے شعر کو کس بلندی پر پہنچا دیا۔ شاید ہی کسی شاعر نے یہ ترکیب عشق کے اظہار کے لیے بیان کیا ہو۔ اس سے فیض کی ندرتِ بیان کا اندازہ صاف ہو جاتا ہے۔ غالباً یہی اسباب ہیں جن کی بنا پر فیض کی شخصیت میں انفرادیت غالب آتی گئی۔

فیض کی غزلوں میں کلاسیکی اسلوب نمایاں ہے۔ فارسی تراکیب کے جا بجا استعمال نے ان کی غزلوں کے حسن کو دوبالا کر دیا وہ ان تراکیب کو اس چابکدستی سے استعمال کرتے ہیں کہ قاری کے ذہن پر کسی بھی طرح کا بوجھ نہیں آنے پاتا۔

؎ حسن مرہونِ جوشش بادۂ ناز
عشق منت کشِ فسونِ نیاز

اسی غزل میں آگے لکھتے ہیں۔

دل کا ہر تار لرزشِ پیہم
جاں کا ہر رشتہ وقفِ سوز گداز

خوفِ ناکامی امید ہے فیض
ورنہ دل توڑ دے طلسمِ مجاز

مندرجہ بالا اشعار کی تراکیب سے صاف ظاہر ہے کہ وہ کلاسیکی اسلوب کے از حد درجہ دلدادہ تھے اور انھیں اس کے بیان پر قدرت کاملہ حاصل تھی۔ ان کی تراکیب ہمیں یہ کہنے پر مجبور کرتی ہیں کہ فارسی تراکیب اور تخیل اور تاثر کی ہم آہنگی میں انھوں نے غالب اور اقبال کی پیروی کی ہے کیونکہ غالب اور اقبال کی طرح فیض کی غزلوں میں بھی تخیل کے ساتھ ساتھ تاثر بھی بھرپور طرح کار فرما نظر آتا ہے۔

ان غزلوں میں انھوں نے غزل کے عام موضوعات کو قلم بند کیا ہے۔ ایک روایتی غزل گو کی طرح معاملاتِ حسن وعشق اور کیفیاتِ قلب کی ترجمانی اس طرح کرتے ہیں گویا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی غزلیں ذات کے اظہار حسن وعشق اور دل کی دنیا کے لیے مخصوص ہیں ان غزلوں میں سادگی، بانکپن اور تیکھا انداز نمایاں ہے۔ اگرچہ اتنی فکری پختگی اور گہرائی ~~اور گہرائی~~ نہیں جو بعد کی غزلوں میں پائی جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی ان میں بلا کی کشش اور

؎ نسخہ ہائے وفا نقشِ فریادی صفحہ ۱۰

جاذبیت موجود ہے۔ بقول جمیل جالبی۔

"ان سیدھی سادی باتوں میں وہ عالمگیر حقیقت
اور وسعتیں پنہاں ہوتی ہیں کہ بے اختیار داد دینے
کو جی چاہتا ہے"[1]

فیض کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

سوزشِ دردِ دل کسے معلوم
کون جانے کسی کے عشق کا راز[2]

زیرِ لب ہے ابھی تبسم دوست
منتشر جلوۂ بہار نہیں[3]

فریبِ آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی
ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آوازِ پا سمجھے[4]

۱؎	فیض ایک جائزہ	اشفاق حسین	صفحہ ۱۲۸
۲؎	نسخہ ہائے وفا	نقش فریادی	صفحہ ۱۰
۳؎	نسخہ ہائے وفا	نقش فریادی	صفحہ ۱۸
۴؎	نسخہ ہائے وفا	نقش فریادی	صفحہ ۲۸

ان اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ غزلیں حقیقت میں عشق و عاشقی کی صحیح ترجمانی کرتی ہے۔ ہر جگہ غم کا عنصر غالب ہے۔ غم عشق ہو یا غم سیاست یا غم روزگار ان کے یہاں ہر چیز غم بن جاتی ہے۔ لیکن اسے اپنے لہجے کی استقامت اور پامردی سے خوش گوار بنا دیتے ہیں۔ یہی سوز و گداز اور رنج و الم ان کی غزلوں میں ایک خاص قسم کی نشاط افزا کیفیت پیدا کرتے ہیں۔

اختصار کے ساتھ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ غزلوں میں خالص عشقیہ جذبات کی عکاسی کرتے ہیں کہیں بھی اپنے ترقی پسندانہ جذبات و خیالات کو شامل نہیں ہونے دیتے جیسا کہ انھوں نے خود نقش فریادی کے شروع میں ہی عرفی کا یہ شعر نقل کیا ہے۔

ؔ ہر دا اے عقل و منہ منطق و حکمت در پیش
کہ مرا نسخۂ غمہائے فلاں در پیش است

لیکن کسے معلوم تھا کہ ایک روایتی غزلگو جس نے اپنی پہلی غزل میں کہا ہو کہ :

ؔ دل کا ہر تار لرزشِ پیہم
جاں کا ہر رشتہ وقفِ سوز و گداز[1]

---

[1] نسخہ ہائے وفا نقش فریادی صفحہ ۱۰

اور اپنے کلام کو جان و دل سوز و گداز اور عشق و عاشقی کے لیے وقف کر دیا ہو زیادہ دنوں تک اپنے کو اس سے منسلک نہ کر سکے گا اور رومانی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں قدم رکھتے ہی چیخ اٹھے گا۔

ؔ اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا[1]

اسی نظم کے بعد ہمیں فیضؔ کے کلام میں خاصا تغیر نظر آتا ہے۔ وہ اپنے ملک کی سیاسی کشمکش اور نظامِ حکومت سے عاجز آ کر سماجی اور سیاسی مسائل کو اپنے اشعار میں سمونے کی کوشش کرتے ہیں جسکی وجہ سے ان کا انداز بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن یہاں بھی ان کا بانکپن، تیکھا پن اور ان کا جراءت مندانہ لب و لہجہ کارفرما ہے کہتے ہیں۔

ؔ دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے[2]

اس تغیر کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ عشق و عاشقی کے مضامین میں گم

۱؎	نسخہ ہائے وفا	نقشِ فریادی	صفحہ ۵۳
۲؎	نسخہ ھائے وفا	نقشِ فریادی	صفحہ ۵۵

رہنے والا واردات قلب وجگر کی عکاسی کرنے والا فیض اپنے بصیرت افروز احساس خلوص اور فنکارانہ چابکدستی سے سماجی مسائل کو غزل میں کس دل کش اور دلفریب انداز میں پیش کرتا ہے۔ اس کی تصدیق خود ان کے ان اشعار سے ہوتی ہے۔ جیسے وہ مضامین عشق ہی مانتے ہیں :

؎ ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غم الفت کے
اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں

ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے
جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں[۱]

فیضانِ عشق کی صحیح ترجمانی کس سادگی اور بلاغت سے پیش کرتے ہیں :۔

؎ عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس وحرمان کے، دکھ درد کے معنی سیکھے

زیردستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے، رُخِ زرد کے معنی سیکھے[۲]

؎۱	نسخہ ھائے وفا	نقش فریادی	صفحہ ۶۱
؎۲	نسخہ ھائے وفا	نقش فریادی	صفحہ ۶۲

پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے غزل کو اپنی فکر کا محور بنایا اور غزل میں علامتی اسلوب اور اشارتی مزاج، عصری سیاست اور تمدنی و تاریخی مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنی فکر اور شاعری کو پروان چڑھایا۔ نقشِ فریادی کے دوسرے دور کی غزلیں آہنگ، آواز اور لہجہ کی کئی کیفیتوں سے لبریز نظر آتی ہے۔

جس کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ نقشِ فریادی کی غزلیں رومان پرستی اور حقیقت پسندی کا ایک دل کش اور حسین مرقع ہیں۔ انھوں نے ان غزلوں میں پرانی علامتوں، تشبیہات استعارات اور کنایات کو جدید انداز میں پیش کیا ہے۔ بہت سی تراکیب اور اصطلاحات ایک خاص انداز میں پیش کی گئی ہیں۔ تلمیح تو ان کی غزلوں کی جان ہے ان تمام شعری، لغوی اور معنوی امتزاج کے ساتھ جس انداز میں فیض نے اپنی غزلوں میں تمدن ثقافت اور سیاسی مسائل کا ذکر کیا ہے حقیقت میں یہ انھیں کا حصہ ہے جو آج تک نہ دیکھا گیا اور نہ سنا گیا۔ ثبوت کے طور پر ان کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں ملاحظہ فرمایئے۔

یہ عہدِ ترکِ محبت ہے کس لیے آخر
سکونِ قلب ادھر بھی نہیں اُدھر بھی نہیں[۱]

---

[۱] نسخہ ھائے وفا — نقشِ فریادی — صفحہ ۵۹

ماضی میں جو ہماری شام و سحر میں تھا
اب وہ فقط تصورِ شام و سحر میں ہے
کیا جانے کس کو کس سے ہے اب داد کی طلب
وہ غم جو میرے دل میں ہے تیری نظر میں ہے[1]

پھر لوٹا ہے خورشیدِ جہانتاب سفر سے
پھر نورِ سحر دست و گریباں ہے سحر سے
پھر آگ بھڑکنے لگی ہر سازِ طرب میں
پھر شعلے لپکنے لگے ہر دیدۂ تر سے
ساغر تو کھنکتے ہیں شراب آئے نہ آئے
بادل تو گرجتے ہیں گھٹا برسے نہ برسے
پاپوش کی کیا فکر ہے، دستار سنبھالو
پایاب ہے جو موج گزر جائے گی سر سے[2]

نصیب آزمانے کے دن آ رہے ہیں
قریب ان کے آنے کے دن آ رہے ہیں

---

[1] نسخہ ہائے وفا — نقشِ فریادی — صفحہ ۶۵
[2] نسخہ ہائے وفا — نقشِ فریادی — صفحہ ۷۵

جو دل سے کہا ہے، جو دل سے سُنا ہے
سب اُن کو سنانے کے دن آ رہے ہیں
صبا پھر ہمیں پوچھتی پھر رہی ہے
چمن کو سجانے کے دن آ رہے ہیں[1]

---

[1] نسخہ ھائے وفا — نقشِ فریادی — صفحہ ۸۲

دستِ صبا

فیض کا یہ دوسرا مجموعہ ہے جس کے سنہ اشاعت کے بارے میں عام روایات ۱۹۵۲ء ہے جیسا ان کے دو خطوط سے اندازہ ہوتا ہے خط نمبر ۶۵ مورخہ ۱۹ دسمبر ۱۹۵۲ء میں لکھتے ہیں۔

"........ اخباروں میں ہمارے شاہکار کا کوئی ذکر دیکھنے کا انتظار رہا لیکن ابھی تک کچھ نظر نہیں آیا امید ہے کہ اگلے خط میں تم کچھ بتا سکوگی اگر کتاب تیار ہے تو کچھ نسخے بھی بھجوا دوگی ......"[1]

اس خط سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹ دسمبر ۱۹۵۲ء تک مطبوعہ دست صبا فیض کے پاس نہیں پہنچی تھی۔

اسی طرح خط نمبر ۷۰ مورخہ ۱۲ جنوری ۱۹۵۳ء میں وہ لکھتے ہیں۔

"...... کل تمھیں تار بھیجا اس کے بعد ہی کتابیں پہنچ گئیں چھ عدد۔ اپنے جیل کی تخلیق دیکھ کر دل خوش ہوا۔ اس کی پیدائش میں بہت

---

[1] صلیبیں مرے دریچے میں فیض احمد فیض صفحہ ۱۲۸

سا دکھ شامل تھا اور بہت سی امید بھی"۔[1]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اواخر دسمبر ۱۹۵۲ء میں 'دست صبا' کی اشاعت ہو چکی تھی اور بہت ممکن ہے کہ اسی خط کو دیکھ کر بعض قلم کاروں کو یہ خیال ہوا ہو کہ 'دست صبا' کا سنہ اشاعت ۱۹۵۳ء ہے جو صحیح نہیں ہے۔ اور یہ بات اس سے زیادہ ثابت ہو جاتی ہے کہ کتابوں کے پہنچنے سے پہلے خط نمبر ۶۸ مورخہ ۲ جنوری ۱۹۵۳ء صفحہ ۱۳۱ پر وہ خود لکھتے ہیں۔

"سہ پہر دست صبا کی تقریب منانے کے لئے
(کتاب ابھی تک ہم نے نہیں دیکھی) ساتھیوں نے میری
چائے کی دعوت کی (پھولوں کے ہار وغیرہ وغیرہ سمیت)
کتنی اچھی اور پیاری بات تھی"۔[2]

دست صبا میں زیادہ تر ایسی غزلیں اور نظمیں وغیرہ ہیں جو مارچ ۱۹۵۱ء سے سرگودھا، لائل پور، لاہور اور حیدرآباد سندھ کے جیلوں میں نظم ہوئی ہیں ان کی فہرست حسب ذیل ہے۔

---

[1] صلیبیں مرے دریچے میں فیض احمد فیض صفحہ ۱۳۴

[2] صلیبیں مرے دریچے میں فیض احمد فیض صفحہ ۱۳۱

نمبر شمار (۱)	غزل کا پہلا مصرع (۲)	ردیف (۳)	تعداد اشعار (۴)
(۱)	کبھی کبھی یاد میں ابھرتے ہیں نقشِ ماضی مٹے مٹے سے	ے	۵
(۲)	ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے	ے	۷
×(۳)	روشن روشن ہے وہی انتظار کا موسم	م	۱۰
(۴)	تم آئے ہو، نہ شبِ انتظار گزری ہے	ے	۴
(۵)	تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں	ن	۶
(۶)	شفق کی راکھ میں جل بجھ گیا ستارۂ شام	ے	۴
(۷)	عجزِ اہلِ ستم کی بات کرو	و	۷
(۸)	فکرِ دلداریٔ گلزار کروں یا نہ کروں	ن	۷
(۹)	گرانیٔ شبِ ہجراں دوچند کیا کرتے	ے	۶
(۱۰)	وہیں ہے دل کے قرائن تمام کہتے ہیں	ن	۷
(۱۱)	رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام	م	۸
(۱۲)	دل میں اب یوں ترے بھولے ہوئے غم آتے ہیں	ن	۵
×(۱۳)	روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں	ن	۷ اگست ۱۹۵۲ء مکمل
(۱۴)	اب وہی حرفِ جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے	ے	۹
(۱۵)	آئے کچھ ابر کچھ شراب آئے	ے	۹

(۱)	(۲)	(۳)	(۴)
(۱۶)	کسی گماں پہ توقع زیادہ رکھتے ہیں	ن	۶
(۱۷)	تیری صورت جو دلنشیں کی ہے	ے	۸
(۱۸)	یادِ غزال چشماں، ذکرِ سمن عذاراں	ن	۸
(۱۹)	قرضِ نگاہ یار ادا کر چکے ہیں ہم	م	۷
			۱۳۲

اشاریۂ کلام فیض میں دو غزلیں نہیں ہیں جن پر* نشان لگا ہے ڈاکٹر معین الدین عقیل نے ۱۷ غزلیں اور ۱۱۴ اشعار دئے ہیں ان دو غزلوں کی شمولیت سے ۱۹ غزلیں اور ۱۳۲ اشعار ہو جاتے ہیں۔

جیسا پہلے ذکر ہوا نقش فریادی کی اشاعت کے بعد نو دس سال کے عرصے میں فیض کے شاعرانہ رجحانات میں بہت کچھ تبدیلی آگئی تھی خصوصاً ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک کی شمولیت بہت کچھ اثر انداز ہوئی اور تخیل میں بہت کچھ وسعت پیدا ہوئی جسکو ہم "آفاقیت" سے منسوب کر سکتے ہیں دست صبا کی غزلوں کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعرانہ تخلیقات میں بہ لحاظ ہیئت اور موضوعاتی مواد اور انداز ترسیل میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی۔ ہیئت کی تبدیلی کے بارے میں خط نمبر ۴۴ مورخہ ۱۶ر جولائی ۱۹۵۲ء میں وہ خود تحریر فرماتے ہیں۔

"اس ہفتے میں نے ایران اور مصر کے شہید طلبہ
پر ایک نظم شروع کی ہے۔ جیل میں آنے کے بعد پہلی
دفعہ اپنی کسی تخلیق سے کچھ اطمینان ہوا ہے۔ میں
سمجھتا ہوں کہ اظہار کی جس ہئیت اور پیرائے کی تلاش
تھی اس نظم میں پہلی بار ہاتھ آئے ہیں۔ یہ بالکل خلاف
روایت انداز ہے جس سے پرانے اساتذہ ضرور خفا ہوں گے
لیکن اس کی پرواہ کون کرتا ہے امید ہے کہ اگلے ہفتے تک
مکمل کر کے تمھیں بھیج سکوں گا"۔

اس کے باوجود ہئیت اور انداز ترسیل کے بارے میں ان کا جھکاؤ کلاسیکی روایات کی جانب برقرار رہا اور اس ضمن میں ریاض صدیقی تحریر فرماتے ہیں۔

"(۱) ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
(۲) جو دل پہ گذرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

اس شعر میں مرزا غالب کے مضمون کا اتباع ہوا ہے یہ علیحدہ بات ہے کہ فیض مرزا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر قوت اظہار، جذبے کے ارتکاز اور تاثر کی کاٹ کا مقابلہ نہیں کر سکے ہیں۔ آہنگ اور تاثر میں قوی حرکت اس صورت میں یقیناً زیادہ ہو جاتی ہے اگر فیض مصرعوں کی ترتیب کو اس طرح متعین کرتے ۔

(۱) جو دل پہ گذرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

(۲) ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے[1]"

غالب کا شعر ہے

؎ لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں

ہرچند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

آگے چل کر موصوف یہ بھی تحریر فرماتے ہیں۔

"اظہار کے شعور جذبے کے ارتکاز اور تاثر کی کاٹ میں جو گراوٹ اس شعر میں (فیض کے) زیرِ بحث آیا ہے[2]"

ہمارے رائے ناقص میں ریاض صدیقی نے مصرعوں کی ترتیب میں جو الٹ پھیر کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ موصوف کی ترتیب کا پہلا مصرعہ غالب کے شعر کے پہلے مصرعے کی تقلید ہے اور پورا شعر غالب کے تصور سے مستعار ہے راقم السطور کی ناقص رائے ہے کہ جذبے کے ارتکاز اور تاثر میں کسی قسم کی گراوٹ پیدا نہیں ہوتی ہے خواہ فیض کے دونوں مصرعے اسی طرح رہنے دیئے جائیں۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی لکھتے ہیں

۱؎ فن اور شخصیت دست صبا کی غزلیں صفحہ ۲۵۱

۲؎ فن اور شخصیت دست صبا کی غزلیں صفحہ ۲۵۱

"دستِ صبا میں ایسی غزلیں کثرت سے ملتی ہیں
جو قوتِ اظہار، جذبے کی فراوانی، تاثیریت اور رنگ
و نور سے لبریز ہیں اور جہاں موضاعات و مضامین
کے نئے پن کے باوجود رچا ہوا کلاسیکی رنگ بھرا ہے۔"[1]

اسی سلسلے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی تحریر فرماتے ہیں۔

"غمِ حیات اور غمِ روزگار اور اس کی تفصیل و توضیح کے ساتھ ساتھ
'دستِ صبا' میں بعض ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں جن کا موضوع عشق
اور غمِ عشق ہے۔ لیکن ان میں بھی تصورات روایتی نہیں ہیں۔ ان
میں بھی ایک جدت ہے۔ ایک اچھوتا پن ہے۔ حسن و عشق کا کوئی
مجرد تصور ان میں موجود نہیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح زندگی کے
سماجی اور عمرانی پہلو سے وابستہ ضرور ہے۔"[2]

اور یہ رجحان ان کی غزلوں میں کہیں زیادہ پایا جاتا ہے۔

"جن موضوعات کو فیض نے نظموں میں سمویا ہے اور جس نئے
رجحانات کو ان میں نمایاں کیا ہے، ان سب کی روح غزلوں میں سمٹی ہوئی
نظر آتی ہے۔ گویا یہ غزلیں ان تمام افکار و خیالات اور جذبات و

۱؎	فن اور شخصیت	دستِ صبا کی غزلیں	صفحہ ۲۵۱
۲؎	جدید شاعری	ڈاکٹر عبادت بریلوی	صفحہ ۲۹۰

احساسات کا نچوڑ ہیں جن سے فیضؔ اور ان کی شاعری موجودہ دور میں دوچار ہیں۔ ان میں بھی حسن ہے۔ عشق ہے، اور ان کے مختلف معاملات وکیفیات ہیں۔ لیکن ان معاملات وکیفیات سے زیادہ ان میں حیات اور غم حیات ہے[1]"

اسی مضمون میں آگے ڈاکٹر موصوف یہ بھی لکھتے ہیں۔

"فیض نے اس سے قبل بہت اچھی غزلیں لکھی ہیں، (غالباً ان کی مراد نقش فریادی کی غزلوں سے ہے۔) لیکن ان میں غزل والی بات کم ہے اور نظموں کے مقابلے میں تو وہ پس منظر میں جا پڑتی ہیں[2]"

یہ خیال غالباً ان کو صرف اس لئے پیدا ہوا ہوگا کہ 'دست صبا' سے بیشتر والی غزلوں میں صرف رومان اور وہ بھی ذاتی ظاہر ہوتا ہے۔ ورنہ ان غزلوں میں وہ سوز وگداز اور دکھ درد پایا جاتا ہے جو غزل کے لوازمات میں ہے البتہ ان میں وہ غم روزگار کم نظر آتا ہے جو 'دست صبا' کی غزلوں میں ہے۔ دست صبا کی غزلوں میں ایک رچی ہوئی کیفیت اور ایک دل موہ لینے والی سحر کاری پائی جاتی ہے اور یہ شدت احساس کا نتیجہ ہے۔

۱؎	فیضؔ کی شاعری کا نیا دور	مرتبہ عبدالرؤف ملک	صفحہ ۶۲
۲؎	فیضؔ کی شاعری کا نیا دور	مرتبہ عبدالرؤف ملک	صفحہ ۶۳

عام طور پر غزل کا بنیادی موضوع حسن وعشق ہے اور عام طور پر غزل پر غزل گو شعراء صرف تخیل جذباتیت سے کام لیتے رہے ہیں (۳۱) کے برخلاف فیض نے اس موضوع کی بنیاد صرف جذباتیت پر نہیں رکھی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ آفاقی شعور بھی پیدا کیا۔ حسن وعشق کے مسائل کے ساتھ انسانی زندگی کے مسائل اور اس کی کشمکش احساس بھی نمایاں کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ حسن وعشق کی الجھنوں کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کی الجھنیں بھی شامل ہیں۔

دست صبا کی غزلوں میں مجرد حسن وعشق اور اس کے معاملات کو ہی صرف اہمیت نہیں ہے اور اس کی بنیاد صرف تخیلی جذباتیت پر نہیں ہے بلکہ ان غزلوں میں حقیقی جذبات کی ترجمانی پائی جاتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:۔

جنوں میں جتنی بھی گذری، بکار گذری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے
وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے
چمن پہ غارتِ گلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے[۱]

۱۔ نسخہ ہائے وفا   دست صبا   صفحہ ۳۶

درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیض دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں [1]

صبا نے پھر درِ زنداں پہ آکے دی دستک
سحر قریب ہے، دل سے کہو نہ گھبرائے [2]

یوں بہار آئی ہے امسال کہ گلشن میں صبا
پوچھتی ہے گزر اس بار کروں یا نہ کروں [3]

اس میں شک نہیں کہ احساس کی شدت غزل میں دل پر اثر کرنے والا سوز پیدا کرتی ہے۔ فانی کی غزلوں کی طرح سے فیض کے یہاں بھی ناکامی اور قنوطیت کا سوز پایا جاتا ہے۔ یہاں سوز میں ایک ولولہ ہے۔ ایک امنگ ہے اور ایک جوشِ آہنگ امید ان میں ذاتی غم اور دکھ درد کے ساتھ ساتھ ماحول کی ناسازگاری کا سوز بھی ہے۔ وہ ناسازگار ماحول کو سازگار بنانا چاہتے ہیں۔

---

[1] نسخہ ہائے وفا دستِ صبا صفحہ ۳۷
[2] نسخہ ہائے وفا دستِ صبا صفحہ ۳۹
[3] نسخہ ہائے وفا دستِ صبا صفحہ ۴۶

نقش فریادی کی غزلوں کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہے کہ فیض نے شاعری کی ابتداء عشقیہ موضوعات سے کی۔ محبت کی خار زار وادیوں سے گزرنے کے بعد ان کے احساسات اور جذبات نے ان کے شاعری کو ایک واضح اور منفرد رنگ عطا کیا۔ ان کا جذبۂ عشق مختلف کیفیات شلاً انتظار، وصل، فراق اور درد و غم پر مشتمل ہے جیسا کہ ان کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:۔

"شاید اردو نظم کے کسی شاعر نے محبت کے جذبے کو اتنی شدت اور خلوص کے ساتھ پیش نہیں کیا۔ جتنی شدت اور خلوص کے ساتھ فیض نے پیش کیا ہے[1]"۔

اسی روشنی میں جب ہم دست صبا کی غزلوں کا تجزیہ کرتے ہیں تو ان کی پہلی غزل ہی وزیر آغا کے مندرجہ بالا مقولہ کی تصدیق کرتی نظر آتی ہے۔

ع کبھی کبھی یاد میں ابھرتے ہیں نقش ماضی مٹے مٹے سے
وہ آزمائش دل و نظر کی، وہ قربتیں سی، وہ فاصلے سے
کبھی کبھی آرزو کے صحرا میں، آکے رکتے ہیں قافلے سے
وہ ساری باتیں لگاؤ کی سی، وہ سارے عنوان وصال کے سے

---

[1] نظم جدید کی کروٹیں ڈاکٹر وزیر آغا صفحہ ۷۰ ۱۹۷۶ء

نگاہ و دل کو قرار کیسا، نشاط و غم میں کمی کہاں کی
وہ جب ملے ہیں تو ان سے ہر بار کی ہے الفت نئے سرے سے

رمز و کنایہ اردو شاعری کا خاصہ رہا ہے جسکی وجہ سے غالب کو کہنا پڑا۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

فیض کی شاعری میں یہ خصوصیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ انھوں نے بدلتے ہوئے سماج اور انقلابی ماحول کی عکاسی عشقیہ انداز کی حسین امتزاج سے کی ہے۔ لوح و قلم میں کس لطیف پیرائے میں ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
ہاں تلخئ ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہل ستم، مشق ستم کرتے رہیں گے

ا۔ نسخہ ھائے وفا   دست صبا   صفحہ ۱۴

مے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخیٔ مے سے
تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے
اک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرضِ تمنّا ہے سو ہم کرتے رہیں گے [1]

"طوق و دار کا موسم" کے عنوان سے جو اشعار فیضؔ نے قلم بند کئے ہیں اگرچہ بعض ناقدین اسے نظم کا درجہ دیتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ شکل اور ہیئت کے اعتبار سے وہ غزل ہی ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر اشفاق حسین نے اسے غزل کی فہرست میں رکھا ہے۔ میں ان کی اس تحقیق سے متفق ہوں کیونکہ وہ ہیئت، اسلوب، ردیف اور قافیہ اور مضمون کے اعتبار سے غزل ہی ہے۔ اس میں فیضؔ نے اپنی ندرت انگیز فکر سے موسم "گردشِ ایام" کو قدیم شعراء جس زاویہ سے قلم بند کرتے ہیں اس سے الگ ہٹ کر نئی نسلوں کو نیا پیغام سنانے والا ٹھہرایا ہے چنانچہ کہتے ہیں۔

روش روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم، بہار کا موسم

---

[1] نسخہ ہائے وفا　　دستِ صبا　　صفحہ ۲۳-۲۴

گراں ہے دل پہ غمِ روزگار کا موسم
ہے آزمائشِ حسنِ نگار کا موسم
یہ دل کے داغ تو دکھتے تھے یوں بھی پر کم کم
کچھ اب کے اور ہے ہجرانِ یار کا موسم
یہی جنوں کا، یہی طوق و دار کا موسم
یہی ہے جبر، یہی اختیار کا موسم
قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم[1]

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ فیض کی غزلیں عشقیہ جذبات اور سیاسی اور انقلابی فکر رکھنے کے ساتھ ساتھ سوز گداز کی نمایاں تصویر بھی ہیں۔ جیسا کہ فراق گورکھپوری نے لکھا ہے۔

"حقیقی معنوں میں غزل کی شاعری وہ ہے جس سے ہمیں درد بھری اور آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی دل کی گہرائی سے نکلی ہوئی آواز سنائی دے غزل بغیر کسی ایسے واقعے کا ذکر کئے ہوئے جس میں ظاہری طور پر کوئی پُر درد بات کہی گئی ہو کم سے کم لفظوں میں، درد میں ڈوبی ہوئی بات

---

[1] نسخہ ہائے وفا دستِ صبا صفحہ ۳۱

سنائی ہے[1]"

فیض کی غزلیں اس مقولہ کی پوری طرح پاسبان نظر آتی ہیں کیونکہ ان کے یہاں سوز و گداز ایک عجیب کیف اور آہنگ کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں
حدیث یار کے عنواں نکھرنے لگتے ہیں
تو ہر حریم میں گیسو سنورنے لگتے ہیں
صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکر وطن
تو چشم صبح میں آنسو ابھرنے لگتے ہیں
وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں[2]

اسی کے ساتھ ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ جب وہ سوز و گداز اور داستانِ عشق کی عکاسی کرتے ہیں تو تراکیب استعارے اور تشبیہیں ایسی استعمال کرتے

---

[1] فراق گورکھپوری۔ غزل کیا ہے؟ صفحہ ۴ آج کل۔ دہلی فروری ۱۹۶۱ء

[2] نسخہ ہائے وفا دستِ صبا صفحہ ۳۷

ہیں جو قدیم شعراء نے کی ہیں۔ لیکن ان کا انداز ایسا نرالا رہتا ہے گویا پرانے ساغر میں نئی شراب ڈھال رہے ہوں۔ شاید اسی لیے ان کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا۔

" فیض نے ساری بات پرانی علامتوں کو نئے مفہوم میں استعمال کر کے قاری تک پہنچائی ہے۔ بہت کم ایسا ہوا کہ فیض نے نئی علامتیں بھی وضع کی ہوں[۱]

فیض کے چند اشعار اس ضمن میں ملاحظہ ہوں:۔

شفق کی راکھ میں جل بجھ گیا ستارۂ شام
شب فراق کے گیسو فضا میں لہرائے
کوئی پکارو کہ اک عمر ہونے آئی ہے
فلک کو قافلۂ روز و شام ٹھہرائے
صبا نے پھر درِ زنداں پہ آکے دی دستک
سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے[۲]

۱۔ اردو شاعری کا مزاج — ڈاکٹر وزیر آغا — صفحہ ۳۲۸
۲۔ نسخہ ہائے وفا — دست صبا — صفحہ ۳۹

اس طرح سے فیض کی غزلوں کا جائزہ لینے کے بعد ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ فیض کے یہاں قدیم اور روایتی مضامین کو نظم کرنے کا رجحان بہت زیادہ ہے۔ غالباً اس چیز کا اندازہ قارئین کو اسی وقت ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے ایک انٹرویو میں ان سے سوال کیا گیا کہ آپ نے روایتی قسم کے مضامین بہت باندھے ہیں مثلاً

؎ فقیہہ شہر سے مے کا جواز کیا پوچھیں
کہ چاندنی کو بھی حضرت حرام کہتے ہیں

تو اس کے جواب میں فیض نے یہ کہا:۔

"نہیں یہ پرانی چیز ہے اس وجہ سے کہ یہ بھی بالکل ہماری ہم عصری چیز ہے کہ فقیہہ شہر جو ہے، اس سے کشمکش جو ہے۔ شاعر کی یا شریف آدمی کی وہ پرانی چیز نہیں ہے۔ وہ جاری ہے۔ دوسرا یہ کہ جو صنف ہے۔ شاعری کی غزل۔ اس کا کمال تو یہی ہے کہ اس میں آپ پرانی سی پرانی بات اور پرانے سے پرانے رمز یہ کنایئے کو اس طریقے سے بیان کر سکتے ہیں کہ وہ بالکل ہم عصر حقیقت بن جاتی ہے جیسا کہ فقیہہ شہر کا جب ہم ذکر کرتے ہیں یا واعظ اور زاہد کا ذکر کرتے ہیں تو وہ روایتی بات نہیں ہے۔ وہ آج کی

ہم عصر روز مرہ کی حقیقت ہے۔"[1]

اسی انٹرویو میں وہ آگے روایت کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔

"ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری روایت نے جو کچھ ہمیں دیا ہے اسے ابھی ہم نے پوری طرح سے استعمال نہیں کیا ہے اس میں ابھی بہت سی گنجائشیں باقی ہیں جن سے ہم استفادہ کر سکتے ہیں، جس کی ہم نے کوشش نہیں کی۔ ہوا یہ ہے کہ ہماری نئی نسل جو ہے وہ چونکہ روایت سے ذرا دور ہوتی جا رہی ہے اس لیے اس روایت میں جو پنہاں ہے اس کو برآمد کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔"[2]

ان مکالموں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فیض روایت کے دلدادہ تھے اور اس روایت کو برقرار رکھنے کے لئے انھوں نے اس طرح کا اسلوب اور آہنگ اپنایا۔ مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمایئے کہ اس حد تک روایت کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نیا پیغام دیتے ہیں۔

دوستو، اس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے، نہ میخانے کا نام

---

[1] فیض سے ایک مکالمہ — از مظفر اقبال

[2] فیض سے ایک مکالمہ — از مظفر اقبال

ہم سے کہتے ہیں چمن والے، غریبانِ چمن!
تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے ویرانے کا نام
فیض ان کو ہے تقاضائے وفا ہم سے جنھیں
آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا نام[1]

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں
گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں
اب بھی خزاں کا راج ہے لیکن کہیں کہیں
گوشے رہِ چمن میں غزل خواں ہوئے تو ہیں
ہے دشت اب بھی دشت، مگر خونِ پا سے فیض
سیراب چند خارِ مغیلاں ہوئے تو ہیں[2]

دست صبا کی غزلوں کا تجزیہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ فیض اپنے اشعار کے ذریعے لوگوں کو اور خاص کر پس ماندہ طبقہ کو ایک نئی زندگی دینا چاہتے ہیں اس سلسلے میں محمد یوسف خاں کے یہ الفاظ قابل

۱	نسخہ ہائے وفا	دست صبا	صفحہ ۵۵
۲	نسخہ ہائے وفا	دست صبا	صفحہ ۶۳

تعریف ہیں۔

"فیض کی 'دست صبا' حیات نو کا پیغام سناتی ہے،
اس میں وہ امید و رجا، عزم و یقین ہمت، استقلال
ذوق زندگی، اور وہ حرارتِ حیات ہے کہ دل عزم
و امید سے معمور ہو جاتا ہے۔ اس میں غم کے سامنے سپر
انداز ہو جانے والا ارادہ، گریہ و زاری اور عشق زدہ
کنیز کی سسکیاں قطعاً معدوم ہیں۔ جس طرح بادلوں سے
محیط آسمان پر بجلی چمک کر اسے اخگر پوش بنا دیتی
ہے اسی طرح فیض کی امید و زندگی سے بھری ہوئی یہ کتاب
دل میں چراغاں کر دیتی ہے"۔[1]

سچ یہ ہے کہ جیسا فیض نے اس کتاب کے شروع میں حافظ کا یہ شعر نقل کیا ہے کہ :

نفسِ بادِ صبا مشک فشاں خواہد شد
عالم پیر دگر بارہ جواں خواہد شد

کافی حد تک فیض نے اس شعر کی پاسداری و نگہبانی کی ہے۔

---

[1] فیض کی شاعری کا نیا دور صفحہ ۸۹

زِنداں نامہ

زنداں نامہ میں اکثر و بیشتر منظومات منٹگمری جیل اور سنٹرل جیل جولائی ۱۹۵۳ء سے مارچ ۱۹۵۵ء تک کی نظم شدہ شامل ہیں۔ یہ شعری مجموعہ ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ غزلوں کی تفصیلی فہرست حسب ذیل ہے۔

نمبر شمار (۱)	غزل کا پہلا مصرعہ (۲)	ردیف (۳)	تعداد اشعار (۴)	(۵)
(۱)	شیخ صاحب سے رسم و راہ نہ کی	ی	۵	
(۲)	سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں	ن	۵	
(۳)	ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن، نہ تھی تری انجمن سے پہلے	سے	۶	حیدرآباد جیل ۱۷-۲۲ مئی ۵۴ء
(۴)	شامِ فراق، اب نہ پوچھ، آئی اور آ کے ٹل گئی	ی	۵	جناح ہسپتال کراچی جولائی ۵۳ء
(۵)	وہ خزاں میں تلاشِ بہار کرتے رہے	ے	۷	جناح ہسپتال کراچی ۲۱ اگست ۵۳ء
(۶)	بات بس سے نکل چلی ہے	ے	۶	منٹگمری جیل ۲۱ نومبر ۵۲ء
(۷)	سچ ہے، ہمیں کو آپ کے شکوے بجا نہ تھے	ے	۷	منٹگمری جیل ۲۴ نومبر ۵۳ء
(۸)	شاخ پر خونِ گل رواں ہے وہی	ی	۶	منٹگمری جیل

(۱)	(۲)	(۳)	(۴)	(۵)
(۹)	کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہاتھ میں تیرا ہاتھ نہیں	ن	۵	منٹگمری جیل
(۱۰)	ہم پر تمہاری چاہ کا الزام ہی تو ہے	ے	۷	منٹگمری جیل ۹ مارچ ۵۴ء
(۱۱)	گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے	ے	۷	منٹگمری جیل ۲۹ جنوری ۵۴ء
(۱۲)	کچھ محتسبوں کی خلوت میں، کچھ واعظ کے گھر جاتی ہے	ے	۶	منٹگمری جیل ۱۷ جون ۵۴ء
(۱۳)	گرمیٔ شوقِ نظارہ کا اثر تو دیکھو	و	۶	منٹگمری جیل ۴ مارچ ۵۵ء
(۱۴)	شہر میں چاک گریباں ہوئے ناپید اب کے	ے	۵	کراچی ۱۴ اگست ۱۹۵۵ء
(۱۵)	یوں بہار آئی ہے اس بار کہ جیسے قاصد	ے	۵	لاہور مارچ ۱۹۵۶ء
(۱۶)	صبح کی آج جو رنگت ہے وہ پہلے تو نہ تھی	ن	۴	جناح ہسپتال کراچی جولائی ۵۳ء
(۱۷)	تیری امید، ترا انتظار جب سے ہے	ے	۵	لاہور مارچ ۵۷ء

مذکورہ بالا فہرست کے تحت "نسخہ ہائے وفا" مطبوعہ مکتبۂ کارواں کچہری روڈ لاہور کے تحت زنداں نامہ میں سترہ (۱۷) غزلیں ہیں۔ جب کہ زنداں نامہ مطبوعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ اشاعت ۱۹۷۹ء میں صرف پندرہ غزلیں ہیں۔ یہ دو غزلیں شامل نہیں ہیں۔ جسکا مطلع ہے۔

(۱) صبح کی آج جو رنگت ہے وہ پہلے تو نہ تھی
کیا خبر آج خراماں سرِ گلزار ہے کون

(۲) تری امید، ترا انتظار جب سے ہے
نہ شب کو دن سے شکایت نہ دن کو شب سے ہے

---

(۱) اگرچہ یہ غزل جس کا پہلا مصرعہ حسب ذیل ہے

ع سچ ہے ہمیں کو آپ کے شکوے بجا نہ تھے

'واسوخت' کے عنوان سے 'زنداں نامہ' میں شامل کی گئی ہے جس کی وجہ سے لوگوں کو اس کے غزل نہ ہونے پر شبہ ہوتا ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ہیئت اور مضمون دونوں کے اعتبار سے یہ غزل ہی ہے جیسا کہ میجر محمد اسحاق نے نسخہ ہائے وفا میں زنداں نامہ کے سلسلے میں جو دیباچہ "روداد قفس" کے نام سے لکھا ہے اس میں سجاد ظہیر کا ایک خط نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"جس غزل کو تم نے واسوخت کا عنوان دیا ہے
وہ بھی اپنے رنگ میں خوب ہے۔ ایک ایک
شعر نشتر ہے کس کس کی تعریف کریں۔

خاص طور پر یہ شعر:۔

گر فکر زخم کی تو خطاکار ہیں کہ ہم
کیوں محو مدح خوبیٔ تیغ ادا نہ تھے

اس کی داد تو فیض سرنا اوشہ سے بھی لے لیتے۔

جعفر علی خاں اثر تو الگ رہے ...."[۱]

---

[۱] نسخہ ہائے وفا صفحہ ۲۳۶

(۲) "گرمیٔ شوقِ نظارہ کا اثر تو دیکھو"

اس غزل کے بارے میں نسخہ ہائے وفا مطبوعہ مکتبۂ کارواں کچہری روڈ لاہور، اور زنداں نامہ، پاکستانی اشاعت میں منٹگمری جیل ۴ مارچ ۱۹۵۷ء لکھا ہوا ہے۔ جب کہ ہندوستانی ایڈیشن میں ۴ مارچ ۱۹۵۵ء دیا ہے

(۳) اگست ۱۹۵۵ء جس کا پہلا مصرعہ ہے "شہر میں چاک گریباں ہوئے ناپید اب کے" جو کراچی میں ۱۴ اگست ۱۹۵۵ء کو نظم ہوئی۔ اس کا زنداں سے کوئی رشتہ نظر نہیں آتا۔

مگر عنوان ڈال دینے سے اس کے غزل نہ ہونے پر شبہہ ہوتا ہے اگرچہ اس کی ہیئت اور اس کے مضامین غزل کے ہیں۔

(۴) اگرچہ یہ غزل جس کا مطلع حسب ذیل ہے

یوں بہار آئی ہے امسال کہ جیسے قاصد
کوچۂ یار سے بے نیل مرام آتا ہے

اس کی تاریخ نظم بھی اشاعت کے مطابق مارچ ۱۹۵۷ء لاہور دی ہوئی ہے۔ جبکہ فیض احمد فیض بقول میجر محمد اسحاق

"فیض احمد فیض ۹ مارچ ۱۹۵۱ء کو قید ہوئے اور اپریل ۱۹۵۵ء میں رہا ہوئے اس طرح ان کی اسیری کے دن کچھ اوپر چار سال

بنتے ہیں"[1]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس غزل کا تعلق زنداں نامہ سے نہیں ہے لیکن ہمیں چونکہ فیض کی غزلیات کا جائزہ پیش کرتا ہے اس لئے ہم نے اسی اشاعت کے مطابق شامل کر لیا ہے ۔

(۵) تری امید ترا انتظار جب سے ہے
نہ شب کو دن سے شکایت نہ دن کو شب سے ہے

اس مطلع سے شروع ہونے والی غزل ہندوستانی ایڈیشن میں شامل نہیں ہے ۔ جبکہ پاکستانی ایڈیشن زنداں نامہ اور نسخہ ہائے وفا پاکستانی اشاعت میں لاہور مارچ ۱۹۵۷ء اس کے نظم ہونے کی تاریخ لکھی گئی ہے ۔ لیکن یہی غزل اسی نسخے میں دست تہہ سنگ میں صفحہ ۳۶۹ پر بعینہ شامل ہے اور اس کے نظم کا مقام بمبئی ۱۹۵۷ء دیا گیا ہے

ان غزلوں اور نظموں کا مطالعہ کرنے سے پیشتر ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ جیل میں خواہ کتنا ہی آرام کیوں نہ ہو پھر بھی جیل جیل ہی ہے ۔ پھر جیل میں قید تنہائی کے اوقات کی جیل جس کے بارے میں خود فیض کا یہ کہنا رہا ہے کہ جیل اور پھر قید تنہائی کی جیل سب سے زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے ۔

---

[1] نسخہ ہائے وفا صفحہ ۲۰۲

اس لیے کہ یہاں آدمی انسانی صحبت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس لئے ایسے حالات میں خواہ ایک ان پڑھ یا جاہل آدمی ہو یا حساس، تعلیم یافتہ شاعر یا ادیب ہو اس کی ذہنیت تیزی کے ساتھ گردش کا شکار رہتی ہے اور بدلتی رہتی ہے۔ فیض سنٹرل جیل حیدر آباد سندھ سے منٹگمری جیل میں اس وقت آئے جب چار سال قید با مشقت سزا کا حکم ہو چکا تھا اور سنٹرل جیل حیدر آباد میں انھیں شاید کچھ آرام رہا ہو چنانچہ وہ سرگودھا وغیرہ جیلوں کی قید تنہائی بھگتنے کے بعد خط نمبر ۱، ۷ رجون ۱۹۵۱ء میں مسز ایلس کو تسلی کی خاطر لکھتے ہیں۔

"اب تو یوں ہے کہ اگر کوئی یاد نہ دلائے تو خیال بھی نہیں آتا کہ ہم جیل خانے میں ہیں یوں لگتا ہے کہ ہم اپنی مرضی سے یہاں ہیں اور اگر یہاں سے باہر جانے کو جی چاہے تو کوئی ہمیں روک بھی نہیں سکتا۔ جیل میں ہمارا گھر اچھا خاصا کھانے پینے کو کافی ملتا ہے۔ گرمی کچھ ایسی زیادہ نہیں۔ اسیری کے سب سے برے دن کٹ چکے ہیں اس لئے اب کچھ اور بھی ہو، نہ قید تنہائی کا سامنا باقی ہے، نہ پولس کی تکلیف دہ پوچھ گچھ کا ڈر ہے اور اپنی جان اور ناموس دونوں سلامت ہیں۔"[1]

---

[1] صلیبیں مرے دریچے میں فیض احمد فیض صفحہ ۲۶

اسی طرح ایک دوسرے خط میں اس جیل تک آنے کا حال غالب کے شعر کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں ۔

" نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

یہاں تک کا سفر بھی کافی خوشگوار تھا یعنی پولیس کی بند گاڑی میں جس حد تک کوئی سفر خوشگوار ہو سکتا ہے ۔ آہنی جالی کی بار یک درازوں سے کبھی لہے جھنڈے کھیتوں کا منظر دیکھنے میں آتا کبھی کوئی روش روش ہوار بیٹ نظر پڑتا اور کبھی کسی شوخ رنگ لال نیلی دیہاتی قبا کی جھلک دکھائی دے جاتی ۔ لیکن یہ نظارہ کرنا ایسا محنت طلب تھا کہ گردن اینٹھ جانے کا ڈر ہوتا تھا ۔

لاہور کا قیام کافی بدمزہ تھا ۔ لیکن یہ تو ہوتا ہی ہے ۔ بہرحال ایک مہینہ اندر کٹ گیا اور ہم چند بار مل بھی لیے اس لیے کوئی محل شکایت نہیں[1] "

ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ سنٹرل جیل حیدر آباد (سندھ) میں انھیں نسبتاً کچھ آرام رہا اور کچھ ظاہری آسائشیں میسر رہیں ۔ جولائی ۱۹۵۳ء

---

[1] صلیبیں مرے دریچے میں فیض احمد فیض صفحہ ۱۹۰

ہیں حیدر آباد والے پندرہ ملزمین کو الگ الگ ٹولیوں میں دوسرے جیلوں میں بھیج دیا گیا۔ جیسا میجر محمد اسحاق تحریر فرماتے ہیں۔

"......ہم سب کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بانٹ کر لاہور منٹگمری مچھ (بلوچستان) اور حیدر آباد کے جیلوں میں بھیج دیا گیا میرے لیے فیض صاحب اور کیپٹن خضر حیات کے لیے منٹگمری جیل کا انتخاب ہوا لیکن وہ چونکہ بغرض علاج کراچی چلے گئے اس لیے کہیں ستمبر ۱۹۵۳ء میں جا کر ہمارے پاس منٹگمری پہونچے......" ؎۱

کراچی جیل کی حالت خود فیض کے لفظوں میں پڑھتے چلئے۔

"ایک جیل سے دوسرے جیل میں جائیں تو کافی دیر تک جیل خانے کا احساس ہی نہیں ہوتا یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم کسی نئے اور اجنبی ملک میں نکل آئے ہیں فی الحال میں بھی یوں ہی محسوس کر رہا ہوں میری رہائش گاہ کچھ جاذب نظر جگہ نہیں ہے چھوٹی سی کٹیا جس پر کھپریل کی سرخ چھت ہے پشت پر نازک نازک پتوں والے پیڑ ہیں اور سامنے کے جنگلے پر ایک بہت پھیلی ہوئی بیل اپنے سرخ اور نارنجی پھولوں کی بہار دکھا رہی

؎۱ نسخہ ہائے وفا — فیض احمد فیض — صفحہ ۲۰۲

ہے۔ جب چاند نکلتا ہے تو میرا صحن عشاق کی سیرگاہ معلوم ہوتا ہے۔ کٹیا اور اس میں جھلملاتا ہوا پیٹرومیکس لیمپ پس منظر میں ایک سفید اور سبز دھبا سا جو میرا غسل خانہ ہے اور سامنے کا جنگلہ اور اس کے پھول یہ سب چیزیں جیل کی دیوار پھاند کر کسی اور دنیا میں تحلیل ہو جاتی ہیں اور یوں لگتا ہے کہ ہم جیل میں نہیں ہیں۔ کہیں دیہات کی کھلی فضا میں ہیرا ڈالے پڑے ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ چند ہی دنوں میں یہ تاثر زائل ہو جائے گا اور جیل پھر لوٹ آئے گا۔"[۱]

اسی خط میں آگے تحریر فرماتے ہیں:۔

"یہاں جس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے وہ حیدر آباد کے دوستوں کی صحبت ہے اگرچہ یہاں بھی سہ پہر میں اپنے ہمسایوں سے مل سکتا ہوں لیکن یہ مجمع کچھ عجیب سا ہے البتہ ایک خاصا بھلا سا انگریز قیدی بھی ہے (لندن کا رہنے والا ہے) اور اس کا گھر دور نہیں جہاں تمہارے والدین کی قیام گاہ ہے۔ مولانا عبدالحامد بدایونی سے بھی کچھ انس ہو گیا ہے (وہ ختم نبوت کی تحریک کے سلسلے میں یہاں ہیں)

۱۔ صلیبیں مرے دریچے میں — فیض احمد فیض — صفحہ ۱۷۳

اس لیے میرا خیال ہے کہ وقت کٹ جائے گا۔

دراصل مجھے تو اس تنہائی میں کچھ لطف بھی آرہا ہے اور حیدرآباد کی گہما گہمی کے بعد اس خلوت میں آرام اور سکون محسوس ہو رہا ہے اگرچہ اس وقت تک زیادہ سکون تو نہیں مل سکا نووارد ہونے کے سبب لوگوں کو ہمارے بارے میں تجسس بھی ہے اور شوق ملاقات بھی......

میرا علاج ابھی شروع نہیں ہوا لیکن غالباً ایک آدھ دن میں شروع ہو جائے گا جب تک میں سستا رہا ہوں۔[1]"

۷ جولائی ۱۹۵۳ء خط نمبر ۹۵ میں اپنی بیماریوں اور علاج کا حال تحریر فرماتے ہیں۔

"اس دوران میں بقول بخاری صاحب CAESARIAN آپریشن کے سوا باقی سب کچھ جھیل چکے ہیں۔ خون کا دباؤ اب معمول پر ہے اور کان اور دانتوں کے سوا اور کوئی شکایت نہیں لیکن خدا گواہ ہے کہ آدمی کی خانہ ویرانی کو یہی کیا کم ہیں۔ مرض تو خیر اپنی جگہ ہے۔ میں علاج کی بات کر رہا ہوں جو مرض سے زیادہ کہیں تکلیف دہ ہے۔[2]"

کراچی جیل اور جناح ہسپتال کا مختصر وقفہ اگرچہ فیض کے لئے کچھ

۱	صلیبیں مرے دریچے میں	فیض احمد فیض	صفحہ ۱۷۳-۱۷۴
۲	صلیبیں مرے دریچے میں	فیض احمد فیض	صفحہ ۱۷۵

زیادہ خوش گوار نہیں رہا اور وہ دانتوں اور کان کے شدید درد میں مبتلا رہے
پھر بھی وہ شاعرانہ ملکہ جو قدرت نے انھیں ودیعت کیا اور بیدار رہتا رہا
وہ اس سے کام لیتے رہے اور خزاں میں بہار کی تلاش کرتے اور شب
سیاہ سے حُسن دیار کی طلب کرتے رہے خیال یار اور ذکر یار پر ان
کی زندگی منحصر رہی اور بزم خیال میں اپنے محبوب کے حسن کی شمع جلا کر دل
کو بہلاتے رہے اور شام فراق کے درد سے تسلی پانے کا وسیلہ بناتے رہے
اور اسی لیے

جب تجھے یاد کر لیا، صبح مہک مہک اٹھی
جب ترا غم جگا لیا، رات مچل مچل گئی
دل سے تو ہر معاملہ کر کے چلے تھے صاف ہم
کہنے میں ان کے سامنے بات بدل بدل گئی
آخر شب کے ہم سفر فیضؔ نجانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا، صبح کدھر نکل گئی [۱]

اور

نہیں شکایت ہجراں، کہ اس وسیلے سے
ہم ان سے رشتۂ دل استوار کرتے ہے

---

[۱] نسخہ ھائے وفا فیضؔ احمد فیضؔ صفحہ ۲۴۵

وہ دن کہ کوئی بھی جب وجہ انتظار نہ تھی
ہم ان میں تیرا سوا انتظار کرتے رہے [۱]

کراچی ہسپتال میں جیسا کچھ عام دستور رہا ہے کہ عام ملزم کو جیل کی بہ نسبت ہسپتال میں زیادہ آرام اور آزاد فضا ملتی ہے۔ چنانچہ فیضؔ کو اس مختصر وقفے میں آزادی کی نعمتوں کا شدید احساس ہوا اور جب وہ ستمبر ۱۹۵۲ء میں منٹگمری جیل پہنچے تو قید کا احساس اور آزادی سے محرومی کا جذبہ بہت شدت اختیار کر گیا جیسا کچھ اس وقفے کی غزلوں اور نظموں سے ظاہر ہوتا ہے

مختصر یہ کہ 'زنداں نامہ' کے عنوان سے لکھا گیا یہ شعری مجموعہ نظموں اور غزلوں کا ایسا حسین امتزاج ہے جس کو پڑھ کر ہم بہ آسانی کہہ سکتے ہیں کہ

'جس میں گرمی بھی ہے حرکت بھی توانائی بھی'

غیر ساعد حالات میں بھی یہ ہمیشہ ہماری کا ساتھ دیتا ہے اس کا رنگ و آہنگ نہ کبھی دھندلا ہوتا ہے اور نہ کبھی بجھتا ہے۔

اس سلسلے میں اس کی عظمت کا اقرار کرتے ہوئے سجاد ظہیر لکھتے ہیں۔

---

۱ نسخہ ہائے وفا — فیض احمد فیضؔ — صفحہ ۲۴۶

"بہت عرصہ گزر جانے کے بعد جب لوگ راولپنڈی سازش کے مقدمے کو بھول جائیں گے اور پاکستان کا مورخ ۱۹۵۲ء کے اہم واقعات پر نظر ڈالے گا تو غالباً اس سال کا سب سے اہم تاریخی واقعہ نظموں کی اس چھوٹی سی کتاب کی اشاعت کو ہی قرار دیا جائے گا۔"[1]

فیض کے زنداں نامہ کی غزلوں کا تجزیہ پیش خدمت ہے جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ فیض نے نقش فریادی کے دوسرے حصے سے ہی اپنی شاعری کا انداز بدل دیا تھا۔ دست صبا میں وہ رنگ زیادہ نمایاں ہے اور پھر اس زنداں نامہ میں تو جیل کی صعوبتوں کو جھیلتے جھیلتے اور وطن مالوف کی خستہ و زبوں حالی کو دیکھتے دیکھتے ان کے خیالات میں تبدیلیاں صرف گہری ہوتی گئیں بلکہ ان میں برہمی اور برانگیختگی آتی گئی کیونکہ ان کا دل ایک طرف اپنے ہر دل عزیز وطن کو خاطر خواہ ترقی کی راہ پر نہ دیکھ کر بے قرار تھا تو دوسری طرف یہ کہ جو لوگ حقیقت میں وطن کے بہی خواہ تھے وہی قید و بند میں نظر آ رہے تھے ان دونوں متضاد حالات کے امتزاج نے ان کی شاعری میں ایک عجیب و غریب کیفیت پیدا کی جو ہمارے سامنے زنداں نامہ کی شکل میں

---

[1] نسخہ ہائے وفا — فیض احمد فیض — صفحہ ۱۹۶

ابھر کر آتی ہے۔ اس کی نظمیں تو خالص سیاسی ہیں۔ غزلوں میں بھی فیضؔ اپنے دلی جذبات کو چھپا نہ سکے اور اپنے معشوق وطن کو فلاح و بہبود کی منزلِ اعلیٰ پر لانے کے لئے نغمہ سرا ہوتے رہے۔ جیسا کہ فن اور شخصیت کے فیضؔ نمبر میں مجنوںؔ گورکھپوری نے لکھا ہے۔

"فیضؔ ان لوگوں میں سے ہیں جو اردو غزل اور جدید اردو نظم دونوں میں ایک تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے ہماری شاعری میں نئے امکانات پیدا کئے ہیں اور اس کے لئے بہت سی آزادیاں مہیا کی ہیں۔ نئی تحریک کو فروغ دینے میں ان کی شاعری کا بہت بڑا حصّہ ہے لیکن بجائے خود وہ کسی شدید کیف یا کسی شدید قوت کے مالک نہیں فیضؔ کی اہمیت بھی اسلوبی اجتہادات پر مبنی ہے۔"[1]

فیضؔ کا یہ دور ذہنی کشمکش سے لبریز ہے کیونکہ انھیں اس دور میں طرح طرح کے الزامات میں ملوث کیا گیا تھا جن سے نجات پانا جوئے شیر کا لانا تھا۔ ایسے حالات میں فیضؔ نے اپنے حالات کو اشعار کا جامہ پہنایا جو ان کے ذہن کی عکاسی کرتا ہے۔ کہتے ہیں :-

شیخ صاحب سے رسم و راہ نہ کی
شکر ہے زندگی تباہ نہ کی

---

[1] فن اور شخصیت فیضؔ نمبر صفحہ ۲۵۹

تجھ کو دیکھا تو سیر چشم ہوئے
تجھ کو چاہا تو اور چاہ نہ کی
تیرے دستِ ستم کا عجز نہیں
دل ہی کافر تھا جس نے آہ نہ کی

اسی غزل میں آگے کہہ اٹھتے ہیں

تھے شبِ ہجر، کام اور بہت
ہم نے فکرِ دلِ تباہ نہ کی
کون قاتل بچا ہے شہر میں فیضؔ
جس سے یاروں نے رسم و راہ نہ کی[۱]

جن علامات و اشارات اور رنگ و آہنگ کو انھوں نے اپنی شاعری کا وسیلہ بنایا وہ قابلِ داد و ستائش ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ علامتیں اشارات و کنایات اردو غزلیات کا طرۂ امتیاز ہیں جو کہ زیادہ تر محبوب اور اس کی محفل سے وابستہ اداکاریوں اور گل کاریوں تک محدود تھیں لیکن فیضؔ نے ان کے معنی میں وسعت بخشی اور انھیں

---

[۱] نسخہ ھائے وفا صفحہ ۲۳۶

اس انداز سے پیش کیا کہ وہ عصری آگہی، ادراک اور تقاضوں کی تکمیل کر سکیں۔ فیض کے یہاں ہمیں تقریباً تمام قدیم علامتیں اور اشارات ہی ملتے ہیں لیکن انھوں نے انھیں ایسی چابکدستی اور فنکاری سے ادا کیا ہے کہ ان کے معنی اور مفہوم بالکل نیا انداز، نیا رنگ ڈھنگ اختیار کئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ وہی علامتیں ہیں جن سے ہم ماضی اور حال کا رشتہ بہ آسانی جوڑ سکتے ہیں۔ اس معنی اور مفہوم کی تبدیلی نے ان کے اسلوب بیان اور لہجے میں ایک نیا پن عطا کیا ہے۔ مثلاً

سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں
ہم لوگ سرخ رو ہیں کہ منزل سے آئے ہیں
اٹھ کر تو آ گئے ہیں تری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں
ہر اک قدم اجل تھا، ہر اک گام زندگی
ہم گھوم پھر کے کوچۂ قاتل سے آئے ہیں[1]

فیض کی شاعری پر تنقید کرتے ہوئے پروفیسر ممتاز حسین نے کیا عمدہ بات کہی ہے۔

---

[1] نسخہ ہائے وفا   فیض احمد فیض   صفحہ ۲۴۰

"عشق بے نیاز سیاست آج بے معنی ہے۔ انھیں معنوں میں فیض کے یہاں جذبۂ عشق اس کے سیاسی جذبے سے متحد ہو گیا ہے اور وہ اس حد تک متحد ہو گیا ہے کہ انھوں نے اس کی ساری کیفیات کو سیاسی جذبے کی کیفیات میں منتقل کر دی ہیں [۱]"

اسی سلسلے میں میجر محمد اسحاق زنداں نامہ کا دیباچہ لکھتے ہوئے "روداد قفس" میں اثر لکھنوی کا ایک اقتباس نقل کرتے ہیں

"فیض احمد فیض کی شاعری ترقی کے مدارج طے کر کے اب اس نقطۂ عروج پر ہے کہ جس تک شاید ہی کسی دوسرے ترقی پسند شاعر کی رسائی ہوئی ہو۔ تخیل نے صناعت کے جوہر دکھائے ہیں اور معصوم جذبات کو حسین پیکر بخشا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پریوں کا ایک غول، ایک طلسمی فضا میں اس طرح مست پرواز ہے کہ ایک پر ایک کی چھوٹ پڑ رہی ہے اور قوس قزح کے عکاس بادلوں سے ہفت رنگی بارش ہو رہی ہے [۲] ...."

۱ے	دل پر خون کا ہنر تو دیکھو	افکار فیض نمبر کراچی	صفحہ ۳۱۷
۲ے	نسخہ ہائے وفا	'روداد قفس'	صفحہ ۲۰۱

یہ سچ ہے کہ تراکیب بندشیں اور علامات کے نئے معنی فیض[1] کی شاعری میں ست رنگی بارش کرتے نظر آتے ہیں مثلاً :-

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن، نہ تھی تری انجمن سے پہلے
سزا، خطائے نظر سے پہلے، عتاب جرم سخن سے پہلے

جو چل سکو تو چلو کہ راہِ وفا بہت مختصر ہوئی ہے
مقام ہے اب کوئی نہ منزل، فرازِ دار و رسن سے پہلے

غرورِ سرو و سمن سے کہہ دو پھر وہی تاجدار ہوں گے
جو خار و خس والیٔ چمن تھے عروجِ سرو و سمن سے پہلے

ادھر تقاضے ہیں مصلحت کے، ادھر تقاضائے دردِ دل ہے
زباں سنبھالیں کہ دل سنبھالیں، اسیر ذکرِ وطن سے پہلے

شامِ فراق اب نہ پوچھ، آئی اور آ کے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا، جاں تھی کہ پھر سنبھل گئی

---

[1] نسخہ ہائے وفا صفحہ ۲۴۳-۲۴۴

بزمِ خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی

جب تجھے یاد کر لیا، صبح مہک مہک اٹھی
جب ترا غم جگا لیا، رات مچل مچل گئی

دل سے تو ہر معاملہ کر کے چلے تھے صاف ہم
کہنے میں ان کے سامنے بات بدل بدل گئی

فیض ملک میں پھیلی افراتفری اور جیل کی صعوبتوں سے ہرگز مایوس نہیں ہوتے بلکہ انھیں ہر دم امید کی ایک نئی کرن پھوٹتی نظر آتی ہے۔

رہِ خزاں میں تلاشِ بہار کرتے رہے
شبِ سیہ سے طلب حسنِ یار کرتے رہے
خیالِ یار، کبھی ذکرِ یار کرتے رہے
اسی متاع پہ ہم روزگار کرتے رہے

---

۵ نسخہ ہائے وفا صفحہ ۲۴۵

ہم اپنے راز پہ نازاں تھے، شرمسار نہ تھے
ہر ایک سے سخنِ رازدار کرتے رہے[1]

اسی کشمکش میں وہ کہہ اٹھتے ہیں :-

بات بس سے نکل چلی ہے
دل کی حالت سنبھل چلی ہے
اشک خوناب ہو چلے ہیں
غم کی رنگت بدل چلی ہے
یا یونہی بجھ رہی ہیں شمعیں
یا شبِ ہجر ٹل چلی ہے
جاؤ اب سو رہو ستارو
درد کی رات ڈھل چلی ہے[2]

زنداں نامہ کی ساتویں غزل جسے تقریباً سبھی نسخوں میں اور نسخہ ہائے وفا میں بھی واسوخت کا عنوان دیا گیا ہے وہ اپنی ہیئت اور مضمون کے اعتبار سے غزل ہے۔ اسی وجہ سے راقم الحروف نے اس کا شمار غزل میں کیا ہے۔ اس کے ایک ایک شعر قابل داد و ستائش ہیں

---

[1] نسخہ ہائے وفا : صفحہ : ۲۴۶

[2] نسخہ ہائے وفا : صفحہ : ۲۵۳-۲۵۴

اس کا رنگ اپنے آپ میں ممتاز حیثیت کا مالک ہے۔ الفاظ نہایت سادہ سلیس اور رواں ہیں۔ الفاظ کی دروبست فیض کی دراکی طبع کی داد دے رہے ہیں۔

سچ ہے ہمیں کو آپ کے شکوے بجا نہ تھے
بے شک ستم جناب کے سب دوستانہ تھے
ہاں، جو جفا بھی آپ نے کی، قاعدے سے کی!
ہاں، ہم بھی کاربندِ اصولِ وفا نہ تھے

خاص طور سے اس غزل کا یہ شعر:۔

گر فکرِ زخم کی تو خطاوار ہیں کہ ہم
کیوں محوِ مدحِ خوبیٔ تیغِ ادا نہ تھے[۱]

اس شعر کے بارے میں سجاد ظہیر لکھتے ہیں:۔

"اس کی داد تو فیض مرزا نوشہ سے بھی لے لیتے جعفر علی خاں اثر تو الگ رہے......"[۲]

۱۔	نسخہ ھائے وفا	:	صفحہ	۲۵۶
۲۔	نسخہ ھائے وفا	:	صفحہ	۲۳۶

فیض کی غزلوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ غزلوں کی اساس ان کا انقلابی نعرہ نہیں بلکہ وہی شعری لہجہ اور ان کا مخصوص رنگ و آہنگ ہے جس سے وہ حقائق کی تلخی کو قابل برداشت کر دیتے ہیں۔ جہاں ذرا سی بھی کوئی امید نظر آتی ہے وہ اپنے رجائیت بھرے لہجے میں پکار اٹھتے ہیں :-

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہاتھ میں تیرا ہاتھ نہیں
صد شکر کہ اپنی راہوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں
گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں [1]

ظلم اور عدل رجعت اور ترقی کی کشمکش میں فیض ترقی پسندوں کا رہنما نظر آتے ہیں۔ اس لیے مفاد پرست ہمیشہ ان پر نئی نئی تہمتیں لگاتے رہے لیکن وہ اپنی استقامت اور پامردی سے نہ صرف اس کا مقابلہ کرتے رہے بلکہ بر ملے خوش اسلوبی اور شائستگی سے مخالفین کے الزام اور دشنام کو انعام اور اکرام گردانتے رہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

ہم پر تمہاری چاہ کا الزام ہی تو ہے
دشنام تو نہیں ہے، یہ اکرام ہی تو ہے

---

[1] نسخہ ہائے وفا : صفحہ ۲۵۹

کرتے ہیں جس پہ طعن کوئی جرم تو نہیں
شوق فضول و الفتِ ناکام ہی تو ہے
دل مدعی کے حرفِ ملامت سے شاد ہے
اے جانِ جاں یہ حرف ترا نام ہی تو ہے[1]

آگے کس قدر رجائیت اور امید بھرے لہجے میں گنگناتے ہیں:-

دل ناامید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے
دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں
دستِ فلک میں گردشِ ایام ہی تو ہے
آخر تو ایک روز کرے گی نظر وفا
وہ یارِ خوش خصال سرِ بام ہی تو ہے[2]

ظلم اور استبداد سے عاجز آ کر اپنے سرور نغمہ کے کارواں کو اس شعر کے ساتھ رواں دواں دکھنا چاہتے ہیں۔

---

[1] نسخہ ہائے وفا : صفحہ ۲۶۰
[2] نسخہ ہائے وفا : صفحہ ۲۶۱

بھیگی ہے رات فیضؔ غزل ابتدا کرو
وقتِ سرود، درد کا ہنگام ہی تو ہے

اس کے بعد کی غزل میں بھی یہی انداز نمایاں ہے :۔

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے
بڑا ہے درد کا رشتہ، یہ دل غریب سہی
تمھارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

محض یہی نہیں بلکہ فیضؔ اپنی استقامت اور پامردی کی بناء پر کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں :۔

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے
مقام، فیضؔ، کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے[1]

طنز اردو غزل کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ کبھی رقیبوں سے چھیڑ چھاڑ تو کبھی

---

[1] نسخہ ھائے وفا : صفحہ : ۲۶۴

واعظوں کی پردہ دری۔ فیض نے بھی اپنی غزلوں میں جا بجا طنزیہ انداز اپنایا ہے۔ کیونکہ ان کا سامنا بھی طرح طرح کے سیاسی اور ادبی مخالفین سے رہا ہے اس وجہ سے ان کا طنزیہ انداز بھی دوسرے شعراء کے مقابلے میں بالکل نرالا ہے۔ کہتے ہیں۔

کچھ محتسبوں کی خلوت میں، کچھ واعظ کے گھر جاتی ہے
ہم بادہ کشوں کے حصّے کی، اب جام میں کمتر جاتی ہے
بیداد گروں کی لبتی ہے یاں داد کہاں خیرات کہاں
سر پھوڑتی پھرتی ہے ناداں فریاد جو در در جاتی ہے[1]

جیسا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ فیض نے اپنی غزلوں کو بھی سیاسی افکار ظاہر کرنے کا وسیلہ بنایا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کی یہ غزلیں انقلابی مضمون کی تو حامل ہیں لیکن ان میں رنگ و آہنگ کے اعتبار سے بھرپور تغزل نظر آتا ہے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل غزلیں تغزل اور سیاسی افکار کے امتزاج کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔

گرمیٔ شوق نظارہ کا اثر تو دیکھو
گل کھلے تو جاتے ہیں وہ سایۂ در تو دیکھو

---

[1] نسخہ ھائے وفا : صفحہ ۲۷۱

وہ جواب چاک گریباں بھی نہیں کرتے ہیں
دیکھنے والو کبھی ان کا جگر تو دیکھو
دامنِ درد کو گلزار بنا رکھا ہے
آؤ اک دن دلِ پرخوں کا ہنر تو دیکھو
صبح کی طرح جھمکتا ہے شبِ غم کا افق
فیض، تابندگی دیدۂ تر کو دیکھو[1]

اگست ۱۹۵۵ء کے عنوان سے جو غزل ہے بظاہر اس کا تعلق قید خانہ سے نہیں ہے اور وہ ان کے جیل سے رہا ہونے کے بعد کراچی میں ۱۴ اگست ۱۹۵۵ء کو لکھی گئی لیکن معلوم نہیں کیوں یہ غزل نا امیدی اور مایوسی کی عکاس نظر آتی ہے۔ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ فیض کو اب اپنی امیدیں اور توقعات پوری ہوتی نظر نہیں آئیں۔ اسی وجہ سے وہ پکار اٹھتے ہیں۔

شہر میں چاک گریباں ہوئے ناپید اب کے
کوئی کرتا ہی نہیں ضبط کی تاکید اب کے
چاند دیکھا تری آنکھوں میں، نہ ہونٹوں پہ شفق
ملتی جلتی ہے شبِ غم سے تری دید اب کے

---

[1] نسخہ ہائے وفا : صفحہ : ۲۸۰

دل دکھا ہے نہ وہ پہلا سا نہ جاں تڑپتی ہے
ہم بھی غافل تھے کہ آئی ہی نہیں عید اب کے

اور آخر میں کچھ مایوس اور پریشان سے نظر آتے ہیں کہ :-

پھر سے بجھ جائیں گی شمعیں جو ہوا تیز چلی
لا کے رکھو سرِ محفل کوئی خورشید اب کے[1]

امید اور مایوسی کی کشمکش میں مبتلا تو ضرور ہیں لیکن ان کے اشعار کے تیور سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ناامیدی محض لمحاتی ہے امید اور رجائیت آنے والی ہے کہتے ہیں :-

شوق والوں کی حزیں محفلِ شب میں اب بھی
آمدِ صبح کی صورت ترا نام آتا ہے
اب بھی اعلانِ سحر کرتا ہوا مست کوئی
داغِ دل کر کے فروزاں سرِ شام آتا ہے[2]

---

[1] نسخہ ہائے وفا : صفحہ : ۲۸۸

[2] نسخہ ہائے وفا : صفحہ : ۲۸۹

امید اور مایوسی کی ملی جلی پیکر تراشی ملاحظہ کیجئے ۔ کچھ بھی ہو کتنی ہی مصیبتوں کا سامنا کرنا ہو ، فیض کسی بھی حال میں ڈگمگانے والا نہیں یہاں تک کہ وہ تو ایک بار موت سے بھی ٹکر لینا چاہتا ہے ۔

رات مہکی ہوئی آئی ہے کہیں سے پوچھو
آج بکھرائے ہوئے زلفِ طرحدار ہے کون
پھر درِ دل پہ کوئی دینے لگا ہے دستک
جانیے پھر دلِ وحشی کا طلبگار ہے کون[1]

زنداں نامہ کی آخری غزل :-

تری امید ترا انتظار جب سے ہے
نہ شب کو دن سے شکایت نہ دن کو شب سے ہے[2]

کے بارے میں جیسا کہ راقم الحروف نے پہلے عرض کیا ہے کہ اس کا تعلق اس مجموعہ سے نظر نہیں آتا اس لیے اس کا تجزیہ دستِ تہِ سنگ کے تحت کیا جائے گا ۔

۱	نسخہ ھائے وفا	:	صفحہ	۲۹۲
۲	نسخہ ھائے وفا	:	صفحہ	۲۹۳

اسی کشمکش کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ اپنے خیالات کو منزلِ مقصود کی طرف آگے بڑھاتے ہیں کیونکہ ان کا یقین ہے۔

اے ساکنانِ کنجِ قفس صبح کو صبا
سنتی ہی جائے گی سوئے گلزار دیکھنا

اسی یقین سے متاثر ہو کر وہ دستِ تہِ سنگ کے آغاز میں ہی کہہ اٹھتے ہیں۔

شاید کبھی افشا ہو، نگاہوں پہ تمہاری
ہر سادہ ورق، جس سخن کشتہ سے خوں ہے
شاید کبھی اس گیت کا پرچم ہو سرافراز
جو آمدِ صرصر کی تمنا میں نگوں ہے
شاید کبھی اس دل کی کوئی رگ تمہیں چبھ جائے
جو سنگِ سرِ راہ کی مانند زبوں ہے[1]

اسی کی روشنی میں ہم دستِ تہِ سنگ کا تجزیہ کریں گے۔

---

[1] نسخہ ہائے وفا : صفحہ : ۳۰۱

دستِ تہِ سنگ

فیض کا یہ مجموعہ جس کا نام دست تہ سنگ ہے اپنے آپ میں ایک عنوان بھی ہے اور خیالات و افکار کا ترجمان بھی۔ دست تہ سنگ فارسی کا ایک محاورہ ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ ہاتھ بندھے ہوں اور ترقی اور کامیابی کی راہیں مسدود۔ جیسا کہ انھوں نے خود "دست تہ سنگ آمدہ" کے عنوان سے جو نظم تحریر کی اسمیں غالب کا شعر نقل کیا کہ

"مجبوری و دعوئ گرفتاری الفت
دست تہ سنگ آمدہ پیمان وفا ہے"

ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ فیض نے غالب کے اسی شعر سے متاثر ہو کر اپنے مجموعہ کا عنوان "دست تہ سنگ" رکھا۔ زنداں نامہ کی تصنیف ۱۹۵۶ء میں ختم ہوئی۔ اس کے بعد کی غزلیں اور نظمیں دست تہ سنگ کے عنوان سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئیں۔ یہ اس دور کا کلام ہے جب فیض کو طرح طرح کی مشکلات اور صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن وہ رسے جواں مرد با زنداں ہونے کے باوجود اپنی جواں مردی اور استقامت سے کام لیتا ہوا لوگوں کے ذہن کے تاروں کو اس طرح جھنجھوڑتا رہا جو شاید کبھی پہلے نہ سنا گیا نہ دیکھا گیا۔ اس مجموعے کے مقدمہ کے سلسلے میں فیض

نے خود کہا ہے کہ :۔

" زنداں نامے کے بعد کا زمانہ کچھ ذہنی افراتفری کا زمانہ ہے جس میں اپنا اخباری پیشہ چھوٹا، ایک بار پھر جیل خانے گئے۔ مارشل لا کا دور آیا، اور ذہنی اور گرد و پیش کی فضا میں پھر سے کچھ انسدادِ راہ اور کچھ نئی راہوں کی طلب کا احساس پیدا ہوا۔ اس سکوت اور انتظار کی آئینہ دار ایک نظم ہے " شام " اور ایک نامکمل غزل کے چند اشعار " [1]۔

کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہوگی
سنتے تھے وہ آئیں گے سنتے تھے سحر ہوگی

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جب جب ظلم و جبر و استبداد کے بادل گہرائے ہیں تو یوں بھی ہوا ہے کہ پھر ایسے کچھ افراد و فنکار بھی ابھرے ہیں جنھوں نے زمانے سے ہار نہیں مانی بلکہ اسے سمجھا اور اسے روشنی بخشی اور شعر و ادب کے فن پاروں کو ابھرائے رکھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ فارسی کا شاندار رومانوی ادب (جس کا بے کراں اثر اردو ادب نے قبول کیا ہے۔) چنگیز اور ہلاکو کی انسانیت سوز بربریت کے عہد میں ہی وجود میں آیا۔ وہی بات کم و بیش ہمارے شاعر فیض کے ساتھ بھی نظر آتی ہے۔ جب

---

[1] دستِ تہِ سنگ مکتبہ کاروان کچہری روڈ لاہور صفحہ ۲۶

ہم دست تہ سنگ کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں تو ہم بہ آسانی کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان کا یہ مجموعہ اپنے پہلے کے تینوں مجموعوں سے ہر اعتبار سے نہ صرف بہتر ہے بلکہ پوری آب وتاب اور سج دھج سے آراستہ ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر معین الدین عقیل رقمطراز ہیں۔

"کلام کا یہ مجموعہ پہلے تین مجموعوں کے مقابلے میں اپنی سج دھج، نفس مضمون، جمالیاتی کیفیت اور تاثر کے اعتبار سے قدرے مشترک اور قدرے مختلف ہے۔ اس مختصر لیکن وسیع دنیا میں وہ سب کچھ بھی موجود ہے جو دوسرے مجموعوں میں ملتا ہے اور وہ بھی جو دوسروں میں نہیں ملتا۔ اس کی قدر مشترک فیضؔ کی شخصیت اور ان کا احساس ہے جو ہر مجموعے میں اپنا اظہار قریب قریب یکساں طور پر کرتا رہا ہے اور یہ فرق میری نظر میں ایک نیا پن ہے جو عمر، تجربہ اور خود اس عہد کی نوعیت کے سبب ہے، جس کے پس منظر میں فیضؔ نے یہ غزلیں تخلیق کیں[1]۔"

اس مجموعے میں بھی فیضؔ رومان و حقیقت جستجو و آرزو کے علمبردار نظر آتے ہیں جیسا کہ ڈاکٹر تونسوی کی کتاب میں ہم دیکھتے ہیں کہ۔

---

[1] فن اور شخصیت فیضؔ نمبر بمبئی صفحہ ۲۶۴

" فیض کے لئے زنداں نامہ کے بعد کا زمانہ کچھ افراتفری کا زمانہ ہے جس میں ان کا اخباری پیشہ چھوٹا، ایک بار پھر سے کچھ انسدادِ راہ اور کچھ ہی راہوں کی طلب کا احساس پیدا ہوا۔ اس سکوت اور انتظار کا آئینہ دار ان کا چوتھا شعری مجموعہ دست تہہ سنگ ہے۔ اپنے اس پس منظر میں فیض کی شاعری کا اصل قابل لحاظ عنصر رومان و حقیقت اور جستجو آرزو کی وہ کیفیت ہے جو شاعر کے قلب اور روح میں جاگزیں ہے۔ اس کی شخصیت سالم نہیں رہی اس میں انقسام و انتشار پیدا ہو رہا ہے۔ بلکہ یہ چیز تو پہلے بھی بڑی شدومد سے اپنا اظہار کرتی رہی ہے۔ اب محرومیوں اور نا آسودگیوں نے اس کے دل کو حشر آرزو بنا دیا ہے۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ ذہنوں میں رومان و انقلاب کا امتزاج ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ فیض اس امتزاج کش مکش کی کیفیات و احساسات کو اپنے خاص اسلوب میں بیان کر رہے ہیں پہلی صورت باعث تسکین ہے تو دوسری نجات کے لئے مزدوری عقل دار کی طرف بلاتی تھی تو دل کوچۂ جاناں کا مکیں تھا۔ فیض کے اجتماعی شعور میں الجھن اور اختلاف کا سرچشمہ ان کے نصب العین کی مادیت ہی ہے۔ ان کے پیش نظر زندگی کا منتہائے

مقصود جسم کی راحت اور حواس کی تسکین رہا ہے۔ چنانچہ انقلاب اسی رومانی مقصد کے حصول کا وسیلہ ہے۔ غمِ روزگار وصالِ محبوب کی راہ میں رقیب بن کر حائل ہو گیا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے جس فن کارانہ چابکدستی سے عشقیہ واردات کو دوسرے اہم سماجی مسائل سے متعلق کرکے پیش کیا، یہ اردو کی عشقیہ شاعری میں بالکل نئی اور منفرد مثال ہے۔ نئی اور مستحسن بھی "[1]

مندرجہ بالا پس منظر کے تحت اب ہم دستِ تہہ سنگ کی غزلوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ یہاں ایک بات کی طرف اشارہ کرنا بے جا نہ ہوگا کہ زیادہ تر ناقدین نے اس مجموعے میں غزلوں کی کل تعداد گیارہ بتائی ہے۔ جس میں ڈاکٹر معین الدین عقیل بھی شامل ہیں۔ لیکن راقم السطور کی ناقص رائے میں اس مجموعے میں غزلوں کی کل تعداد تیرہ ہے۔ کیونکہ اس مجموعے میں بھی وہ غزل جس کا مطلع ہے۔

تیری امید ترا انتظار جب سے ہے
نہ شب کو دن سے شکایت، نہ دن کو شب سے ہے

---

[1] فیض کی تخلیقی شخصیت ڈاکٹر طاہر تونسوی صفحہ ۲۷۲-۲۷۳

شامل ہے جبکہ زنداں نامہ میں بھی یہی پوری غزل شامل ہے۔ اس کی سنہ اشاعت ۱۹۵۷ء ہے اس لئے اس مجموعے میں شامل کئے جانے کی درستگی کے قوی امکانات ہیں۔ غزلوں کی فہرست حسب ذیل ہے۔

نمبر شمار	غزل کا پہلا مصرعہ	ردیف	تعداد اشعار
(۱)	بساطِ رقص پہ صد شرق و غرب سے سرِ شام	م	۳
(۲)	جنوں کی یاد مناؤ کہ جشن کا دن ہے	ے	۶
(۳)	جمے گی کیسے بساطِ یاراں کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں	ن	۵
(۴)	بے دم ہوئے بیمار دوا کیوں نہیں دیتے	ے	۶
(۵)	یہ جفائے غم کا چارہ، وہ نجاتِ دل کا عالم	م	۵
(۶)	ترے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے	ے	۵
(۷)	کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہوگی	ی	۵
(۸)	آج یوں موج در موج غم تھم گیا اس طرح غمزدوں کو قرار آگیا	ا	۶
(۹)	یک بیک شورشِ فغاں کی طرح	ح	۶
(۱۰)	نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا	ا	۵
(۱۱)	تری امید ترا انتظار جب سے ہے	ے	۵
(۱۲)	ہر سمت پریشاں تری آمد کے قرینے	ے	۵
(۱۳)	شرحِ فراق مدحِ لبِ مشکبو کریں	ن	۷

جیسا کہ پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ فیض کی غزلوں کا محور رومان اور رومانیت ہے، جسے انھوں نے اپنی فکر اور فن کے ذریعہ نہایت زیبائی خوش اسلوبی اور چابکدستی سے نظم کیا ہے اور اسے رنگین تر بنانے کے لئے وہ کبھی کبھی وطن دوستی، انقلاب اور ترقی پسندانہ افکار کو بھی اس میں بہت سلیقے اور خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کرتے ہیں جس سے ان کی غزلیں رومانیت اور انقلاب کا ایک حسین پیکر نظر آتی ہیں۔ اس بناء پر ہم بہ آسانی کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ دور میں محبوب کی دلفریب اداؤں کی تصویر کشی جس کیف و لطافت کے ساتھ ان کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ ان کے ہم عصروں میں یہ خصوصیت مفقود و ناپید ہے۔ لہٰذا یہ کہنے میں مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ اردو شاعری کی عشقیہ روایت کے تنہا محافظ و امین ہیں۔ پہلی غزل میں صنائع لفظی اور استعارہ کی حسین اندائیگی کس مہارت اور کمال سے کرتے ہیں۔

بساطِ رقص پہ صد شرق و غرب سے سرِ شام
دمک رہا ہے تری دوستی کا ماہِ تمام
چھلک رہی ہے ترے حسنِ مہرباں کی شراب
بھرا ہوا ہے لبالب ہر اک نگاہ کا جامؔ

سلہ نسخہ ھائے وفا : صفحہ : ۳۲۲

اسی غزل کے اگلے شعر میں انھوں نے اپنی انقلابی فکر کو رومانی مقصد کے حصول کا وسیلہ قرار دیا ہے کیونکہ انھیں غم روزگار وصال یار کی راہ میں رقیب نظر آتا ہے۔ اس اہم سماجی مسئلہ کو انھوں نے جس مہارت اور چابکدستی سے بیان کیا ہے حقیقت میں قابل داد ہے۔

گلے میں تنگ ترے حرفِ لطف کی باہیں
پسِ خیال کہیں ساعتِ سفر کا پیام

کچھ بھی ہو کتنے خراب حالات ہوں فیض امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے مشکل ترین حالات میں بھی زندگی کو خوشگوار بنانے کی تمنا کرتے ہیں غالباً اقبال کا شعر

دل مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

ان کے دل و دماغ میں رچا بسا ہے۔ جس کی وجہ سے ہمیشہ وہ زندہ رہنے کی آرزو دلوں میں پیدا کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں لہجے کی بلند آہنگی پائی جاتی ہے جس سے وہ کشمکش و مسائل حیات سے نبرد آزمائی کرتے نظر آتے ہیں۔

جنوں کی یاد مناؤ کہ جشن کا دن ہے
صلیب و دار سجاؤ کہ جشن کا دن ہے
طرب کی بزم ہے بدلو دلوں کے پیراہن
جگر کے چاک سلاؤ کہ جشن کا دن ہے
وہ شورشِ غمِ دل جس کی لے نہیں کوئی
غزل کی دھن میں سناؤ کہ جشن کا دن ہے[1]

مسائلِ حیات سے نبرد آزمائی کرتے کرتے کہہ اٹھتے ہیں:۔
سجے گی کیسے بساطِ یاراں کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں
سجے گی کیسے شبِ نگاراں کہ دل سرِ شام بجھ گئے ہیں

وہ تیرگی ہے رہِ بتاں میں چراغِ رخ ہے نہ شمعِ وعدہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب در و بام بجھ گئے ہیں[2]

ہر دل عزیز وطن کی زبوں حالی پر کس قدر اظہار افسوس کرتے ہیں۔ اور انھیں

۱۔ نسخہ ہائے وفا : صفحہ : ۳۲۴
۲۔ نسخہ ہائے وفا : صفحہ : ۳۲۹

جمہوریت اور جمہوریت کے تقاضے مٹتے نظر آرہے ہیں اور جب انھیں جمہوریت کی معمولی سے معمولی مراعات بھی مٹتی نظر آتی ہے تو ان کے پیش نظر وہ کہہ اٹھتے ہیں ۔

بہت سنبھالا وفا کا پیماں مگر وہ برسی ہے اب کے برکھا
ہر اک اقرار مٹ گیا ہے تمام پیغام بجھ گئے ہیں

قریب آئے یہ شب غم، نظر پہ کھلتا نہیں کچھ اس دم
کہ دل پہ کس کس کا نقش باقی ہے، کون سے نام بجھ گئے ہیں

شاعر کا دل اسی درد و کرب میں مبتلا ہے ۔ ہر چند راہ نجات تلاش کرتا ہے جب کچھ نظر نہیں آتا تو طنز کو اپنا آلہ کار بناتا ہے ۔

بے دم ہوئے بیمار دوا کیوں نہیں دیتے
تم اچھے مسیحا ہو شفا کیوں نہیں دیتے
مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کروگے
منصف ہو تو اب حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے

مله نسخہ ہائے وفا : صفحہ : ۳۲۹

ہاں نکتہ ورو لاؤ لب و دل کی گواہی
ہاں نغمہ گرو ساز صدا کیوں نہیں دیتے[1]

علامتیں اشارے اور کنائے اردو شاعری کی جان ہیں فیض کے یہاں ان کا استعمال نہایت خوش اسلوبی اور نرالے پن سے ہوا ہے علامتیں قدیم سہی لیکن فیض نے انھیں نئے معانی اور مفہوم عطا کئے ہیں جس کی وجہ سے کلام کی چاشنی دو بالا ہو گئی ہے ۔ الفاظ کی ترکیب، بندش اور سوز و نیت مہارت کی داد دیتی نظر آ رہی ہیں ۔

یہ جفائے غم کا چارہ، وہ نجاتِ دل کا عالم
ترا حسن دستِ عیسیٰ، تری یاد روئے مریم
دل و جاں فدائے راہے کبھی آکے دیکھ ہمدم
سرِ کوئے دلفگاراں شبِ آرزو کا عالم
تری دید سے سوا ہے ترے شوق میں بہاراں
وہ چمن جہاں گری ہے ترے گیسوؤں کی شبنم[2]

---

[1] نسخہ ھائے وفا : صفحہ : ۳۳۵

[2] نسخہ ھائے وفا : صفحہ : ۳۴۰

دیکھئے مندرجہ ذیل اشعار تمام تر قدامت کے باوجود کس قدر نئے پن کا احساس دلاتے ہیں :-

یہ عجیب قیامتیں ہیں تری رہگزر میں گزراں
نہ ہوا کہ مر مٹیں ہم، نہ ہوا کہ جی اٹھیں ہم
لو سنی گئی ہماری، یوں پھرے ہیں دن کہ پھر سے
وہی گوشۂ قفس ہے، وہی فصلِ گل کا ماتم

فیض نے اپنے تجربات کو غزلوں میں نہایت ہی موزوں اور متوازن انداز میں پیش کیا ہے۔ جس سے ان کی غزلوں میں عجیب سا کیف پیدا ہو گیا ہے۔ اچھا شاعر وہی ہے جو موضوع کے اعتبار سے لہجہ و آہنگ کا استعمال کرے۔ فیض کے یہاں اس ضابطہ کی پابندی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ جس نے ان کی شاعری کو ایک مخصوص رنگ عطا کیا ہے:-

ترے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے
تری رہ میں کرتے تھے سر طلب، سرِ رہگزار چلے گئے
تری کج ادائی سے ہار کے شبِ انتظار چلی گئی
مرے ضبطِ حال سے روٹھ کر مرے غمگسار چلے گئے
یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سرِ رہ سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سرِ بزمِ یار چلے گئے

نہ رہا جنونِ رُخِ وفا، یہ رسن یہ دار کروگے کیا
جنھیں جرمِ عشق پہ ناز تھا وہ گناہ گار چلے گئے[1]

ایک دوسری غزل میں فیض کا رنگ تغزل دیکھئے کس خوبصورتی
سے انھوں نے اپنے خیالات کو پیش کیا ہے ۔

آج یوں موج در موج غم تھم گیا اسطرح غمزدوں کو قرار آگیا
جیسے خوشبوئے زلفِ بہار آگئی جیسے پیغامِ دیدارِ یار آگیا
رُت بدلنے لگی رنگِ دل دیکھنا، رنگِ گلشن سے اب حال کھلتا نہیں
زخم چھلکا کوئی یا کوئی گل کھِلا، اشک اُمڈے کہ ابرِ بہار آگیا[2]

فیض جب اپنی غزلوں میں انقلابی فکر کو سموتے ہیں تو ان کے لہجے میں بھی غضب کا انقلاب آجاتا ہے ۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ تغزل کی چاشنی اور غزل کی جملہ خصوصیات کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ۔ ملاحظہ کیجئے کس قدر خوبصورت اور دلکش انداز میں عشق اور انقلاب کی ملی جلی پیکر

---

[1] دستِ تہ سنگ : صفحہ : ۶۱

[2] دستِ تہ سنگ : صفحہ : ۷۰

تراشی کرتے ہیں۔

خونِ عشاق سے جام بھرنے لگے، دل سلگنے لگے، داغ جلنے لگے
محفلِ درد پھر رنگ پر آگئی، پھر شبِ آرزو پر نکھار آگیا

فیض کیا جانئے یار کس آس پر منتظر ہیں کہ لائے گا کوئی خبر
مے کشوں پر ہوا محتسب مہرباں، دلفگاروں پہ قاتل کو پیار آگیا[۱]

غزل کے حسین پیکر میں انقلابی فکر کی کشتی کو کسقدر ہوشیاری سے کھیتے ہوئے منزل کی طرف رواں دواں نظر آتے ہیں۔ جس میں غلامی سے نفرت نئے سماج اور نئے آدرشوں کی طرف رغبت کا جذبہ پنہاں ہے۔

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تنِ داغ داغ لٹا دیا
مرے چارہ گر کو نوید ہو صفِ دشمناں کو خبر کرو
جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

۱۔ دستِ تہِ سنگ : صفحہ : ۷۱
۲۔ دستِ تہِ سنگ : صفحہ : ۷۹

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا[1]

محبوب چاہے غالب کا ہو یا فیض کا اس کی ادائیں عاشق کے ساتھ ایک جیسی ہوتی ہیں دیکھئے اس کی تصویر کشی کس خوبصورت انداز میں کی ہے۔

ادھر ایک حرف کہ کشتنی یہاں لاکھ عذر تھا گفتنی
جو کہا تو سن کے اڑا دیا جو لکھا تو پڑھ کے مٹا دیا
جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا[2]

غم چاہے جیسا بھی ہو فیض اس کا تعلق اپنے محبوب وطن سے ہی گردانتے ہیں شاید وہ اس نکتہ کے پابند ہیں کہ

ع جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا

اسی وجہ سے وہ اپنے درد اور تکالیف کو محبوب سے ہی جوڑتے ہوئے کہہ اٹھتے ہیں۔

۱۔	دست تہ سنگ	: صفحہ	:	۷۹
۲۔	دست تہ سنگ	: صفحہ	:	۸۰

کسی کا درد ہو کرتے ہیں تیرے نام رقم
گلہ ہے جو بھی کسی سے ترے سبب سے ہے

جب سے عشق میں گرفتار ہوئے وہ ہر طرح کی مصیبتوں سے دوچار ہیں لیکن کسی بھی حال میں گلہ اور شکایت نہیں کرتے اسی وجہ سے کہتے ہیں

تری امید ترا انتظار جب سے ہے
نہ شب کو دن سے شکایت، نہ دن کو شب سے ہے
ہوا ہے جب سے دلِ ناصبور بے قابو
کلام تجھ سے نظر کو بڑے ادب سے ہے
کہاں گئے شبِ فرقت کے جاگنے والے
ستارۂ سحری، ہم کلام کب سے ہے[1]

اپنے محبوب (وطن) سے انھیں اتنی محبت ہے کہ ہر ہر قدم پر دچار بلا ہونے کے باوجود بھی رشتۂ محبت کو بے تعلق نہیں ہونے دیتے وطن سے دور لندن میں بیٹھے ہوئے بھی وطن کی ہی یاد میں غرق ہیں جب

---

[1] نسخہ ہائے وفا : صفحہ : ۳۶۶

کہ معلوم ہے کہ وہاں پہنچنے پر گرفتار بلا ہونے کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوگا۔ پھر بھی ان کے جذبات کا اندازہ ان اشعار سے ہوتا ہے۔

ہر منزلِ غربت پہ گماں ہوتا ہے گھر کا
بہلایا ہے ہر گام بہت در بدری نے
تھے بزم میں سب دود سرِ بزم سے شاداں
بیکار جلایا ہمیں روشن نظری نے
مے خانے میں عاجز ہوئے آزردہ دلی سے
مسجد کا نہ رکھا ہمیں آشفتہ سری نے[1]

دست تہہ سنگ کی غزلیں ان کے ندرت پسند خیالات سے پر ہیں کچھ بھی ہو جیسا انھوں نے اپنے اس مجموعے کی آخری غزل میں آتش کا شعر نقل کیا کہ :-

" تر دامنی پہ شیخ ، ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں "

---

[1] نسخہ ہائے وفا : صفحہ : ۳۷۰

جو حقیقت میں ان کی شخصیت کا مصداق ہے۔ جو بھی ہو جو الزامات ان پر رہے ہوں لیکن کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ انھیں وطن، سماج اور انسانیت کی فلاح و بہبود سے جو رشتۂ ناگسستنی تھا وہ قابلِ صد رشک و آفریں تھا۔

فیضؔ اسی عشق اور انقلاب کے دلکش امتزاج کے حسین پیکر کو سرِ وادیِ سینا تک پہنچاتے ہیں جس میں انھیں اپنے فن پر اس قدر اعتماد ہو چکا تھا کہ کہہ اٹھے:۔

اک سخن اور کہ پھر رنگِ تکلّم تیرا
حرفِ سادہ کو عنایت کرے اعجاز کا رنگ

سرِ وادیٔ سینا

فیض کے چاروں شعری مجموعے نقش فریادی، دست صبا، زنداں نامہ اور دست تہہ سنگ دراصل ان کی تخلیقی زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان مجموعوں کے نام سے ہی اندازہ ہوجاتا ہے کہ ان میں کسقدر کرب و بے چینی اور انقلابی احساسات بھرے ہوئے ہیں۔ یہ محض شعری احساسات کے ترجمان نہیں ہوسکتے بلکہ سماج اور سوسائٹی میں پھیلی ہوئی بدنظمی، جھنجھلاہٹ، تشدد، غم و الام کی سچی تصویریں ہیں۔ نقش فریادی سے سروادی سینا تک کا سفر جن دشوار گذار اور پُرخار راستوں سے گذرا ان کے مطالعہ کے بغیر جذباتی اور فکری تغیرات اور داخلی اور خارجی محرکات کی ہم آہنگی کو سمجھنا کوہ کنی سے کم نہیں۔ ان میں غم جاناں اور غم دوراں کا امتزاج زندگی کے نشیب و فراز کا نتیجہ ہے۔ یہی محرکات اور تجربات تھے جنھوں نے فیض کی شاعری کو مقبول خاص و عام کیا۔ جیسا کہ فیض نے خود دست صبا کے دیباچے میں لکھا ہے۔

"یوں کہئے کہ شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں، مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔ گرد و پیش کے مضطرب قطروں

کی بلند صلاحیتوں کا اعتبار دلاتا رہا۔ زیر بحث مجموعہ سروادی سینا میں انھوں نے اپنے نرالے پن کے انداز کے باوجود کسی بھی طرح قدیم روایت کی پابندی، علامات اور موضوعات کے استعمال سے انحراف و بغاوت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ بلکہ ان کی فکر میں اب پہلے سے بھی زیادہ پختگی اور توانائی پیدا ہو گئی۔ جس کی وجہ سے ان کی ہر غزل میں اعلیٰ شعور عمیق فکر اور ژرف نگاہی کا شدید احساس ہوتا ہے جیسا کہ شان الحق حقی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے۔

"فیض کی شاعرانہ شخصیت کی ترکیب جن عناصر سے ہوتی ہے، بلکہ جن عناصر سے اس میں وزن و وقار پیدا ہوتا ہے وہ اپنا زور دکھائے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کے شاعرانہ مذاق میں ہمارے تمام کلاسیکی ادب کا رنگ رچا ہوا ہے۔ اس لحاظ سے ان کی غزل کو اردو غزل کا خلاصہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ ان کی شاعرانہ شخصیت کا ایک وقیع رُخ بلکہ بنیادی رخ ہے وہ جذباتی طور پر روایت کی گرفت میں رہے ہیں اور فکری طور پر روایت سے آگے شاعرانہ تخلیق میں جذبات فکر پر حاوی رہتے ہیں۔ فیض نے ان میں خاصا توازن قائم رکھا ہے"[1]۔

---

[1] فن اور شخصیت فیض نمبر صفحہ ۲۷۳

فیض کے یہاں اقبال کی طرح ایک نظریۂ حیات، ایک مقصد اور ایک لگن ہے۔ جسے انھوں نے اپنے کلام میں اس طرح پیش کیا کہ یہ خصوصیات ان کے کلام کی روح بن گئی ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ فیض کا کلام ادب برائے حیات اور زندگی کا نمونہ پیش کرتا ہے تو یقیناً ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کا کلام اس سلسلے میں ایک مثالی نمونہ اور آدرش ہے۔ شان الحق حقی اپنے ایک مضمون "سرداری سینا کی غزلیں" میں لکھتے ہیں۔

"یہ ایک عجیب مثال ہے، لیکن ضروری نہیں کہ دوسروں کیلئے لائق تقلید بھی ہو، یعنی شاعر ہر ہر سانس میں تبلیغ کرے، ہر ہر آن ایک ہی کیفیت میں مبتلا رہے۔ یہ پیغمبری کا درجہ ہے اور شاعری پیغمبری کا صرف ایک جزو ہے۔ میں تو ذاتی طور پر وسیع النظری کو شاعری کی سب سے بڑی اور لازمی خصوصیت کہتا ہوں۔ وہ اپنے فکر اور تخیل کو محدود محصور نہ کرے، شعوری طور پر وہ کسی ایک نظامِ فکر کا پیرو ہو سکتا ہے، دوسرے باشعور انسانوں کی طرح وہ بھی کسی سیاسی گروہ سے منسلک ہو سکتا ہے۔ مگر ہم اس سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیا لکھے اور کیا نہ لکھے۔ وہ چاہے تو پرچار اور پکار بھی کرے، یا صرف گائے اور گنگنائے۔ ایک سچی آمد ہزار

آورد ہے۔ بہتر ہے۔ اب یہ ذاتی ترجیح کا معاملہ ہے کہ میرے نزدیک اس دور میں کوئی اچھا اور سچا شاعر غیر ترقی پسند نہیں ہو سکتا یا کم از کم میں اسے پسند نہیں کروں گا جو شاعری زندگی کی راہ کا روڑا بنے گی، پسندیدہ نہ ٹھہرے گی بلکہ وہ سچی شاعری ہو ہی نہیں سکتی۔ فیض کی شاعری اچھی اور سچی شاعری کی مثال ہے۔ سر وادیِ سینا کی غزلیں اس کی گواہ ہیں۔"[1]

فیض کی غزلوں (خاص طور سے سر وادیِ سینا) کی خصوصیت ہے کہ یہ شعوری کاوش سے تعلق نہیں رکھتیں بلکہ ان میں غضب کی آمد ہے۔ کہیں کہیں آورد کی کچھ کمی کھٹک سکتی ہے۔ لیکن اس طرح نہیں کہ قاری کے ذہن پر بار بنے۔ فیض نے اس مجموعے میں تشبیہ و استعارہ اور نئی ترکیبوں کا استعمال اس قدر مہارت اور چابکدستی سے کیا ہے جو بہت کم شعراء کو نصیب ہو سکتی ہے۔ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ رمز و کنایہ کی مدد سے وہ قاری کے جمالیاتی ذوق کو آسودگی بخشنا چاہتے ہیں۔

سر وادیِ سینا کی غزلوں کا تجزیہ کرنے سے قبل غزلوں کی فہرست دینا مناسب سمجھوں گا کیونکہ ان کی تعداد میں قدرے اختلاف ہے شان الحق حقی نے اس مجموعہ میں غزلوں کی کل تعداد چھ (۶) بتائی ہے۔ لکھتے ہیں۔

۱۔ فن اور شخصیت فیض نمبر صفحہ ۲۷۴

"سر وادیِ سینا" میں فیض کی چھ غزلیں شامل ہیں۔ ان میں سے چار میری معلومات کی حد تک نئی زمینوں میں ہیں، دو پرانی زمینوں میں۔ ان چھ غزلوں میں کل ۲۷ اشعار ہیں۔ یعنی دو میں چھ چھ اشعار، دو میں پانچ پانچ ایک میں سات اور ایک میں آٹھ۔ یہ تین غزلیں مطلع اور مقطع سمیت بالکل مکمل ہیں۔ باقی میں مقطع نہیں۔ مطلع سب میں موجود ہے ایک آٹھ اشعار کی غزل میں چھ مطلع ہیں۔ تکنیکی اعتبار سے یہ تین غزلیں بے ڈول کہی جائیں گی۔ لیکن اس تکنیکی شرط کو پہلے بھی شاعروں نے پابندی سے نہیں نبایا، اور اب تو یہ شرط سرے سے اٹھ ہی گئی ہے۔"[1]

ڈاکٹر معین الدین عقیل نے غزلوں کی تعداد سات بتائی ہے۔ راقم السطور کی ناقص رائے میں غزلوں کی تعداد نو ۹ ہے کیونکہ مندرجہ بالا اشعار یہ ہیں "اب بزم سخن صحبت لب سوختگاں ہے" اور "کہیں تو کاروانِ درد کی منزل ٹھہر جائے" غزل کی فہرست میں شامل نہیں ہے۔ جبکہ میری نظر میں یہ ہیت، ساخت اور جذبات و خیالات کے اعتبار سے غزل ہی ہیں۔ ان غزلوں کی فہرست حسب ذیل ہے۔

نمبر شمار (۱)	غزل کا پہلا مصرعہ (۲)	ردیف (۳)	تعداد اشعار (۴)
(۱)	یوں سجا چاند کہ جھلکا ترے انداز کا رنگ	گ	۵
(۲)	کس حرف پہ تو نے گوشۂ لب اے جانِ جہاں غماز کیا	ا	۵

[1] فن اور شخصیت فیض نمبر صفحہ ۲۷۲

(۱)	(۲)	(۳)	(۴)
(۳)	اب بزمِ سخن صحبتِ لب سوختگاں ہے	ے	۶
(۴)	کیے آرزو سے پیماں جو مآل تک نہ پہنچے	ے	۶
(۵)	نہ کسی پہ زخم عیاں کوئی، نہ کسی کو فکر رفو کی ہے	ے	۵
(۶)	طوفاں بہ دل ہے ہر کوئی دلدار دیکھنا	ا	۸
(۷)	شرحِ بے دردیِ حالات نہ ہونے پائی	ی	۷
(۸)	ہم سادہ ہی ایسے تھے کی یوں ہی پذیرائی	ی	۵
(۹)	کہیں تو کاروانِ درد کی منزل ٹھہر جائے	ے	۶

اب غزلوں کا تجزیہ پیشِ خدمت ہے۔

فیض کے دوسرے مجموعوں کی طرح سرِ وادیِ سینا کی غزلیں بھی مختلف پہلو کی حامل ہیں۔ جو ہر اعتبار سے جامع اور مکمل ہیں۔ ان میں مجموعی طور پر ایک خاص تاثر پایا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ غزلیں بھی منفرد لب و لہجہ کی حامل ہو گئی ہیں۔ اس مجموعے کی غزلوں کا بھی بنیادی مرکز وہی عشق ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ فیض کا عشق عام شعراء سے بہت مختلف ہے۔ کیونکہ ان کا عشق سماجی مسائل کا عکاس ہے یہ سچ ہے کہ ایک فرد کی ذات پوری سماجی زندگی کے مقابلے میں نہایت حقیر ہوتی ہے لیکن فیض نے اپنے سینے میں

جو درد چھپا رکھا ہے اسے وہ عوام تک پہنچانا چاہتے ہیں تاکہ عوام اس سے مستفیض ہو کر ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکیں۔ اس سلسلے میں جیسا کہ پہلے کہا گیا وہ کشمکش اور دشواریوں سے ہمیشہ نبرد آزما رہے ہیں اور کبھی بھی امید کا دامن نہیں چھوڑا۔ جہاں کہیں مایوسی کا اندیشہ ہوتا ہے وہاں وہ امید اور رجائیت کا سہارا لے کر اپنی نوا کو تیز تر بنا دیتے ہیں چنانچہ اس مجموعے کی پہلی غزل سے ہی ان کے مخصوص لب و لہجہ اور آہنگ کا اندازہ ہو جاتا ہے کہتے ہیں۔

یوں سجا چاند کہ جھلکا ترے انداز کا رنگ
یوں فضا مہکی کہ بدلا مرے ہمراز کا رنگ
سایۂ چشم میں حیراں رخِ روشن کا جمال
سرخیٔ لب میں پریشاں تری آواز کا رنگ
بے پیے ہوں کہ اگر لطف کرو آخرِ شب
شیشۂ مے میں ڈھلے صبح کے آغاز کا رنگ
چنگ و نے رنگ پہ تھے، اپنے لہو کے دم سے
دل کی لے بدلی تو مدھم ہوا ہر ساز کا رنگ[1]

---

[1] سرِ وادیٔ سینا — فیض احمد فیضؔ — صفحہ ۳۸

فیض کی غزلوں کا ایک اہم پہلو جس نے انھیں ایک مخصوص لب و لہجہ آہنگ اور انفرادیت عطا کی ان کی انقلابی فکر ہے چونکہ وہ انسانیت کے علمبردار تھے۔ لہٰذا ان کی انسان دوست فکر نہ صرف ملک کی ابتری کا دونا روتی تھی بلکہ دنیا میں جہاں کہیں بھی کمزور اور نادار ستائے جاتے تھے ان کی حساس طبیعت چیخ اٹھتی تھی۔ یہ بات ان کی نظموں تک محدود نہیں غزلوں میں بھی اس کا ترشح ہوتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں فیض نے ظلم و تشدد کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے مجاہدوں کی شہادت کو کس قدر خوبصورت اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔

کس حرف پہ تو نے گوشۂ لب اے جانِ جہاں غماز کیا
اعلانِ جنوں دل والوں نے اب کے بہ ہزار انداز کیا
سو پیکاں تھے پیوستِ گلو، جب چھیڑی شوق کی لے ہم نے
سو تیر ترازو تھے دل میں جب ہم نے رقص آغاز کیا

دیکھئے کوئے صنم پر کس قدر بےباکی اور جراءت مندی سے نظارۂ بام کرتے ہیں جو یقیناً ان کی انقلابی فکر اور جدید تصورِ عشق کی وضاحت کرتے ہیں۔

بے حرص و ہوا، بے خوف و خطر، اس ہاتھ پہ سر، اس کف پہ جگر
یوں کوئے صنم میں وقتِ سفر نظارۂ بامِ ناز کیا

جس خاک میں مل کر خاک ہوئے وہ سرمۂ چشمِ خلق بنی
جس خار پہ ہم نے خوں چھڑکا، ہم رنگِ گلِ طنّاز کیا
لو وصل کی ساعت آ پہنچی، پھر حکمِ حضوری پر ہم نے
آنکھوں کے دریچے بند کئے اور سینے کا در باز کیا [۱]

مختصر یہ مندرجہ بالا غزل دنیائے وطن کے موضوع پر ایک انوکھی اور نرالی ہیئت کی حامل ہے جس میں نہ صرف الفاظ کی بندش اور ترکیب سے کام لیا گیا ہے بلکہ عاشقانہ سپردگی، درویشانہ سرمستی اور مجاہدانہ جذبات کو غزل کے قالب میں ڈھال دیا گیا جس کی مثال شاید اس سے بہتر کہیں نہ مل سکے۔

اپنی تمام تر انفرادیت اور جدیدیت کے باوجود فیض کی غزلوں میں کلاسیکی انداز خاصا نمایاں ہے۔ جو نقشِ فریادی سے شروع ہوتا ہے اور ترقی کے مدارج طے کرتا ہوا سرِ وادیِ سینا میں اوجِ کمال پر نظر آتا ہے۔ مثلاً:-

اب بزمِ سخن صحبتِ لب سوختگاں ہے
اب حلقۂ مے طائفۂ بے طلباں ہے
پیوندِ رہِ کوچۂ زر چشمِ غزالاں
پابوسِ ہوس افسرِ شمشاد قداں ہے [۱]

۱؎ سرِ وادیِ سینا صفحہ ۴۷

کوئی آرزو سے پیماں جو مآل تک نہ پہنچے
شب وروز آشنائی مہ وسال تک نہ پہنچے
وہ نظر بہم نہ پہنچی کہ محیطِ حسن کرتے
تیری دید کے وسیلے خد و خال تک نہ پہنچے[1]

نہ یہ غم نیا، نہ ستم نیا، کہ تری جفا کا گلا کریں
یہ نظر تھی پہلے بھی مضطرب، یہ کسک تو دل میں کبھو کی ہے[2]

دوسرے مجموعوں کی طرح اس مجموعے میں بھی کہیں کہیں طنز کی شدت پائی جاتی ہے۔ مثلاً

اب صاحبِ انصاف ہے خود طالبِ انصاف
مہر اس کی ہے میزان بہ دستِ دگراں ہے[3]

خالی ہیں گرچہ مسند و منبر نگوں ہے خلق
رُعبِ قبا و ہیبتِ دستار دیکھنا[4]

---

[1]	سرِ وادیِ سینا	:	صفحہ ۵۰
[2]	سرِ وادیِ سینا	:	صفحہ ۵۸
[3]	سرِ وادیِ سینا	:	صفحہ ۴۸
[4]	سرِ وادیِ سینا	:	صفحہ ۶۹

شاعر کے لئے داخلی اور خارجی غم ہی تخلیق کا محرک بنتا ہے۔ فیض کے یہاں دونوں ہی غم کار فرماں نظر آتے ہیں۔ کیونکہ ان کا غم، غمِ جاناں سے گذر کر غمِ دوراں بن گیا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ انسان اور انسانیت کے زخموں کا مداوا چاہتے ہیں۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی غزلیں اپنے عہد کے درد و کرب کی آئینہ دار ہیں۔ جیسا کہ پروفیسر ممتاز حسین کا کہنا ہے کہ:۔

"دکھ سکھ کے نغمے خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی کب اور کس نے نہیں گائے ہیں پھر بھی وہ نئے سے نئے معلوم ہوتے ہیں۔ بشرطیکہ ان کی تخلیق میں اس عہد کے دکھ سکھ کی انفرادیت کا بھی اظہار ہو۔ فیض کی شاعری نے جو ہمیں اس قدر مسحور کر دکھا ہے۔ اس میں جہاں اس عنصر کو دخل ہے وہاں اس بات کو بھی دخل ہے کہ اس کے اظہارِ غم، لذت کشی چشم و گوش، انبساطِ دیدۂ و دل اور آشوب آگہی میں جدید ذہن اور جدید کلچر کی جلوہ آرائیاں بھی شامل ہیں"۔[1]

اب فیض کی غزلوں سے ہی فیصلہ کیجئے:۔

نہ کسی پہ زخم عیاں کوئی، نہ کسی کو فکر رفو کی ہے
نہ کرم ہے ہم پہ حبیب کا، نہ نگاہ ہم پہ عدو کی ہے

---

[1] فیض ایک جائزہ۔ صفحہ ۱۵۰

صفِ زاہداں ہے تو بے یقیں، صفِ میکشاں ہے تو بے طلب
نہ وہ صبح درد و وضو کی ہے، نہ وہ شام جام و سبو کی ہے

کفِ باغباں پہ بہارِ گل کا ہے قرض پہلے سے بیشتر
کہ ہر ایک پھول کے پیرہن، میں نمود میرے لہو کی ہے

نہیں خوفِ روزِ سیہ ہمیں، کہ ہے فیضؔ ظرفِ نگاہ میں
ابھی گوشہ گیر وہ اک کرن، جو لگن اس آئینہ رو کی ہے[1]

دوسری غزل میں عشق کے جذبے کو کس نئے انداز میں پیش کرتے ہیں:۔

پھر وہ پروانے جنھیں اذنِ شہادت نہ ملا
پھر وہ شمعیں کہ جنھیں رات نہ ہونے پائی

پھر وہی جاں بلبی لذّتِ مے سے پہلے
پھر وہ محفل جو خرابات نہ ہونے پائی

پھر وہاں بابِ اثر جانئے کب بند ہوا
پھر یہاں ختم مناجات نہ ہونے پائی

فیضؔ سر پر جو ہر اک روز قیامت گزری
ایک بھی روزِ مکافات نہ ہونے پائی[2]

۱۔ سرِ وادیٔ سینا : صفحہ ۵۸
۲۔ سرِ وادیٔ سینا : صفحہ ۱۰۱، ۱۰۲

اردو کے اہم شعراء کا خاصہ رہا ہے کہ وہ کبھی کبھی عاشق کو بہت ہی بھولا اور معصوم پیش کرتے ہیں۔ گویا اسے دنیا کے مکروفریب اور چال پیچ سے کسی بھی طرح آشنائی نہیں۔ اس کیفیت کو فیض نے نہایت ہی سادہ، سلیس اور رواں انداز میں پیش کیا ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ واردات و کیفیاتِ عشق و روزگار کے بیان میں قدرت کاملہ رکھتے تھے۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہم سادہ ہی ایسے تھے کی یوں ہی پذیرائی
جس بار خزاں آئی، سمجھے کہ بہار آئی
آشوبِ نظر سے کی ہم نے چمن آرائی
جو شے بھی نظر آئی، گل رنگ نظر آئی
امیدِ تلطف میں رنجیدہ رہے دونوں
تو اور تری محفل، میں اور مری تنہائی

اس مجموعے کی آخری غزل :-

کہیں تو کاروانِ درد کی منزل ٹھہر جائے
کنارے آلگے عمرِ رواں یا دل ٹھہر جائے

سلہ سرِ وادیٔ سینا : صفحہ ۱۰۷

کے متعلق ناقدین کی عام رائے یہ ہے کہ یہ غزل نہیں ہے کیونکہ کسی نے غزل کی فہرست میں نہیں شامل کیا۔ شاید لوگوں کو "غبارِ خاطرِ محفل ٹھہر جائے" کا عنوان دینے سے مغالطہ ہو گیا ہے۔ راقم السطور کی ناقص رائے کے مطابق یہ غزل ہے۔ کیونکہ اس کی ہیئت اور جذبات غزل کے ہیں۔ اس غزل کا موضوع تو عام سا ہے لیکن انداز بالکل نرالا ہے، اور غزل کا مخصوص تیکھا پن بھی اس میں بھرپور پایا جاتا ہے۔ جس سے فیض کی انفرادیت جھلکتی ہے،

رماں کیسی کہ موجِ خوں ابھی سر سے نہیں گزری
گزر جائے تو شاید بازوئے قاتل ٹھہر جائے
خمِ ساقی میں جز زہرِ ہلاہل کچھ نہیں باقی
جو ہو محفل میں اس اکرام کے قابل ٹھہر جائے
ہماری خامشی بس دل سے لب تک ایک وقفہ ہے
یہ طوفاں ہے جو پل بھر برلبِ ساحل ٹھہر جائے[1]

سرِ وادیِ سینا کی غزلوں کا تجزیہ کرنے کے بعد ہم بہ آسانی کہہ سکتے ہیں کہ اس مجموعے کی غزلوں میں فیض کا وہی انداز وہی لہجہ اور وہی آہنگ موجود ہے

---

[1] نسخہ ہائے وفا سرِ وادیِ سینا صفحہ 91

جس نے انھیں ہر دل عزیز بنا دیا۔ بقول پروفسر احتشام حسین۔

"فیض پڑھنے والے کو اتنی جہات سے متاثر کرتے ہیں کہ اس کے تعصبات کا دائرہ بالکل تنگ ہو جاتا ہے اور اگر وہ ان کی ایک بات کو نا پسند کرتا ہے تو دوسری بات کو پسند کرتا ہے، اگر ایک خیال سے اختلاف ہوتا ہے تو دوسرا اپنے ذہن اور دل کی آواز معلوم ہونے لگتا ہے [1]......"

اختصار کے ساتھ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سروادی سینا کی غزلیں بھی اپنی جملہ خصوصیات کے ساتھ فیض کی روشن خیالی اور وسیع النظری کی عکاس ہیں۔

ہم نے جیسا پہلے کہا کہ فیض امید اور رجا کو ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے رہے ہیں لہٰذا وہ کبھی بھی کسی بھی حال میں دشواریوں اور پریشانیوں سے مایوس نہیں ہوتے بلکہ اپنے پیام کو ہر حال میں عوام تک پہنچانا چاہتے ہیں اسی نظریہ کے تحت انھوں نے اپنے کاروانِ شاعری کو رواں دواں رکھا اور "شامِ شہرِ یاراں" کی تصنیف تک پہنچے جس کے لئے غالباً اقبال کا شعر:-

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں

ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

مشعلِ راہ بنا جسے انھوں نے اپنے مجموعے کے آغاز میں لکھا بھی ہے۔

---

[1] افکار کراچی فیض نمبر صفحہ ۳۰۴

شامِ شہریاراں

نقشِ فریادی سے سرِ وادیِ سینا تک کا کلام جذباتی اور ذہنی تغیرات اور داخلی اور خارجی محرکات کا ایک حسین مرقع ہے ۱۹۵۹ء کے بعد فیض کی زندگی میں ایک نیا موڑ رونما ہوا اب انھیں جیل کی صعوبتوں سے چھٹکارا مل چکا تھا اور حکومت شاید اپنے کردہ گناہوں کی پاداش میں ان سے معذرت کی طلب گار تھی ۔ لیکن فیض نے اپنے اصولوں اور نظریات سے کبھی بھی گریز نہیں کی ۔ اگرچہ شامِ شہرِ یاراں میں اس دور کی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں جبکہ فیض زنجیر بکف تھے نہ بندِ بیاں ان کے ساتھ محض زندانِ رہِ یار کی یادیں کی ذہنی کیفیت بھی کسی قدر پُر سکون تھی ۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ فیض کے اس مجموعے میں انتشار و ہیجان کی وہ کیفیت نہیں جو ان کے پہلے کے مجموعوں میں ہے ۔ یہ امر مسلم ہے کہ تخلیقی ادب اور شعر انتشار اور ہیجان کے دور میں اپنے نقطۂ عروج پر رہتا ہے ۔ غالباً فیض بھی اس حقیقت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے کیونکہ شامِ شہرِ یاراں میں ہر طرح کے لغوی اور معنوی اوصاف تو پائے جاتے ہیں لیکن ہیجان آفریں اور دلوں کو گرمانے والے خیالات کی کمی اور تشنگی کا احساس ہوتا ہے ۔ اس سے کسی طرح کا مغالطہ نہیں ہونا چاہیئے کہ ان کا یہ

مجموعہ دوسرے مجموعوں سے کسی طرح پست اور کم اہمیت والا ہے۔ چونکہ فیض سماج، سیاست اور انسانی زندگی کے اونچ نیچ کے نبض شناس تھے اس لئے اس مجموعے میں انھوں نے اس طرح کا انداز اپنایا جس سے کسی بھی طرح خلل نہ پیدا ہو کیونکہ اب ضرورت تھی ملک کو اخوت، محبت، برابری اور بھائی چارگی کی جس سے ملک اور سماج ترقی کر سکے اسی لئے انھوں نے اپنے اس مجموعے میں قدرے نرم اور شیریں لہجہ اپنایا بلکہ اگر کہا جائے کہ محبت اور محبت کے گیت اور راگ نہ صرف ان کی غزلوں تک محدود رہے بلکہ ان کی نظموں میں بھی نمایاں ہیں تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ اصلاً وہ اس اصول کے قائل ہیں کہ

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است

جیسا کہ جناب شیر محمد حمید نے "فیض سے میری رفاقت" میں فیض کے کردار کا نقشہ کھینچا ہے۔

"فیض ٹھنڈے مزاج کے بے حد صلح پسند آدمی ہیں، بات کتنی بھی اشتعال انگیز ہو حالات کتنے بھی ناساز گار ہوں وہ نہ برہم ہوتے ہیں اور نہ مایوس سب کچھ تحمل اور خاموشی سے برداشت کر لیتے ہیں۔ نہ کوئی

شکوہ نہ کسی کا گلہ نہ چڑ چڑاہٹ نہ بدگوئی۔ میں نے فیض
کو نہ کبھی طیش میں دیکھا ہے اور نہ کبھی کسی کا شکوہ
شکایت کرتے سنا ہے۔ ان کے دل کی گہرائیوں میں
لاکھ ہیجان برپا ہوں، چہرے پر برہمی کی یا پریشانی
کی کوئی لکیر نظر نہ آئے گی۔ فیض کا ظرف کتنا وسیع
ہے؟ سمندر کی تہہ میں طوفانوں کی رستاخیز ہے،
سطح پر سکون ہے یہ عظمت ہر کسی کو کہاں نصیب![1]

اس مجموعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فیض کی فطرت میں حسن و جمال کے اظہار کا جو جذبہ موجزن تھا ان کو رنگ و نکہت سے جو محبت تھی ذوق وصل اور یادِ یار کا حسین احساس جو ان کے دل میں تھا غزل کے قدیم روایات کا جو احترام تھا ان کی ندرت کوش فطرت نے ان خصوصیات کو نہایت ہی جدید انداز میں پیش کیا جس سے ان کا مرتبہ غزل گو کی حیثیت سے اور زیادہ بڑھ گیا۔ مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فیض نے اردو غزل کو وجدان و شعور کی روشنی اور تابناکی بخشی۔ زندگی کو عزم اور استقلال کا پیغام دیا۔ خوشی اور انبساط کی لے دی جس سے وہ نہ صرف آج بامِ شاعری پر جلوہ افروز نظر آتے ہیں بلکہ آنے والے زمانے میں آنے والی نسلیں انھیں اور عزت اور احترام کی نگاہوں

---

[1] نسخہ ہائے وفا : صفحہ ۵۰۹

سے دیکھیں گی اور ان کی شاعری سے الہام INSPIRATION اور حاصل کریں گی ۔

آیئے انھیں بکھرے خیالات کی روشنی میں شامِ شہر یاراں کی غزلوں کا تجزیہ کریں ۔ اس کی اشاعت ۱۹۷۸ء میں ہوئی ۔ میری اپنی ناقص رائے میں غزلوں کی کل تعداد تیرہ ہے ۔ غزلوں کی فہرست حسب ذیل ہے ۔

نمبر شمار (۱)	غزل کا پہلا مصرع (۲)	ردیف (۳)	تعداد اشعار (۴)
(۱)	ہم نے سب شعر میں سنوارے تھے	ے	۶
(۲)	مرے درد کو جو زباں ملے	ے	۴
(۳)	نہ اب رقیب نہ ناصح نہ غم گسار کوئی	ی	۵
(۴)	ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد	د	۵
(۵)	یہ موسمِ گل گرچہ طرب خیز بہت ہے	ے	۵
(۶)	ہمیں سے اپنی نوا ہم کلام ہوتی رہی	ی	۵
(۷)	تجھے پکارا ہے بے ارادہ	ہ	۶
(۸)	حسرتِ دید میں گزراں ہیں زمانے کب سے	ے	۶
(۹)	یہ کس خلش نے پھر اس دل میں آشیانہ کیا	ا	۵
(۱۰)	کسی شہر نہ شہرہ ہوا ادائی دل کا	ا	۶
(۱۱)	وہ بتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کہ دلوں سے خوفِ خدا گیا	ا	۳

نمبر شمار (۱)	غزل کا پہلا مصرعہ (۲)	ردیف (۳)	تعداد اشعار (۴)
(۱۲)	جگر دریدہ ہوں چاک جگر کی بات سنو	و	۳
(۱۳)	حیراں ہے جبیں آج کدھر سجدہ روا ہے	ے	۵

فیض نے دست تہ سنگ میں ایک نظم "شہر یاراں" کے عنوان سے لکھی تھی ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ اس مجموعے کا نام فیض نے اسی نظم سے اخذ کیا، یاروں اور دوستوں کا دلدادہ فیض ہر حال میں اپنے کاروانِ یاری اور دوستی کو رواں دواں دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی وجہ سے باوجود تمام دشواریوں، پریشانیوں اور پابندیوں کے کہا تھا۔

اے صبا شاید ترے ہمراہ یہ خوںناک شام
سر جھکائے جا رہی ہے شہر یاراں کی طرف

اور پھر اس شہر یاراں میں جس میں:۔

شہر یاراں جس میں اس دم ڈھونڈتی پھرتی ہے موت
شیر دل بانکوں میں اپنے تیر و نشتر کے ہدف

دیکھئے کچھ بھی ہو کیسی بھی کیفیت ہو فیض اپنی پامردی استقامت اور عزم محکم کے سہارے اتنے زیادہ خوش بین اور پُر امید رہتے ہیں کہ انھیں آنے والے حالات ہر حال میں خوش آئند نظر آتے ہیں اسی لئے کہہ اٹھتے ہیں۔

جا کے کہنا اے صبا، بعد از سلامِ دوستی
آج شب جس دم گزر ہو شہرِ یاراں کی طرف
دشتِ شب میں اس گھڑی چپ چاپ ہے شاید رواں
ساقیٔ صبحِ طرب، نغمہ بلب، ساغر بکف
وہ پہنچ جائے تو ہوگی پھر سے برپا انجمن
اور ترتیبِ مقام و منصب و جاہ و شرف

تو آیئے فیض کا کاروانِ سخن اب شامِ شہرِ یاراں تک پہنچ چکا ہے لہٰذا اس کاروانِ شعر سخن کا تجزیہ کریں۔ کیونکہ کافی حد تک یہ مجموعہ اگلے دوسرے مجموعوں سے مختلف نظر آتا ہے۔ اس میں وہ کرب اور بے چینی، انتشار و احتجاج نہیں جو دستِ صبا اور زنداں نامہ میں پایا جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں بلکہ اس کا تو کبھی گمان بھی نہیں ہو پاتا کہ فیض اب اپنے خیالات اور پیغاماتِ مشن سے کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی منحرف ہوئے ہوں بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ فیض انسان، انسانیت، سماج، سوسائٹی اور قوم و ملت کی ترقی و پیش رفت

کے کاروان کو محبت و الفت ہمدردی و بھائی چارگی کے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔
حق یہ ہے کہ ایک سچے شاعر نباض کا یہی شعار ہونا چاہیئے فیض کہتے ہیں۔

ہم نے سب شعر میں سنوارے تھے
ہم سے جتنے سخن تمھارے تھے
تیرے قول و قرار سے پہلے
اپنے کچھ اور بھی سہارے تھے
جب وہ لعل و گہر حساب کیئے
جو ترے غم نے دل پہ وارے تھے[1]

"مرے درد کو جو زبان ملے" کے عنوان کے تحت جو اشعار ملتے ہیں انھیں
میں نے غزل کی صف میں رکھا ہے کیونکہ اس کا پہلا شعر ہٹانے کے بعد پورے
اشعار ہیئت اور مضمون کے اعتبار سے غزل کے ہی ہیں۔ نہایت عاجزی کے
ساتھ میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ اقبال کی طرح فیض بھی اپنے خیالات اور
پیغامات کو دینا چاہتے ہیں۔ انھیں شاعری کی محدود سرحد میں باندھنا نہیں چاہتے
اسی لئے شاید انھوں نے بڑی دریدہ دہنی اور باہمنی سے کام لیتے ہوئے اس

---

[1] نسخہ ھائے وفا شام شہر یاراں صفحہ ۳۹

جگہ غزل کی سرحد کو چھلانگ کر اپنے مقصد کو بڑے ہی حسین اور دلکش انداز میں بیان کیا ہے جس سے پوری کی پوری غزل مطلع نہ ہونے کے باوجود بھی بڑی حسین دلکش اور پُراثر ہو گئی ہے۔ ملاحظہ کیجئے پہلا اور دوسرا شعر کس حسن خوبی سے جز ولاینفک بن گیا۔

مرا درد نغمۂ بے صدا
مری ذات ذرۂ بے نشاں
مرے درد کو جو زباں ملے
مجھے اپنا نام و نشاں ملے

پوری کی پوری غزل کس قدر زیبائی اور رعنائی کی مظہر ہے۔ اتنی چھوٹی بحر میں کس قدر استادی اور مہارت سے کام لیتے ہوئے اپنے طرز بیان کو پروان چڑھایا ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں قفس میں رہنے والا فیض جب کبھی گل و بلبل کے آواز میں شعر نظم کرتا ہے تو وہاں بھی اس کا طرز بیان نرالا ہوتا ہے اور اپنے مصرعہ

ع فیض گلشن میں وہی طرز بیاں ٹھہری ہے

کا مصداق نظر آتا ہے۔ ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ فیض کو کبھی کبھی اپنے پرانے ماحول کی یاد آتی ہے جہاں وہ اپنے والد کے ساتھ نماز پڑھتے اور ابراہیم میر سیالکوٹی سے اسلام اور اسلامی شعائر کی باتیں سنا کرتے

تھے۔ شاید اسی لئے کہتے ہیں کہ اگر مجھے یعنی میری قوم کو کسی طرح سے کائنات کی راز پنہاں کی باتیں معلوم ہو جائیں تو مجھے (قوم) سروری اور سرداری مل سکتی ہے۔ چونکہ فیض عربی کے اچھے دانشور تھے لہٰذا کہیں نہ کہیں اس کا عکس پڑنا لازمی ہے اور یہ اشعار ہمیں اس آیت کریمہ "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً" کی تشریح کرتے نظر آرہے ہیں جس میں انسان ہی کو مجموعی صفات اور خصوصیات کے حامل ہونے کی وجہ سے زمین کا خلیفہ بنائے جانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اب اسی کی روشنی میں پوری کی پوری غزل ملاحظہ فرمائیے۔

مرے درد کو جو زباں ملے
مجھے اپنا نام و نشاں ملے
مری ذات کا جو نشاں ملے
مجھے رازِ نظمِ جہاں ملے
جو مجھے یہ رازِ نہاں ملے
مری خامشی کو بیاں ملے
مجھے کائنات کی سروری
مجھے دولتِ دو جہاں ملے[۱]

---

[۱] نسخہ ھائے وفا — شامِ شہرِ یاراں — صفحہ ۵۲۳

آدمی کتنا سادہ لوح ہے کہ کسی کے ذرا سے التفات پر کیا کچھ کر گزرتا ہے جس سے دوسرے اس کا استحصال کرتے ہیں۔ یہ اشعار موضوع کے اعتبار سے یکسر روایتی ہیں۔ یہی انداز ہمیں فیض کی دورِ آگے کی غزلوں میں بھی نظر آتا ہے۔

ہم ایسے سادہ دلوں کی نیاز مندی سے
بتوں نے کی ہیں جہاں میں خدائیاں کیا کیا
ستم پہ خوش، کبھی لطف و کرم سے رنجیدہ
سکھائیں تم نے ہمیں کج ادائیاں کیا کیا[1]

ڈھاکہ سے واپسی پر کے عنوان سے جو اشعار شامل ہیں انھیں میں نے غزل کے تحت گنا ہے یوں کہ مضمون اور ہیئت کے اعتبار سے یہ بالکل غزل کے اشعار ہیں ان میں تغزل کا رنگ کوٹ کوٹ کر بھرا پڑا ہے۔ انداز وہی روایتی ہے لیکن فیض کی انفرادیت پس پردہ جھانک رہی ہے انداز کیا نرالا ہے کہتے ہیں۔

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد
کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

---

1. نسخہ ہائے وفا — شام شہر یاراں — صفحہ ۵۹

الفاظ کی دروبست نے کسقدر شعر میں لطافت اور چاشنی پیدا کردی ہے۔ ذیل کے اشعار سے اندازہ کیجئے۔

دل تو چاہا پر شکستِ دل نے مہلت ہی نہ دی
کچھ گلے شکوے بھی کر لیتے مناجاتوں کے بعد
ان سے جو کہنے گئے تھے فیضؔ جاں صدقہ کئے
ان کہی ہی رہ گئی وہ بات سب باتوں کے بعد [۱]

مضمون پرانا صحیح لیکن انداز کتنا نرالا اور اچھوتا ہے کسی کے بس کی بات نہیں یہ فیضؔ کا ہی حصّہ ہے۔ اگلی غزل بھی روایتی مضمون کی حامل ہے اس میں بھی فیضؔ کی تخیلی اور شیفتگی بڑھتی ہی نظر آتی ہے۔ الفاظ کتنے سادہ ہیں لیکن بندش کس قدر بلیغ۔ پوری غزل فصاحت و بلاغت کی آئینہ دار ہے چند شعر ملاحظہ فرمائیے۔

خوش دعوتِ یاراں بھی ہے یلغارِ عدو بھی
کیا کیجئے دل کا جو کم آمیز بہت ہے

---

[۱] نسخہ ہائے وفا — شام شہر یاراں — صفحہ ۶۰

یوں پیرِ مغاں شیخِ حرم سے ہوئے یک جاں
میخانے میں کم ظرفیٔ پرہیز بہت ہے
اک گردنِ مخلوق جو ہر حال میں خم ہے
اک بازوئے قاتل ہے کہ خوں ریز بہت ہے [۱]

چونکہ فیض کی طبیعت نہایت دلیر واقع ہوئی ہے لہٰذا وہ ہر کام کو بہ بانگِ دہل کرنا چاہتے ہیں اسی لیے کہہ اٹھے :-

کیوں مشعلِ دل فیض چھپاؤ تہِ داماں !
بجھ جائے گی یوں بھی کہ ہوا تیز بہت ہے

ان کی یہی دلیری ہے جو صفِ یاراں درہم برہم ہونے پر بھی استقامت اور پامردی سے دشواریوں کا سامنا کرتی رہتی ہے ۔ دیکھیے کس دلیرانہ انداز میں کہتے ہیں ۔

ہمیں سے اپنی نوا ہم کلام ہوتی رہی
یہ تیغ اپنے لہو میں نیام ہوتی رہی
مقابلِ صفِ اعداء جسے کیا آغاز
وہ جنگ اپنے ہی دل میں تمام ہوتی رہی

---

[۱] نسخہ ہائے وفا — شامِ شہرِ یاراں — صفحہ ۶۱

آگے کس حسین اور دلکش انداز میں پرانی اور نئی شراب کو ایک کوزے میں ڈال کر دو آتشہ کیا ہے کہتے ہیں :۔

یہ برہمن کا کرم ، وہ عطائے شیخ حرم
کبھی حیات کبھی مے حرام ہوتی رہی
جو کچھ بھی بن نہ پڑا، فیض لٹ کے یاروں سے
تو رہزنوں سے دعائے سلام ہوتی رہی[1]

ان کا یہی انداز آگے کی غزلوں میں بھی رواں دواں نظر آتا ہے کہتے ہیں

پُر کرو جام کہ شاید ہو اسی لحظہ رواں
روک رکھا ہے جو اک تیر قضا نے کب سے
فیض پھر کب کسی مقتل میں کریں گے آباد
لب پہ ویراں ہیں شہیدوں کے فسانے کب سے[2]

چونکہ اس مجموعے کا بنیادی لحن ایک شہید کی صدا ہے جو ہر طرح کے ظلم و

۱ـہ	نسخہ ھائے وفا	شام شہر یاراں	صفحہ ۶۹
۲ـہ	نسخہ ھائے وفا	شام شہر یاراں	صفحہ ۷۲

ستم برداشت کرتا چلا آرہا ہے تبھی تو فیض کہتے ہیں۔

تھے خاکِ راہ بھی ہم لوگ قہرِ طوفاں بھی
سہا تو کیا نہ سہا اور کیا تو کیا نہ کیا

لیکن سچ ہے کہ غزل کا ہر شعر اپنے معنی کے اعتبار سے مکمل رہتا ہے فیض نے اس نکتے کو بڑی چابکدستی اور مہارت سے برتا ہے۔ اسی غزل میں ان کا اس سے پہلے کیا انداز تھا ملاحظہ ہو۔

غمِ جہاں ہو، رُخِ یار ہو کہ دستِ عدو
سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا[۱]

یہی انداز تقریباً آگے کی غزلوں میں نمایاں ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فیض شاعری کے نقطۂ عروج پر پہونچ چکے ہیں۔ جس طرح کا مضمون چاہیں استادانہ انداز میں ادا کریں خود ان کے اشعار سے قاری کو اندازہ ہو جائے گا۔

وہ بتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کہ دلوں سے خوفِ خدا گیا
وہ پڑی ہیں روز قیامتیں کہ خیالِ روزِ جزا گیا

---

[۱] نسخہ ہائے وفا — شام شہر یاراں — صفحہ ۷۵

جو نفس تھا خارِ گلو بنا، جو اٹھے تھے ہاتھ لہو ہوئے
وہ نشاطِ آہِ سحر گئی، وہ وقارِ دستِ دعا گیا
جو طلب پہ عہدِ وفا کیا، جو وہ قدرِ رسم و فا گئی
سرِ عام جب ہوئے مدّعی، تو ثوابِ صدق و صفا گیا [1]

ان اشعار کو میں نے غزل کی فہرست میں شامل کیا ہے اگرچہ نسخہ ہائے وفا میں انھیں صرف اشعار بتایا گیا ہے۔ لیکن یہ اشعار حقیقت میں ہر اعتبار سے غزل کے ہیں اور تغزل تو بلا کا پایا جاتا ہے۔ الفاظ کی بندش میں وہی سجاوٹ زیبائش اور رچاؤ ہے جو غزل کی جان ہے۔

"امیدِ سحر کی بات سنو" کے عنوان سے جو اشعار درج ہیں انھیں بھی اگر غزل کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ کیونکہ صرف آخری مصرعہ سحر کی بات، امید سحر کی بات سنو، فیض نے اس جامع اور پُر تاثیر انداز میں بیان کیا ہے کہ وہ اوپر کے تین اشعار کو نہایت پُر اثر بنا دیتا ہے۔ لہٰذا فیض ایسے جدّت پسند اور ندرت کوش شاعر سے کوئی بعید نہیں کہ وہ اسکی شکل اور ہیئت میں بھی تبدیلی لانا چاہتے رہے ہوں۔ کیونکہ بہر حال سارے اشعار غزل کے ہیں اور نہایت ہی پُر تاثیر اور دل سوز ہیں۔

---

[1] نسخہ ہائے وفا   شام شہر یاراں   صفحہ ۸۲

جگر دریدہ ہوں چاکِ جگر کی بات سنو
الم رسیدہ ہوں دامانِ تر کی بات سنو
زباں بریدہ ہوں زخمِ گلو سے حرف کرو
شکستہ پا ہوں ملالِ سفر کی بات سنو
مسافرِ رہِ صحرائے ظلمتِ شب سے
اب التفاتِ نگارِ سحر کی بات سنو
سحر کی بات، امیدِ سحر کی بات سنو[1]

شامِ شہریاراں کی آخری غزل نہایت ہی نئے اور نرالے انداز کی ہے۔ اس میں گہرے رنج و غم کے احساسات کے ساتھ ساتھ شدید ترین طنز کا بھی ایک انوکھا پیکر نظر آتا ہے۔ اور تلخ سے تلخ حقیقتوں کو بھی انھوں نے ایک دلکش غزلیہ انداز میں پیش کر دیا ہے۔

حیراں ہے جبیں آج کدھر سجدہ روا ہے
سر پر ہیں خداوند سرِ عرش خدا ہے
کب تک اسے سینچو گے تمنائے ثمر میں
یہ صبر کا پودا تو نہ پھولا نہ پھلا ہے[2]

---

1. نسخہ ہائے وفا — شامِ شہریاراں — صفحہ ۱۰۴
2. نسخہ ہائے وفا — شامِ شہریاراں — صفحہ ۱۰۵

یہ تھا فیض کے اس مجموعے کی غزلوں کا مختصر تجزیہ جسے راقم الحروف نے پیش کرنے کی جسارت کی۔ یہاں میں فتح محمد ملک کی تصنیف سے ایک اقتباس پیش کر کے اپنی بات ختم کرنا چاہوں گا۔

"فیض کی شخصیت میں میر حسن اور ابراہیم میر سیالکوٹی کے شاگردِ رشید کی بیداری نے فیض کے انقلابی شعور کی دھار کو اور تیز کر دیا ہے اور ان کی تخلیقی شخصیت کو ایک نئی پہنائی سے آشنا کر دیا ہے۔ تخلیقی شخصیت کی اس توسیع نے فیض کی شاعری پر جن نئے امکانات کے در کھول دئے ہیں اس کی ایک جھلک "شام شہر یاراں" میں جلوہ گر ہے۔ اس اعتبار سے "شام شہر یاراں" کی اشاعت فیض اور اردو شاعری ہر دو کے تابناک مستقبل کی بشارت سے کم نہیں۔"[1]

---

[1] فیض شاعری اور سیاست فتح محمد ملک صفحہ ۱۰۴

مرے دل مرے مسافر

فیض کا یہ مجموعہ ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۷۸ء میں شام شہر یاراں کی اشاعت کے بعد کا کلام اس مجموعے میں شامل ہے۔ ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۱ء تک کا دور فیض کے لیے مختلف سرگرمیوں کا زمانہ رہا ہے۔ وہ نہ صرف ملک میں بلکہ بیرونِ ملک اعزاز و انعامات سے نوازے جاتے رہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ مزدوروں اور بیکسوں کا ہمنوا اب حکومت کا منظور نظر بن گیا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ حکومت نے خود ان کی مقبولیت اور صدق و صفا کے سامنے سر تسلیم خم کیا کیونکہ 'ہر کمالِ را زوال' کا مقولہ برحق ہے۔ چونکہ فیض کی ناقدری اور حکومت کی ان سے بے اعتنائی کی انتہا ہو چکی تھی لہٰذا اس میں کمی اور زوال لازمی تھا۔ فیض کے مخالفین نے اسے دوسرے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ فیض کی مقبولیت اور شہرت میں کچھ کمی نہیں آنے والی بلکہ اس سے ان کے مخالفین کی تنگ نظری اور کم مائگی ہی کا اندازہ یقیناً شدید سے شدید تر ہو جاتا ہے۔ انیس ناگی کا یہ قول کہ :-

"فیض احمد فیضؔ کافی عرصہ پہلے اپنے فن کی انتہا کو پہنچ چکے ہیں اور گزشتہ دس پندرہ سالوں سے جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ محض اپنی شہرت کو برقرار رکھنے یا اپنے خوشامدی قسم کے مداحوں سے داد لینے کے خواہشمند ہیں ان کی نظموں سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے یہاں مطالعے کی کمی ہے، نئے تجربات کا سلسلہ بند ہو چکا ہے اور ہر دور کے نتیجے کے طور پر ان کا لسانی اسلوب اپنے عہد کے لسانی رویّوں سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ شہرت کی مزید خواہش اور فنّی انحطاط وہ المیہ ہے جس سے فیض احمد فیضؔ آجکل دوچار دکھائی دیتے ہیں۔"[1]

جب فیض کے اس مجموعے کا مطالعہ کرتے ہیں تو انیسؔ ناگی کا یہ قول غلط ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ مجموعے میں بقول پروفیسر محمد حسن۔

"اس مجموعے کی بلند آہنگ نظموں میں قوالی اور رنگین آوازیں، سب سے زیادہ اہم ہیں یہ تصویروں تا ثیر پاروں سے سجی ہوئی نظمیں ہیں اور ان میں مستقبل پر اعتماد کی شمعیں اس طرح روشن ہوئی ہیں کہ ہر لفظ کو جگمگاتی گزر گئی ہیں ان میں شاعر کی تخیل نے بڑی ہنرمندی سے اظہار پایا .... مجموعے میں چند پنجابی گیت اور چند غزلیں بھی ہیں لیکن اس بار نظموں کا پلّہ بھاری ہے یہ مجموعہ فیض کے سفر کا اہم سنگ میل ہے۔"[2]

۱؎	فیض شاعری اور سیاست	فتح محمد ملک	صفحہ ۹۵
۲؎	فیض احمد فیض عکسی اور جہتیں	مرتبہ شاہد ماہلی	صفحہ ۳۸۱

مرے دل مرے مسافر کے پس منظر اور شعری محاسن پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر موصوف نے کتنی جامع اور وقیع بات کہی ہے جس سے حقیقی تصویر کشی ہوتی ہے فرماتے ہیں۔

"فیض کا یہ مجموعہ دراصل ان کی جلاوطنی کے کلام پر مشتمل ہے سوانحی لے ظاہر ہے ذرا بلند ہے مگر فیض کی طبعی شائستگی اور نرمی کے ساتھ۔ اداسی فیض کے لئے عرفانِ حیات کی کلید ہے وہ اسے اوڑھتے نہیں۔ اس کے باریک سے پردے سے زندگی کی نرمیوں اور ٹھنڈک پہنچانے والی صبحوں کا نظارہ کرتے ہیں۔ فیض نے اس مجموعہ میں اپنے آپ کو دہرایا کم ہے نئی شعری کیفیات تک رسائی البتہ حاصل کی ہے۔ اس کی چند مثالوں کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہوگا۔ خود کلامی فیض کے ہاں پہلے بھی تھی خاص طور پر دست صبا کی زندانی نظموں میں مگر میدانِ جنگ میں مبارز طلب سپاہی کی خود کلامی ہے 'دل من مسافر من' میں یہ خود کلامی کا لہجہ بڑا ہی کھویا سا ہے اس میں تنہائی کا وہ درد ہے جو صرف ان قلندروں کا ملا کرتا ہے جو رنگ نشاط کی طلب سے بے نیاز ہونے کی منزل میں ہوتے ہیں اس دل دوز تنہائی نے فیض کی شاعری میں عجیب تاثر پارے، حسی ترکیبات اور تشبیہ واستعارے کی نئی تمثال کی تخلیق ہے۔ ....

دلبودگی اور سپردگی کی جو کیفیت اس خود کلامی کے پیچھے ایک زیریں

ہر کی طرح جلوہ گر ہے وہ اس مجموعے کی پہچان ہے ہر منظر یہاں دود کو ہر لمحے کے ساتھی کی طرح پیش کرتا ہے جیسے وہ شہ رگ سے زیادہ قریب ہو اور اس کے ہر منظر کو نشتر بنا دیا ہے۔"[۱]

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ فیض جہاں بھی ہوں جس حال میں بھی ہوں وہ اپنے مشن سے گریزاں نہیں ہوتے۔ ان کا یہ مجموعہ جلاوطنی کے کلام پر مشتمل ہے اور خاص طور سے قیام بیروت کی یادگار ہے۔ جسے انھوں نے یاسر عرفات کے نام معنون کیا ہے۔ اس میں کئی نظمیں بیروت اور اہل فلسطین کو مخاطب کر کے لکھی گئی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ان کی نظموں اور غزلوں سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں لاہور اور اہالیانِ لاہور کی یادیں ستاتی رہیں، شاید اسی وجہ سے ان کے مجموعے میں وطن اور وطن کی زندگی کی رنگینیوں اور لذتوں سے بے پناہ پیار نظر آتا ہے۔ جسے انھوں نے اپنے مخصوص لب و لہجہ اور صوتی آہنگ عطا کیا اسی روشنی میں اس مجموعے کا تجزیہ پیش خدمت ہے۔ اس مجموعے میں غزلوں کی مجموعی تعداد حسب ذیل ہے۔

---

۱ فیض احمد فیض عکس اور جہتیں مرتبہ شاہد ماہلی صفحہ ۳۲۸-۳۲۹

ردیف / تعداد اشعار		غزل کا پہلا مصرعہ	نمبر شمار
تعداد اشعار	ردیف	غزل کا پہلا مصرعہ	نمبر شمار
۶	ر	آپ کی یاد آتی رہی رات بھر	(۱)
۶	ب	یاد کا پھر کوئی دروازہ کھلا آخر شب	(۲)
۵	ا	کچھ پہلے ان آنکھوں آگے کیا کیا نہ نظارہ گزرے تھے	(۳)
۶	ے	سہل یوں راہِ زندگی کی ہے	(۴)
۵	ں	سبھی کچھ ہے تیرا دیا ہوا، سبھی راحتیں، سبھی کلفتیں	(۵)
۶	ہ	قندِ دہن کچھ اس سے زیادہ	(۶)
۵	ے	اب کے برس دستورِ ستم میں کیا کیا باب ایزاد ہوئے	(۷)
۶	ے	غم بہ دل، شکر بہ لب، مست و غزل خواں چلیے	(۸)
۵	ا	وہ بتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کہ دلوں سے خوفِ خدا گیا	(۹)
۵	ا	ستم سکھلائے گا رسمِ وفا ایسے نہیں ہوتا	(۱۰)

اس مجموعے کی پہلی دو غزلیں اپنے بزرگ دوست مخدوم محی الدین کی یاد میں نظم کی گئی ہیں۔ فیض کا محبت بھرا دل ہی تو ہے جو ماسکو اور ماسکو کی رنگینیوں اور دل آرائیوں میں رہنے کے باوجود اپنے دوستوں اور یاروں سے غافل نہیں رہتا بلکہ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ ماسکو اور وہاں کی فضائیں ان پر گراں گزر رہی ہے اور وطن

اور وطن کے دوستوں کی یاد دم بہ دم لحظہ بہ لحظہ تیز ہوتا معلوم ہوتی ہے جن سے متاثر ہو کر اپنے محبوب دوست کی یاد میں اپنے شیریں، دلکش اور منفرد لہجے میں گنگنا اٹھتے ہیں۔

"آپ کی یاد آتی رہی رات بھر"
چاندنی دل دکھاتی رہی رات بھر
گاہ جلتی ہوئی، گاہ بجھتی ہوئی
شمعِ غم جھلملاتی رہی رات بھر
کوئی خوشبو بدلتی رہی پیرہن
کوئی تصویر گاتی رہی رات بھر

اور پھر امید پر تکیہ کرتے ہوئے کہہ اٹھے

ایک امید سے دل بہلتا رہا
اک تمنا ستاتی رہی رات بھر[1]

یہیں پر خاموش نہیں ہوتے بلکہ پیغام رسانی کے لئے بادِ صبا کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

---

[1] نسخہ ہائے وفا مرے دل مرے مسافر صفحہ ۱۴۱

"اسی انداز سے چل بادِ صبا آخرِ شب"

یاد کا پھر کوئی دروازہ کھلا آخرِ شب
دل میں بکھری کوئی خوشبوئے قبا آخرِ شب
صبح پھوٹی تو وہ پہلو سے اٹھا آخرِ شب
وہ جو اِک عمر سے آیا نہ گیا آخرِ شب
چاند سے ماند ستاروں نے کہا آخرِ شب
کون کرتا ہے وفا عہدِ وفا آخرِ شب

یہیں پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ پرانی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے بادِ صبا کو یوں تلقین کرتے ہیں۔

گھر جو ویراں تھا سرِ شام وہ کیسے کیسے
فرقتِ یار نے آباد کیا آخرِ شب
جس ادا سے کوئی آیا تھا کبھی اوّلِ صبح
"اسی انداز سے چل بادِ صبا آخرِ شب"[۱]

۱۔ نسخہ ہائے وفا مرے دل مرے مسافر صفحہ ۱۶

ایک دکنی غزل کے عنوان سے جو غزل ہے وہ بھی اپنے دوستوں یاروں اور بالا تراز ہمہ وطن اور وطن کی رنگینیوں کی یاد دلاتے ہوئے فیض کے ذہن اور دل کے تار کو جھنجھوڑتی ہے جس سے عشق و محبت کا پرستار اور شیدائی فیض اپنے دلکش اور دلآویز انداز میں نغمہ سرا ہو اٹھتا ہے۔

کچھ پہلے ان آنکھوں آگے کیا کیا نہ نظارا گزرے تھا
کیا روشن ہو جاتی تھی گلی جب یار ہمارا گزرے تھا
تھے کتنے اچھے لوگ کہ جن کو اپنے غم سے فرصت تھی
سب پوچھیں تھے احوال جو کوئی درد کا مارا گزرے تھا

وقت اور زمانے سے شکایت آمیز لہجے میں کس قدر نرمی، ملائمت لیکن دلسوز اور دلدوز انداز میں کہتے ہیں۔

اب کے تو خزاں ایسی ٹھہری وہ سارے زمانے بھول گئے
جب موسم گل ہر پھیرے میں آ کے دوبارا گزرے تھا
تھی یاروں کی بہتات تو ہم اغیار سے بھی بیزار نہ تھے
جب مل بیٹھے تو دشمن کا بھی ساتھ گوارا گزرے تھا
اب تو ہاتھ سجھائی نہ دیوے، لیکن اب سے پہلے تو
آنکھ اٹھتے ہی ایک نظر میں عالم سارا گزرے تھا[1]

---

[1] نسخہ ہائے وفا — مرے دل مرے مسافر — صفحہ ۱۸

اس غزل کا انداز کتنا دلکش زیبا اور استادانہ ہے یقیناً یہ فیض کا ہی حصہ ہے کہ ہر طرح کے مضامین کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں گویا اس کے ماہر ہیں۔

اوزان و قوافی چاہے کچھ بھی ہو بحر جیسی بھی ہو فیض ایسی مہارت اور چابکدستی سے گذرتے ہیں کہ قاری کو خواہی نہ خواہی ان کی صلاحیت اور استادی کا معترف ہونا پڑتا ہے دیکھیئے کس سلامت و روانی کے ساتھ سادہ اور سلیس الفاظ میں وطن اور وطن کی یاد کی تصویر کشی کرتے ہیں۔

تیرے کوچے میں بادشاہی کی
جب سے نکلے گداگری کی ہے

بس وہی سُرخ رو ہوا جس نے
بحرِ خوں میں شناوری کی ہی
"جو گزرتے تھے داغ پر صدمے"
اب وہی کیفیت سبھی کی ہے[1]

ایک دوسری غزل میں تقریباً ایسا ہی مضمون نظم کیا ہے جس میں

---

[1] نسخہ ھائے وفا مرے دل مرے مسافر صفحہ ۲۸

اپنے وطن اور وطن کے ساتھیوں کو فلسطینوں کے جذبۂ جانثاری کی تشریح کرتے ہوئے ترغیب دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں جو کچھ ملا اور جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ وطن اور وطن کے عزیزوں کا ہی ہے۔ دیکھئے اس کی تصویر کشی کس حسین اور دلدوز انداز میں کرتے ہیں۔

سبھی کچھ ہے تیرا دیا ہوا، سبھی راحتیں، سبھی کلفتیں
کبھی صحبتیں کبھی فرقتیں، کبھی دوریاں کبھی قربتیں
یہ سخن جو ہم نے رقم کیے، یہ ہیں سب ورق تری یاد کے
کوئی لمحہ صبحِ وصال کا کئی شامِ ہجر کی مدتیں

کسی بھی حال میں کسی بھی طرح اپنے وطن کی یاد سے غافل نہیں ہوتے چاہے انھیں اس کے عوض کچھ بھی مل جائے کہتے ہیں۔

جو تمہاری مان لیں ناصحا، تو رہے گا دامنِ دل میں کیا
نہ کسی عدو کی عداوتیں، نہ کسی صنم کی مروتیں

فلسطینوں کی آزادی کے جذبے کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور ان کی قربانیوں کو کس انداز میں سراہتے ہیں۔

چلو آؤ تم کو دکھائیں ہم جو بچا ہے مقتلِ شہر میں
یہ مزار اہلِ صفا کے ہیں، یہ ہیں اہلِ صدق کی تربتیں

کچھ بھی ہو جان رہے یا جائے انھیں اس کا غم نہیں کیونکہ وطن پر قربان ہوئی جانوں کے دامن کو مسرتوں اور شادمانیوں سے بھرا ہوا دیکھتے ہیں کہتے ہیں ۔

مری جان، آج کا غم نہ کر کہ نہ جانے کاتبِ وقت نے
کسی اپنے کل میں بھی بھول کر، کہیں لکھ رکھی ہوں مسرتیں[۱]

نذرِ حافظ کے عنوان سے لکھی گئی غزل نہ صرف فیض کی حافظ سے عقیدت کا اظہار ہے بلکہ صدیوں پہلے حافظ جو انسانیت، اخوت، ہمدردی اور بشر دوستی کا علمبردار تھا اس سے متاثر ہوئے بغیر فیض کی انفرادیت شاید مکمل نہ ہو پاتی اسی لیے ہم فیض کے پورے کلام میں حافظ کے سحر آگیں نغموں کا عکس کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی انداز میں یقیناً پاتے ہیں۔ اسی وجہ سے انھوں نے حافظ کے بہت سے اشعار کو اپنے کلام کے سرناموں میں یا غزلوں اور نظموں میں بغیر کسی تبدیلی کے نقل کیا ہے۔ اس غزل کی شروعات بھی حافظ کے ہی شعر

ناصحم گفت بجز غم چہ ہنر دارد عشق
برو اے خواجۂ عاقل ہنرے بہتر ازیں

---

[۱] نسخہ ھائے وفا — مرے دل مرے مسافر — صفحہ ۴۰

کیا ہے۔ اب دیکھئے خود فیض کی غزل کس قدر شیریں اور لطیف ہے۔ الفاظ کتنے سادہ اور سلیس ہیں، بحر کتنی چھوٹی ہے لیکن دل کی تڑپ اور عقیدت کا دریا ہے کہ بہتا ہی چلا جا رہا ہے کہتے ہیں۔

قندِ دہن کچھ اس سے زیادہ
لطفِ سخن، کچھ اس سے زیادہ
فصلِ خزاں میں لطفِ بہاراں
برگِ سمن کچھ اس سے زیادہ

اسی غزل کے اس شعر

شمع بدن، فانوسِ قبا میں
خوبیٔ تن کچھ اس سے زیادہ

کو پڑھتے ہوئے حسرت کا یہ شعر بھی بے ساختہ یاد آجاتا ہے، کیونکہ جمالیاتی کیفیت حسرت کے اس شعر میں پائی جاتی ہے اس سے بھی زیادہ ہلکے پھلکے انداز میں یہ کیفیت فیض کے یہاں جلوہ گر ہوتی نظر آرہی ہے۔ حسرت کا شعر ملاحظہ فرمائیے۔

رونق پیرہن ہوئی خوبیٔ جسم نازنیں
اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

آخر میں عشق کو ہی زندگی کا محور تسلیم کرتے ہوئے اور اس میں غم کی

زیادتی اور فراوانی سے نہ گھبراتے ہوئے کہتے ہیں ۔

عشق میں کیا ہے غم کے علاوہ
خواجۂ من کچھ اس سے زیادہ[1]

نیرنگیٔ زمانہ کو دیکھ کر فیض کتنے متعجب نظر آتے ہیں اور کہتے ہیں
واہ رے زمانہ اور واہ رے دستور زمانہ کہ :-

اب کے برس دستورِ ستم میں کیا کیا باب ایزاد ہوئے
جو قاتل تھے مقتول ہوئے ، جو صید تھے اب صیاد ہوئے
پہلے بھی خزاں میں باغ اجڑے پر یوں نہیں جیسے اب کے برس
سارے بوٹے پتہ پتہ روش روش برباد ہوئے
پہلے بھی طوافِ شمعِ وفا تھی ، رسم محبت والوں کی
ہم تم سے پہلے بھی یہاں منصور ہوئے ، فرہاد ہوئے

آخر میں کچھ بے سروسامانی اور بے لبسی کا نقشہ پیش کرتے
ہوئے کہتے ہیں کہ :-

---

[1] نسخہ ھائے وفا — مرے دل مرے مسافر — صفحہ ۵۶

فیض، نہ ہم یوسف نہ کوئی یعقوب جو ہم کو یاد کرے
اپنی کیا، کنعاں میں رہے یا مصر میں جا آباد ہوئے[1]

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ فیض روایاتی اسالیب کے پابند اور غزلوں میں کسی قدر اس کے دلدادہ اور شیدا نظر آتے ہیں غالباً ان کی غزلوں کی جا معیت اور مقبولیت کا یہی راز ہے کہ ان کی غزلیں ہر اعتبار سے موزوں ہیں۔ مندرجہ ذیل غزل میں روایتی اسلوب کی کس قدر پابندی نظر آتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ فیض کی جدت پسندی نے اس میں چار چاند لگا دئے ہیں

غم بہ دل، شکر بہ لب، مست و غزل خواں چلیے
جب تلک ساتھ ترے عمر گریزاں چلیے
رحمت حق سے جو اس سمت کبھی راہ ملے
سوئے جنت بھی براہ رہ جاناں چلیے
نذر مانگے جو گلستاں سے خداوند جہاں
ساغر مے میں لیے خون بہاراں چلیے

دل کی پاکی اور صفائی ہر حال میں لازم ہے لہذا اس کی تلقین کس

---

[1] نسخہ ہائے وفا — مرے دل مرے مسافر — صفحہ ۶۲

خوبصورت انداز میں کرتے ہیں۔

کچھ بھی ہو آئینۂ دل کو مصفّا رکھیے
جو بھی گزرے، مثلِ خسروِ دوراں چلیے
امتحاں جب بھی ہو منظور جگر داروں کا
محفلِ یار میں ہمراہِ رقیباں چلیے[1]

اگلی غزل بھی اسی اسلوب کی پابند نظر آتی ہے لیکن فیضؔ کی ندرت کوشِ طبیعت اس میں ہر آن اور ہر لمحہ نیا رنگ دکھاتی نظر آتی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے بالکل نئی بات کہی ہے۔ دیکھیے کس انداز میں اپنے خیال کو شعر کا جامہ پہناتے ہیں۔

وہ بتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کہ دلوں سے خوفِ خدا گیا
وہ پڑی ہیں روز قیامتیں کہ خیالِ روزِ جزا گیا
جو نفس تھا خارِ گلو بنا، جو اٹھے تو ہاتھ لہو ہوئے
وہ نشاطِ آہِ سحر گئی وہ وقارِ دستِ دعا گیا
نہ وہ رنگ فصلِ بہار کا، نہ روش وہ ابرِ بہار کی
جس ادا سے یار تھے آشنا وہ مزاجِ بادِ صبا گیا

---

[1] نسخہ ہائے وفا مرے دل مرے مسافر صفحہ ۶۴

فیض کسی حال میں غیر مناسب انداز میں حالات سے سمجھوتہ کرنے کے روادار نہیں نظر آتے دیکھئے کس خودداری کا مظاہرہ پیش کرتے ہیں۔

جو طلب پہ عہدِ وفا کیا تو وہ آبروئے وفا گئی
سرِ عام جب ہوئے مدعی تو ثوابِ صدق و صفا گیا[1]

اس مجموعے کی آخری غزل فیض کے عشق و خرد و ہوشمندی کی حکایات کو پورے طور پر احاطہ کرتی نظر آتی ہے دیکھئے کہ وطن کا یہ عظیم پرستار وفاداری بشرطِ استواری کے مسلک پر کتنا ثابت قدم نظر آتا ہے اسی لیے تو ظالموں اور ستمگروں کو متنبہ کرتا ہوا کہتا ہے :-

ستم سکھلائے گا رسم وفا ایسے نہیں ہوتا
صنم دکھلائیں گے راہِ خدا ایسے نہیں ہوتا
جہانِ دل میں کام آتی ہیں، تدبیریں نہ تعزیریں
یہاں پیمانِ تسلیم و رضا ایسے نہیں ہوتا

اس غزل کا آخری شعر تو پیہم جدوجہد اور ہر آن کوشش کی تلقین

---

[1] نسخہ ہائے وفا مرے دل مرے مسافر صفحہ ۶۵

کرتا ہوا نظر آتا ہے اور کسی بھی حال میں اپنی ہار مان کر بیٹھنے کو تیار نہیں سچ یہ ہے کہ اسی امید اور رجائیت نے فیض کی اہمیت کو دوبالا کر دیا ہے۔ دیکھئے کس حسین انداز میں عمل اور کوشش کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

رواں ہے نبض دوراں ، گردشوں میں آسماں سارے
جو تم کہتے ہو سب کچھ ہو چکا، ایسے نہیں ہوتا[1]

---

[1] نسخہ ہائے وفا   مرے دل مرے مسافر   صفحہ ۶۸

غُبارِ ایّام

فیض کا آخری مختصر مگر جامع مجموعہ غبارِ ایام چند نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے۔ یہ اس زمانے کا کلام ہے جب فیض کو ملک اور بیرونِ ملک کسی نہ کسی غرض سے جانا پڑتا تھا۔ اس مجموعے کو اگر "مرے دل مرے مسافر" کی ایک کڑی کہا جائے تو غالباً بے جا نہ ہوگا، کیونکہ اس کی بھی زیادہ تر نظمیں اور غزلیں بیروت اور لندن میں ہی نظم کی گئی ہے۔ اسی وجہ سے اس میں بھی انھیں خیالات اور اظہارات کی عکاسی نمایاں ہے۔ بہرحال چونکہ اسے الگ سے عنوان دیا گیا ہے اس وجہ سے اس کا تجزیہ علٰحدہ طور پر پیش خدمت ہے۔ سرسری طور سے جائزہ لینے پر اندازہ ہوتا ہے کہ غزلوں کی تعداد محض آٹھ ہے۔ جن کی فہرست حسب ذیل ہے۔

نمبر شمار (۱)	غزل کا پہلا مصرعہ (۲)	ردیف (۳)	تعداد اشعار (۴)
(۱)	نہیں نگاہ میں منزل تو جستجو ہی سہی	ی	۵
(۲)	گو سب کو بہم ساغر و بادہ تو نہیں تھا	ا	۵

(۱)	(۲)	(۳)	(۴)
(۳)	مر جائیں گے ظالم کی حمایت نہ کریں گے	ے	۵
(۴)	ہم مسافر یونہی مصروفِ سفر جائیں گے	ے	۶
(۵)	جیسے ہم بزم ہیں پھر یارِ طرحدار سے ہم	م	۵
(۶)	پھر آئینہ عالم شاید کہ نکھر جائے	ے	۵
(۷)	بے بسی کا کوئی درماں نہیں کرنے دیتے	ے	۵
(۸)	بہت ملانہ ملا زندگی سے غم کیا ہے	ے	۶

اس مجموعے کی غزلوں میں کوئی نیا مضمون نہیں پیش کیا ہے انفرادی موضوعات کو قلمبند کیا ہے جس کی بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں رومانیت غالب ہے۔ جیسا کہ اردو کے مشہور نقاد پروفیسر محمد حسن نے "ترے دل مرے مسافر" کے متعلق لکھا ہے وہ بات اس مجموعے پر بھی صادق آتی ہے فرماتے ہیں

"اس مجموعے میں رومانیت کا انقلابی موڑ بہت کھل کر سامنے آیا ہے اور اس اعتبار سے یہ انقلابی، شاعری کا ایک نیا آہنگ ہے۔ یہ شاعری فرد کی ارمانوں بھری زندگی کے لامحدود تنہائیوں اور اجتماعی زندگی کی سنگینی اور اس کے سنورنے کی دشواریوں کے درمیان جان لیوا کشمکش کی شاعری ہے ایسے لوگ جنھیں حسن سے بھی لگاؤ ہے اور زندگی بھی عزیز ہے حسن سے لگاؤ کی خاطر

اور ایک سچے جمالیات پرست، حساس درد مند فرد کی طرح جینا چاہتے ہیں جہاں صرف وہ آسودہ حال اور خوش و خرم نہ ہوں بلکہ ان کے ارد گرد کے لوگ ان کا سماج بھی آسودہ حال ہو اور جب فرد اپنی زندگی کو اس آسودگی کی تلاش میں کھپاتا ہے تو نت نئی محرومیوں، شکستوں اور مظالم کا شکار ہوتا ہے۔ زندان کی دیواریں، صلیب کے پھندے، جلا وطنی، سازشیں، مکر و ریا اس کا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور تب یہ احساس ہوتا ہے کہ فرد کی زندگی کتنی مختصر ہے اور کارِ جہاں کتنا دراز ہے زندگی کے اس دوراہے پر دور سے جھانکنے والے سویرے کی جھلک نظر آتی ہے اور دل فخر اور درد سے جھوم اٹھتا ہے۔"[1]

اب اسی کی روشنی میں غبارِ ایام کی غزلوں کا تجزیہ پیش خدمت ہے۔ اس مجموعے میں بطور سرنامہ بیدل کا شعر

ہر کجا رفتم غبارِ زندگی در پیش بود
یا رب این خاکِ پریشاں از کجا برداشتم

نقل ہے۔ حقیقت میں فیض نے زمانے سے جو سیکھا جو پایا اسے

---

[1] فیض احمد فیض عکس اور جہتیں مرتبہ شاہد ماہلی صفحہ ۲۸۰

اپنی شخصیت کے تمام تر رنگ میں ڈبو کر انوکھے انداز میں پیش کرتے ہوئے اثر بنا کر، امر بنا کر زمانے کو لوٹا دیا۔ تاکہ آنے والی نسلیں اب دشواری اور پریشانی سے دوچار نہ ہوں بلکہ ترقی کی راہ پر گامزن ہوتی رہیں۔ بقول کچھ ناقدین کے فیض کا کلام چند سال بیشتر ہی اوج کمال پر پہنچ چکا تھا یعنی فیض اور فیض کی شخصیت کی رسائی اوج کمال تک ہو چکی تھی لہٰذا اس حالت میں فیض کے دل سے جو بات نکلتی تھی وہ دل پر کیوں نہ اثر کرتی اس وجہ سے ہم ان کے کلام میں کہیں بھی ٹھہراؤ اور جمود کا گمان بھی نہیں کر پاتے۔ تخلیقت اور آرٹ سے ان کا کلام کبھی عاری نہیں رہتا اسی لئے کہتے ہیں۔

نہیں نگاہ میں منزل تو جستجو ہی سہی
نہیں وصال میسر تو آرزو ہی سہی
نہ تن میں خون فراہم نہ اشک آنکھوں میں
نمازِ شوق تو واجب ہے بے وضو ہی سہی
کسی طرح تو جمے بزم مے کدے والو
نہیں جو بادہ و ساغر تو ہاؤ ہو ہی سہی

چونکہ فیض کو اپنے وطن سے بے حد لگاؤ ہے اس لئے اسے ہر اعتبار سے تر و تازہ و شاداب دیکھنا چاہتے ہیں چاہے انھیں کتنا ہی انتظار کرنا پڑے کہتے ہیں۔

گر انتظار کٹھن ہے تو جب تلک اے دل
کسی کے وعدۂ فردا کی گفتگو ہی سہی
دیارِ غیر میں محرم اگر نہیں کوئی
تو فیضؔ ذکر وطن اپنے روبرو ہی سہی[1]

مندرجہ بالا غزل پوری کی پوری رومانیت سے پر ہے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں فیضؔ پر رومانیت کا غلبہ تھا جس کی وجہ سے ہر چیز کو وہ اپنے دیدۂ تر سے دیکھتے تھے۔ اسلوب اور طرزِ ادا کے اعتبار سے یہ غزل قدیم روش کی حامل ہے۔ مگر وطن اور وطنیت کے لگاؤ میں ایک نیا اور دلکش انداز عطا کر دیا ہے جو فیضؔ کے علاوہ کہیں اور نظر نہیں آتا۔ دوسری غزل کا بھی کم و بیش یہی انداز ہے جس میں انھوں نے ساغر و بادہ کے ساتھ شہر اور اس کی گلیوں کا ایک حسین امتزاج پیش کیا ہے کہتے ہیں۔

گو سب کو بہم ساغر و بادہ تو نہیں تھا
یہ شہر اداس اتنا زیادہ تو نہیں تھا
گلیوں میں پھرا کرتے تھے دو چار دوانے
ہر شخص کا صد چاک لبادہ تو نہیں تھا

---

[1] نسخہ ھائے وفا غبارِ ایام صفحہ ۸

ہر وقت وہ منزل مقصود کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں جس میں کبھی دم بھر کے لئے بیٹھتے ہیں لیکن پھر جلد ہی انھیں اس کا احساس ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ سکون اور وقفہ دیرپا نہیں ہونا چاہیئے اسی لئے کہتے ہیں۔

منزل کو نہ پہچانے رہِ عشق کا راہی
ناداں ہی سہی ایسا بھی سادہ تو نہیں تھا
تھک کر یونہی پل بھر کے لیے آنکھ لگی تھی
سوکر ہی نہ اٹھیں یہ ارادہ تو نہیں تھا[1]

نذرِ مولانا حسرت موہانی کے عنوان سے جو غزل اس مجموعے میں شامل ہے وہ فیض کی خودداری، سیاسی شعور اور ظالم و جابر طاقتوں کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرنے کا ایک حسین پیکر ہے۔ کچھ بھی ہو فیض کبھی بھی اپنے سیاسی موقف کا دامن کبھی بھی نہیں چھوڑتے اسی بنا پر نہایت زوردار لہجے میں نغمہ سرا ہوتے ہیں :-

مرجائیں گے ظالم کی حمایت نہ کریں گے
احرار کبھی ترکِ روایت نہ کریں گے
کیا کچھ نہ ملا ہے جو کبھی تجھ سے ملے تھے
اب تیرے نہ ملنے کی شکایت نہ کریں گے

---

[1] نسخہ ھائے وفا — غبارِ ایام — صفحہ ۱۴

شب بیت گئی ہے تو گزر جائے گا دن بھی
ہر لحظہ جو گزری وہ حکایت نہ کریں گے

وہ فقر، استغنا، قناعت وغیرہ کے ساتھ ساتھ اپنے نصب العین پر قائم و دائم رہنا اپنا عین فریضہ سمجھتے ہیں اسی لئے کہتے ہیں۔

یہ فقر دلِ زار کا عوضانہ بہت ہے
شاہی نہیں مانگیں گے ولایت نہ کریں گے
ہم شیخ نہ لیڈر نہ مصاحب نہ صحافی
جو خود نہیں کرتے وہ ہدایت نہ کریں گے[1]

فیض اپنے ترانے کی دھن میں سرگرم کار ہیں ان کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ تادمِ آخر اپنا پیام پیش کرتے جائیں۔ کیا کرب انگیز غزل کہی ہے۔

ہم مسافر یوں ہی مصروفِ سفر جائیں گے
بے نشاں ہو گئے جب شہر تو گھر جائیں گے
کس قدر ہوگا یہاں مہر و وفا کا ماتم
ہم تری یاد سے جس روز اتر جائیں گے

---

[1] نسخہ ہائے وفا غبارِ ایام صفحہ ۲۰

غبارِ ایام کی غزلوں سے بھی اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ سرمایہ داری کے بڑھتے ہوئے انسان دشمن اور علم و ادب اور کلچر دشمن رویّے کے سبب اب سخن فہمی و سخن سنجی کم ہوتی جا رہی ہے۔ اسی احساس غم کے تحت کہتے ہیں۔

جوہری بند کیے جاتے ہیں بازارِ سخن
ہم کسے بیچنے الماس و گہر جائیں گے
نعمتِ زیست کا یہ قرض چکے گا کیسے
لاکھ گھبرا کے یہ کہتے رہیں مرجائیں گے

لیکن یہ بھی فیض کی ایک خصوصیت ہے کہ خواہ کچھ بھی ہو وہ ہر حال میں پُر امید رہتے ہیں۔ عارضی رنج و غم کی ایسی کیفیت کو وہ عارضی سمجھتے ہیں، چنانچہ کہتے ہیں۔

شاید اپنا بھی کوئی بیت حدی خواں بن کر
ساتھ جائے گا مرے یار جدھر جائیں گے[1]

وہ ہر حال میں اپنے جادہ پر خوشی کے ساتھ گامزن رہنا چاہتے ہیں اسی وجہ سے کہتے ہیں۔

---

[1] نسخہ ہائے وفا　　غبارِ ایام　　صفحہ ۲۱

سرخوشی میں یونہی دل شاد و غزل خواں گزرے
کوئے قاتل سے کبھی کوچۂ دلدار سے ہم [1]

جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا ہے کہ فیض امید اور رجا کا دامن کبھی بھی نہیں چھوڑتے حالات کتنے بھی ناسازگار ہوں امید کی کرن کسی نہ کسی شکل میں انھیں پھوٹتی ضرور دکھائی دیتی ہے۔ جس کا اظہار جا بہ جا ہم ان کے اشعار میں پاتے ہیں۔

پھر آئینۂ عالم شاید کہ نکھر جائے
پھر اپنی نظر شاید تا حدِّ نظر جائے

اس طرح کشمکش سے بھی وہ ایک نتیجہ نکالتے ہیں:۔

یا خوف سے در گزریں یا جاں سے گزر جائیں
مرنا ہے کہ جینا ہے اک بات ٹھہر جائے [2]

دوسری غزل میں طنزیہ انداز میں کہتے ہیں کہ جو لوگ اس معاشرہ میں

---

[1] نسخہ ھائے وفا — غبارِ ایام — صفحہ ۲۲
[2] نسخہ ھائے وفا — غبارِ ایام — صفحہ ۳۱

اصلاحات کے علمبردار ہیں حقیقت میں وہی لوگ سماج کی اصلاح کی راہ میں سدِ باب بنتے ہیں اور وہ انھیں راست بازی اور راست گفتاری سے دور رکھتے ہیں جس کا انجام ظاہر ہے کہ کسی صورت میں خوش آئند نہیں نکلتا :-

ان کو اسلام کے لٹ جانے کا ڈر اتنا ہے
اب وہ کافر کو مسلماں نہیں کرنے دیتے
جان باقی ہے تو کرنے کو بہت باقی ہے
اب وہ جو کچھ کہ مری جاں نہیں کرنے دیتے[1]

اس مجموعے کی آخری غزل بھی فیض کی بلند نگاہی اور فراستِ طبع کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔ یہ غزل نومبر ۱۹۸۴ء میں نظم ہوئی۔ اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید انھیں اپنے چل چلاؤ اور موت کی آمد کی آہٹیں محسوس ہونے لگی تھی شاید اسی باعث کہتے ہیں۔

اجل کے ہاتھ کوئی آ رہا ہے پروانہ
نہ جانے آج کی فہرست میں رقم کیا ہے[2]

۱۔ نسخہ ہائے وفا غبارِ ایام صفحہ ۳۳

۲۔ نسخہ ہائے وفا غبارِ ایام صفحہ ۳۴

یہیں پر میں پروفیسر فتح محمد ملک کے ایک اقتباس سے اپنی بات ختم کرنا چاہتا ہوں۔ پروفیسر موصوف لکھتے ہیں۔

" فیض کی جان جہاں ہماری قدیم عشقیہ شاعری کے جفا پیشہ معشوق کی مثال قتالۂ عالم ہے تو خود وہ کلاسیکی غزل کے جنوں پیشہ عاشق کی مانند مسلسل جفا او ر پیہم ستم کے سامنے سینہ سپر ہیں۔ لیلائے وطن سے اپنے عشق کی واردات اور راہِ وفا میں اپنی ثابت قدمی کی روداد بیان کرتے وقت فیض نے لیلیٰ اور مجنوں کے روائتی کرداروں کو اپنے تمام تر علائم و رموز کے ساتھ یوں پیش کیا ہے کہ اگر ہم فیض کے سیاسی مسلک اور فیض کی انقلابی جدوجہد سے آشنا ہوتے تو یہ شاعری ہمیں سراسر روایتی اور رسمی شاعری نظر آتی لیلائے وطن پر رقیب کے جابرانہ تسلط اور فیض کے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں چونکہ ہمارے زمانے کے جیتے جاگتے حقائق ہیں اس لیے یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ فیض نے واقعتاً سنتِ منصور و قیس کو زندہ کیا ہے ان کی جذباتی سرگزشت ہماری قومی تاریخ کی آئینہ دار ہے۔ اگر پاکستان کی شاہراہوں میں تحریک پاکستان

کے خواب سنگسار نہ ہوتے تو فیضؔ کی شعری کائنات میں بھی عاشق، معشوق اور رقیب کی روایتی مثلث باقی نہ رہتی اور ان کی شاعری فراقِ ظلمت و نور اور وصالِ منزل و گام کی نغمہ ریز بشارت بن جاتی ۔"[1]

---

[1] فیضؔ شاعری اور سیاست فتح محمد ملک صفحہ ۸۷

باب ہفتم

فیضؔ کے ہم عصر چند ممتاز غزل گو شعراء

"کسی بھی شاعر و ادیب کی زندگی کے مختلف ادوار کا جائزہ لئے بغیر اس کے علمی و فنی کارناموں کو پوری طرح نہیں پرکھا جا سکتا اور جب کسی ایسے ادیب و شاعر کا مطالعہ پیش نظر ہو جو اپنی ساری شخصیت سے فکر و شعور علم و دانش اور بصیرت و آگہی کی دولت لٹا کر نہ صرف گذشتہ ربع صدی کے فن کاروں کا رہنما بنا رہا ہو بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے ایک واضح نصب العین مرتب کرکے راستہ کو ایسا ہموار و دلکش بنا دیا ہو کہ اس پر گامزن ہونا سب کے لئے آسان بن گیا ہو۔ تو اس کی ادبی زندگی کے مختلف مراحل کو پرکھے بغیر تجزیہ کی ذمہ داری پوری نہیں ہو سکتی۔"[۱]

پروفیسر سید محمود الحسن کی مذکورہ بالا تحریر حالانکہ "احتشام حسین" نامی مضمون سے اخذ کی گئی ہے لیکن یہ تحریر ایسی جامع ہے کہ اس بنیاد پر ہم کسی بھی فنکار اور اس کی تخلیقات کو پرکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ اسے بطور سرنامہ ہم نے اس لئے لکھ دیا ہے کہ یہ ہمارے اپنے اس وقت کے احساسات و جذبات کی بھی اس طرح ترجمانی کر رہی ہے کہ اس سے بہتر

۱؎ پروفیسر سید محمود الحسن

اظہار یا ترجمانی اپنے بس کی بات نہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ موازنے اور تقابلی مطالعے کے بغیر فنکار کی عظمت یا اس کے کھرے کھوٹے ہونے کی بات کیفیتی لحاظ QUALITATIVE BASIS سے پوری طرح ابھر ہی نہیں سکتی۔ اسی احساس کے تحت ہم اردو غزلگوئی میں فیض اور ان کے چند اہم معاصرین کے متعلق کچھ تقابلی باتیں پیش کر دینا چاہیں گے۔ کچھ اور شعراء کا ذکر یا ان کے کلام سے دو چار مثالیں بغیر فرق تقدیم و تاخیر اس لئے بھی آپڑی ہیں کہ ان سے اردو غزل گوئی کی دنیا میں نئے موڑ آئے ہیں۔

فیض احمد فیضؔ کے ہم عصر ممتاز غزل گو شعراء کی فہرست بہت طویل ہے اور ان شعراء کو مختلف صفوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی صف میں وہ شعراء ہیں جو فیضؔ سے دس بارہ بلکہ پندرہ سال تک بڑے ہیں مگر مشاعروں اور دوسری ادبی نشستوں میں فیضؔ ان کے ساتھ شریک رہے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جن سے موصوف کی خط و کتابت بھی رہی ہے مولانا فضل الحسن حسرتؔ موہانی، جناب شبیر حسن خان جوشؔ ملیح آبادی، جناب رگھوپت سہائے فراقؔ گورکھپوری، ہادی مچھلی شہری، رازؔ چاند پوری، سراجؔ لکھنوی، جگت موہن لال رواںؔ، سیمابؔ اکبرآبادی، ترلوک چند محرومؔ، ظفر علی خاں مدیر روزنامہ زمیندار، جوشؔ ملسیانی، اثرؔ رامپوری، غلام بھیک نیرؔنگ، جگرؔ مرادآبادی، اصغرؔ گونڈوی، اثرؔ لکھنوی

اور کچھ دوسرے بھی۔

ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو محض روایاتی غزل اور تصوف اور مناظر قدرت کے ہی علم بردار رہے۔ ہادی مچھلی شہری، راز چاند پوری، سراج لکھنوی، جگت موہن لال رواں جو اپنی رباعیات کی وجہ سے مشہور ہوئے سیماب اکبرآبادی، اثر رام پوری، غلام بھیک نیرنگ، اصغر گونڈوی جو اپنی صوفیانہ غزلوں کے باعث شہرت رکھتے ہیں وغیرہ۔ کچھ ایسے ہیں جنھوں نے روایاتی غزل سے علیحدگی اختیار کرلی۔ اور اپنے لیے نظموں کا پیرایہ اختیار کیا، ان میں جوش ملیح آبادی کو سبقت حاصل ہے مولانا حسرت موہانی نے غزل کے اسلوب میں ہی ترقی پسندانہ جدت پیدا کی اور قریب قریب یہی حال اثر لکھنوی، جگر مرادآبادی اور فراق گورکھپوری کا رہا۔ فراق نے ترقی پسندانہ رجحانات کا اظہار غزلوں کے ساتھ ساتھ نظموں میں بھی کیا ہے۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی اور خاص طور سے پہلی جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد لارڈ منٹو مارلے اور چیمس فورڈ کی رپورٹ شائع ہونے کے بعد ہندوستانی رہنماؤں کی جو مایوسی ہوئی اس کا تفصیلی بیان ہم پہلے دے چکے ہیں۔ مگر یہ بھی ہوا کہ حصولِ آزادی کی خواہش تیز سے تیز تر ہوگئی۔ ساتھ ہی ساتھ برٹش حکومت کے ناروا سلوک سے نفرت کا جذبہ بڑی تیزی سے بیدار ہوا۔ مارکسی خیالات نے ہندوستانی جوانوں میں روایاتی مذہب سے بے زاری کے احساسات پیدا کیے اور

نام نہاد مذہبی روایات سے چھٹکارا پانے کا بھی جوش پیدا ہوا حکومت برطانیہ نے بھی تشدد اور سختی سے کام لیا۔ کانگریسی اور مسلم لیگی رہنماؤں کے ساتھ شاعروں اور ادیبوں کو بھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈھکیل دیا گیا۔ فیض احمد فیض کے ایسے پیش رو شعراء میں مولانا حسرت موہانی اور جوش ملیح آبادی کو عظیم نمائندہ کہا جا سکتا ہے۔ جنھوں نے برٹش حکومت کے ناروا سلوک اور بیجا ایکٹوں کے خلاف احتجاجاً آواز اٹھائی اور نفرت کا جذبہ پیدا کیا۔

روزنامہ ہمدم لکھنؤ ۴ر اگست ۱۹۲۷ء کے حوالے سے عتیق احمد صدیقی نے حسرت کی سیاسی زندگی پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔ جو حسرت کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:-

"میرا پروگرام ہمیشہ سے امپیریلزم کو تباہ کرنے کی
کوشش پر مبنی رہا ہے اور یہی رہے گا اور جو پارٹی
بھی اس پروگرام کو ہاتھ میں لے گی اس کا ساتھ میں
تہہ دل سے شریک اور اس کا ہمدرد رہوں گا۔"

اپنی نظربندی کے آخری ایام میں ۱۲ر ستمبر ۱۹۱۸ء کو انقلاب روس ۱۹۱۷ء سے متاثر ہو کر ایک غزل کہی جس کا ایک شعر خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

عشاق منتظر کو یہ صبح نو مبارک
خورشید اک نرالا بالائے بام نکلا

اس نرالے خورشید کی تابانی کو دیکھ کر انھیں اپنے ملک کی محرومی بھی یاد آگئی۔

محروم اک ہمیں ہیں اک مقصد تمنا
دنیا میں ورنہ کس کا تجھ سے نہ کام نکلا

حسرت جیسا رومانی غزل گو اس وقت کے سیاسی واقعات اپنی غزلوں میں سموئے ہوئے ہے۔

جوش ملیح آبادی کی شاعری کے بارے میں ناقدین فن خواہ کتنے ہی مختلف الخیال رہے ہوں لیکن اس بات کی ہر نقاد تصدیق کرتا ہے کہ پینتیس چالیس سال کے عرصے میں انھیں جو شہرت حاصل ہوئی ہے وہ ہندوستان کے سیاسی اور سماجی حالات کے اظہار کی بدولت ہوئی ہے۔

۱۹۲۴ء میں جب وہ نظام حیدرآباد کی دارالترجمہ میں ناظر ادب کی حیثیت سے ملازم ہوئے تو ان کی زندگی میں ایک نیا موڑ پیدا ہوا مرزا ہادی رسوا، مولانا عبدالماجد دریاآبادی، فانی بدایونی اور وہاں نظام

حیدرآباد کے وزیر مہاراجا کشن پرشاد وغیرہ کی صحبتوں میں ان کی شاعری کا رنگ زیادہ سے زیادہ نکھرنے لگا۔ وہاں کوئی بارہ سال اس عہدہ پر فائز رہے۔ ۱۹۳۶ء میں حیدرآباد چھوڑ کر دہلی آئے اس وقت ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوچکا تھا اور انھوں نے بڑے زوروں میں آواز حق بلند کی

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

دہلی سے انھوں نے ایک رسالہ "کلیم" کے نام سے نکالا۔ جوشؔ ترقی پسند ادبی تحریکات سے وابستہ رہے اور اشتراکیت اور مذہبی روایات کے خلاف نظمیں لکھتے رہے۔

یہ تحریک روز بروز بڑھتی گئی اور شعراء و ادباء کی کثیر تعداد اس گروہ میں شامل ہوتی گئی جس میں خاص طور سے مخدومؔ محی الدین، اسرار الحق مجازؔ، معین احسن جذبیؔ، سردار جعفریؔ، کیفیؔ اعظمی، غلام ربانی تاباںؔ، جاں نثار اخترؔ۔ مجروحؔ سلطانپوری، ساحرؔ لدھیانوی، مسعود اختر جمالؔ، وامقؔ جونپوری، سلامؔ مچھلی شہری، وغیرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اب ان میں سے بغیر کسی فرق تقدیم و تاخیر و تفصیل کے صرف جذبیؔ، مجروحؔ اور ساحرؔ کے کلام کا قدرے تفصیلی تجزیہ پیش خدمت ہے

معین احسن جذبی

اردو شاعری میں جہاں بہت پر گو شعراء ملتے ہیں وہیں کم گو شعراء کی بھی کمی نہیں۔ فیض، مجاز اور جذبی بھی کم گوئی کے قبیل کے شاعر محسوس ہوتے ہیں۔

فیض کی طرح جذبی نے بھی کم گفتاری سے کام لیا ہے۔ اردو کے مشہور و معروف شاعر اور ممتاز زبان داں شاعر داغ نے تو اس خصوصیت پر ایسی گہری چوٹ کی ہے کہ دل بے ساختہ اسے پیش کر دینے پر مجبور ہے

ملے تو حشر میں لے لوں زبان ناصح کی
عجیب چیز ہے یہ طول مدعا کے لئے

فیض کا آرٹ اس کے برعکس ہے اور اسے ہم یہاں انھیں کی زبان میں پیش کئے دیتے ہیں۔

جواب واعظ چابک زباں میں فیض ہمیں
یہی بہت ہیں جو دو حرف سادہ رکھتے ہیں

معین احسن جذبی نے بھی اسی آرٹ کو اپنایا اور دو حرف سادہ کی زبان میں شاعری کی۔ حقائق زمانہ کو موصوف نے نہایت چابکدستی کے ساتھ اپنی غزلوں میں قلمبند کیا۔ مثال کے لیے انھیں اشعار پر ایک نظر ڈالی جاسکتی ہے جو مافی الضمیر کو پوری طرح واضح کرتے ہیں۔

ے شریک محفل دار و رسن کچھ اور بھی ہیں
ستم گرو ابھی اہل کفن کچھ اور بھی ہیں

ے ابھی نسیم نے مانی نہیں سموم سے ہار
ابھی تو معرکہ ہائے چمن کچھ اور بھی ہیں

ے دل گداز نے آنکھوں کو دے دے آنسو
یہ جانتے ہوئے غم کے چلن کچھ اور بھی ہیں

یا

ے جب کشتی ثابت وسالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

ے تو اور غم الفت جذبی، ہم کو تو یقین آئے نہ کبھی
جس قلب پہ ٹوٹے ہوں پتھر اس قلب پہ نشتر ٹوٹ گئے

یا

اے موجِ بلا ان کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
جو لوگ ابھی تک کشتی سے ساحل کا نظارہ کرتے ہیں

جذبی کے اس شعر سے یہ حقیقت صاف واضح ہو جاتی ہے کہ وہ مسائلِ زمانہ و زندگی کے حل کے سلسلے میں محض ایک تماشائی کے رویے سے کسی بھی طرح مطمئن نہیں وہ سخت سے سخت حالات میں بھی جانبداری و حصہ داری یعنی PARTICIPATION کے قائل ہیں جب وہ 'موجِ بلا' کو مدعو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جو ان کے حسبِ دلخواہ عمل کی تکمیل میں ممد و معاون ہو۔

جب جیب میں پیسے ہوتے ہیں جب پیٹ میں روٹی ہوتی ہے
اس وقت یہ پتھر ہیرا ہے اس وقت یہ شبنم موتی ہے

یہی ذہنی رویہ فیض کے یہاں بھی ملتا ہے، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کئی گنا زیادہ ملتا ہے، جگہ بہ جگہ فیض بہ اصرار یہی کہتے نظر آتے ہیں کہ حیاتِ انسانی کی اجتماعی جد و جہد کا ادراک اور اس جد و جہد میں حسبِ توفیق شرکت، زندگی کا تقاضا ہی نہیں، فن کا بھی تقاضا ہے۔ غرض یہ کہ فیض نے اردو غزل گوئی میں جو روش نکالی تھی یعنی

وہی کہ :

سہ ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

اسی روشنی کو جذبیؔ نے بھی بہت ہی خوبی کے ساتھ اپنایا اور آگے بڑھایا۔ فیضؔ کی طرح جذبیؔ کے یہاں بھی حقیقت کو دُگنی طاقت کے ساتھ پیش کر دینے کا شاعرانہ آرٹ ملتا ہے۔ جذبیؔ کا شعری مجموعہ "سخنِ مختصر" بھی اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے۔ جذبیؔ کے اشعار کا مطالعہ کر کے دل یہی چاہتا ہے کہ یہ سخن کچھ اور جاری رہے لیکن "دو حرفِ سادہ" جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے اس وصف کو جذبی نے اس حد تک مرکوز کیا کہ بعض، مسخروں اور پھبتی کسنے والوں کو ایسے فقرے چست کر دینے کا موقع مل گیا کہ جذبیؔ کے یہاں تو "سخنِ مختصر" کے بعد "سخن صفر" ہی ہے حالانکہ حقیقت تو ہمارے خیال سے یہی ہے کہ جہاں اور چیزوں کو محض مقدار QUANTITY سے نہیں پرکھا جاتا وہاں شاعری بالخصوص غزل کوئی ایسے فن لطیف کو مقدار کے حساب سے کیسے پرکھا جائے گا۔ اسے تو ہم کیفیت QUALITY کی ہی کسوٹی پر پرکھیں گے۔ جیسے یہی شعر لے لیجئے۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

موزوں کا کیا یہ ایک شعر ایسے ویسے بڑے شعری مجموعوں پر بھاری نہیں رہے گا۔

جذبی نے اپنی شاعری کی شروعات غزل سے کی ان کا غم پسند وحزنیہ انداز مزاج غزل کی شاعری سے زیادہ ہم آہنگ تھا۔ غزل نرمی گفتار کی طالب ہے۔ جذبی کے فن کی نشو ونما نرمی گفتار اور درد و کسک کے سلسلے میں فانی کی صحبت نے بھی ان پر گہرے نقوش ڈالے۔ اسی سلسلے میں استاذی ڈاکٹر ظل حسنین فرماتے ہیں۔

"غزل کا مطالبہ نرم زبان اور لوچ دار بیان کا ہوتا ہے اور پھر اگر کسی خوش مذاق غزل گو کی صحبت نصیب ہوجائے تو اس نرمی اور لوچ میں وہ پختگی آجاتی ہے کہ عمر بھر نہیں جاتی۔ جذبی کالج کی تعلیم کے زمانے میں فانی سے ملے ان کی صحبت و کلام نے جذبی کی اٹھتی شاعری پر اپنی چھاپ لگادی۔ اول تو جذبی کا فطری مذاق اور پھر اس پر ایک بڑے فن کار کی زبان دانی کا سہارا سونے میں سہاگا ہوگیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جذبی کے انداز بیان میں دلکش اور طرز
تخیل میں انفرادیت آگئی۔ لفظوں کا انتخاب اور
ان کی ترتیب میں وہ موسیقیت کلام میں پیدا ہو
گئی جو ایک اچھے شاعر کے یہاں ہوتی ہے۔ جذبی کے
شاعرانہ شعور کی نشو ونما میں ماحول کا زبردست
ہاتھ ہے۔ جب ان کے کلام کے شباب کا زمانہ
آیا تو ہندوستان میں آزادی کی تحریک شباب پر
تھی۔ اسی زمانہ میں ترقی پسند تحریک بھی شروع
ہو گئی تھی۔ زندگی کی کش مکش وجد وجہد فضا میں
چھا گئی تھی۔ ہر پڑھا لکھا آدمی ذہنی طور پر ان
باتوں سے متاثر ہو رہا تھا۔ جذبی بھی ترقی پسندی
سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس کا ثبوت جا بجا
ان کے کلام میں ملتا ہے۔ اسی تحریک کے آئینہ میں
وہ حیات کا عکس دیکھتے تھے اور اسی کے متعین
کردہ اصول پر گامزن ہونے میں آسودگی ذہن
تلاش کرتے تھے۔ چنانچہ ان کا نظریہ زندگی
اس محور پر گردش کرتا رہا اور وہ اپنی محسوسات
کو دنیا کے لئے پیام بنا کر نظموں اور غزلوں میں

پیش کرتے رہے ہیں۔[1]"

اسی ضمن میں استاد محترم جذبی پر ترقی پسند تحریک کا اثر دکھاتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور کی تصنیف "نئے اور پرانے چراغ" سے لکھتے ہیں۔

"ترقی پسند تحریک سے جذبی کو یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ان کی داستان میں سیکڑوں دکھے ہوئے دلوں کی دھڑکن آگئی۔ مے ناب میں انھیں زہر کی تلخی محسوس ہونے لگی۔ محبوب کی رنگینی کی یاد وہ دل سے محو تو نہ کر سکے مگر وہ شوق تصور، اور ذوق فغاں، جو شاید انھیں اچھا شاعر تو بنا دیتا مگر انھیں بیسویں صدی کا اور جنگ عظیم کے بعد کا اور اس نسل کا شاعر نہ بنا سکتا،...... رخصت ہو گیا۔[2]"

لیکن اس طرح کے موضوعات و مواد فیض کی غزلوں میں براہ راست نمایاں نہیں ہوئے۔ البتہ جذبی کی شاعری میں انھیں نمایاں حیثیت ضرور حاصل ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

---

[1] اردو شاعری اور مسائل زمانہ — ڈاکٹر ظل حسنین — صفحہ ۲۱۶

[2] اردو شاعری اور مسائل زمانہ — ڈاکٹر ظل حسنین — صفحہ ۲۱۷

ان بجلیوں کی چشمکِ باہم تو دیکھ لیں
جن بجلیوں سے اپنا نشیمن قریب ہے

شغلِ مے کرتا پر اسے کاش نہ ہوتا محسوس
تلخئ زہر بھی تلخئ مےِ ناب میں ہے
چھیڑتا ساز پر آگاہ نہ ہوتا اے کاش
اک شرارہ سا بھی پھر جنبشِ مضراب میں ہے

کاش مفلس کے تبسم سے نہ چلتا یہ پتہ
کتنے ناخنوں کی سکت غیرتِ بیتاب میں ہے
کاش توپوں کی گرج میں نہ سنائی دیتا
جذبۂ غیرتِ مظلوم ابھی خواب میں ہے

جذبی کے یہاں رمز و کنایہ کا استعمال اس قدر چابکدستی اور مہارت سے ہوتا ہے کہ قاری بغیر کسی دشواری کے اسے سمجھ لیتا ہے۔
جیسا کہ استاد محترم ڈاکٹر ظل حسین لکھتے ہیں۔

"جذبی کو ہمیشہ اس کا خیال رہتا ہے کہ رمز و کنایہ کے صرف میں ابہام کیا الجھاؤ نہ پیدا ہو۔ غالباً یہ انکے

مزاج اور طرز تخیل کی صفائی و سادگی کی دلیل ہے جو ان کے فن کو حسین تر بنا دیتی ہے"۔[1]

لفظوں کے انتخاب اور ترتیب میں جذبی بہت احتیاط و سوجھ بوجھ سے کام لیتے ہیں۔ ان کے فن کی بنیاد ادبی نبض شناسی پر ہے۔ دقیق باتوں کو بھی وہ آسان الفاظ و دل پسند ترکیب کے ساتھ پیش کرتے ہیں یہ طریق کار بہ ظاہر آسان لیکن حقیقت میں از بس مشکل و دشوار ہے۔

تخلیقیت فن کی جان ہے اور فن ادب بقول پریم چند' زندگی سے پیچھے نہیں بلکہ آگے چلتا ہے' چنانچہ حقائق زندگی کی کھوج اور ان کی آسان ترسیل تمام تر تہ داری کے ساتھ اور انھیں تابع فن بنا کر پیش کر سکنا ہی ادیب یا شاعر کا سب سے بڑا کام ہے اور اس منزل میں بالخصوص غزل گوئی کے مرحلے میں بہ حیثیت مجموعی ہمیں فیض جذبی سے کہیں آگے نظر آتے ہیں۔

بہ طور ثبوت یہ چند اشعار پیش خدمت ہیں:-

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات انکو بہت ناگوار گزری ہے

چمن پہ غارت گلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

---

[1] اردو شاعری اور مسائل زمانہ ڈاکٹر ظل حسنین صفحہ ۲۱۸

عبدالحئی ساحر لدھانوی

یہ شاخِ نور جسے ظلمتوں نے سینچا ہے
اگر پھلی تو شراروں کے پھول لائے گی
نہ پھل سکی تو نئی فصلِ گل کے آنے تک
ضمیرِ ارض میں اک زہر چھوڑ جائے گی (ساحر)

ساحر کے ان اشعار میں جہاں اپنے عہد کی بہت صحیح نباضی ملتی ہے وہیں یہ حقیقت بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ شاعر محض اپنے زمانے کی ہی خوراک نہیں تھا بلکہ اس نے بہت ہی زیادہ تاثیر کے ساتھ آنے والے زمانے کی بھی کامیاب نشان دہی کر دی۔ فیض کے یہاں بھی ایسا ہی وصف ملتا ہے :-

انتشار ایسا کہ رگ رگ میں ہے محشر برپا
اور سکوں ایسا، کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے (فیض)

ہمارے حالات آج تو اور بھی دشوار، دشوار سے بھی دشوار تر ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسے شدید انتشار کے حالات میں فنی موشگافیوں کی بات

نہیں ہو سکتی چنانچہ ہم ساحر کی شاعری کے نچوڑ یعنی ESSENCE پر زیادہ توجہ دینا چاہیں گے۔ جب ہم فیض پر سوچتے رہے ہیں تو ساحر بھی ہمیں اکثر و بیشتر یاد آتے رہے ہیں۔ اس کے اسباب تو متعدد ہوں گے لیکن نمایاں طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ کم عمری کے ہی زمانے سے اس فنکار کی شاعرانہ صلاحیت اور فنکاری فیض کے ہی طرح جلد پختہ کاری کی منزلوں کو طے کرنے لگی اور ان کا غیر معمولی دلکش انداز بیان ہمارے دامن دل کو اپنی طرف کھینچنے لگا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ساحر کی شاعری اپنے اندر کمال کی جادوگری رکھتی ہے۔ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ اتنا ہوشربا اور انداز بیان اتنا جاذب ہے کہ ہم مسحور ہو کر رہ جاتے ہیں۔ حالانکہ ساحر نے اپنے کلام میں تلخیوں کی بات زیادہ کی ہے اور غالباً اسی بنا پر انھوں نے اپنے پہلے شعری مجموعے کے لیے "تلخیاں" کا نام منتخب کیا، لیکن پھر بھی اس کے اشعار ہمارے دل و دماغ کا نہایت آسانی کے ساتھ جز و بنتے جاتے ہیں:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں (ساحر)

فیض بھی تلخ نوائی کو خوش گوار چیز نہیں سمجھتے لیکن مجبوری کے تحت انھیں اپنی غزلوں تک میں اسے پیش کرنا پڑتا ہے:

لب پر ہے تلخئ غمِ ایّام ورنہ فیضؔ
ہم تلخئ کلام پہ مائل ذرا نہ تھے (فیضؔ)

ساحرؔ کے کلام کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی باتیں اکثر و بیشتر بہت ہی دل نشین و سادہ انداز میں پیش کرنے پر قادر نظر آتے ہیں۔

دھن دولت کی دنیا شاید راس نہ آئی ساحرؔ کو
سونے کی زنجیر نے باندھا کھلی فضا کے طائر کو
گیت فضا میں گونج رہے ہیں مست الست اور البیلے
بنجارے کو کس نے روکا کس نے باندھا شاعر کو

ساحرؔ کے انداز کلام کا ایک ہلکا سا اندازہ ذیل کے اشعار سے بھی ہمارے سامنے آجاتا ہے:-

تنگ آچکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بیدلی سے ہم
ابھریں گے ایک بار ابھی دل کے ولولے
گو دب گئے ہیں بارِ غمِ زندگی سے ہم
اللہ رے فریبِ مشیّت کہ آج تک
دنیا کے ظلم سہتے رہے خاموشی سے ہم

نہ منہ چھپا کے جئے ہم، نہ سر جھکا کے جئے
ستم گروں کی نظر سے نظر ملا کے جئے
اب ایک رات اگر ہم جئے تو کم ہی سہی
یہی بہت ہے کہ ہم مشعلیں جلا کے جئے

زندگیاں دونوں ہی طرح کی ہوتی ہیں ہلکی پھلکی زندگیاں تنکے اور پھوس کی مانند چشم زدن میں اڑ جانے والی زندگیاں جن کا رہنا یا نہ رہنا بظاہر برعکس ہوتے ہوئے بھی جیسے برابر سا ہوتا ہے۔ اور ایسی زندگیاں بھی ہوتی ہیں جو باشعور ہوتی ہیں، یا بامقصد ہوتی ہیں، باوزن ہوتی ہیں اور سماجی طور پر خلاق ہوتی ہیں، اس لئے انکا جلد گزر جانا کھلتا ہے۔ ایسے لوگ بطور خاص یاد آتے ہیں۔ ساحر باوجود اس کے کہ کوئی عالمی حیثیت کے شاعر یا غزلگو نہ تھے پھر بھی یاد آتے ہیں اور آئندہ بھی حساس دلوں کے تاروں کو چھوتے رہیں گے۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں جب برطانوی سامراج نے ہندوستان کو کئی ایک ٹکڑوں میں بانٹا تو اور لوگوں کے ساتھ ساتھ ہمارے "دانشور" بھی بھانت بھانت کی بولیاں بولنے لگے کہ "سوراجیہ" آگیا، "آزادی کامل" آگئی وغیرہ وغیرہ۔ اردو شاعری میں بھی یہ آوازیں سنائی دینے لگیں، لیکن باشعور شعراء میں جو آوازیں ممتاز رہیں وہ جوش، فیض، مخدوم اور

ساحر جیسے شعراء کی آوازیں تھیں۔

لیکن حقیقت کچھ اور ہی ہے۔ غزل جو آج بھی ایشیائی شاعری کی بہترین اصناف سخن میں شمار کی جاتی ہے اس کا سبب غزل کی خود اپنی خوبیاں اور خصوصیات ہیں۔ خاص کر اس کا ایجاز و اختصار اس کی ایک بڑی خوبی ہے جسے پایہ کمال تک پہنچانے میں ان گنت فنکاروں کا خون جگر شامل رہا ہے۔ تب اردو شاعری کو قبول عام کا یہ اعزاز حاصل ہوا ہے کہ آج ہم ہر جگہ اس کی جلوہ گری دیکھتے ہیں مثلاً ہندی میں غزل، بنگالی میں غزل، مراٹھی میں غزل، پنجابی میں غزل، تیلگو میں غزل، سندھی میں غزل وغیرہ اس کا عام ثبوت ہے۔ یہی نہیں بلکہ قصیدے میں غزل، مثنوی میں غزل، نظم میں غزل، یہاں تک کہ ناول اور افسانہ جیسی نثری اصناف میں بھی غزل کے اشعار بے ساختہ استعمال ہوتے ہیں جو یقینی طور پر غزل کی مقبولیت ثابت کرتے ہیں۔ "آگ کا دریا" جو جگر کے مصرعہ کا ایک ٹکڑا ہے اور "سفینۂ غم دل" جو فیض کے ایک مشہور مصرعہ کا ایک ٹکڑا ہے اسی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں۔

اردو غزل سماجی و سیاسی معاملات کی پیش کش میں تو دور دور تک احاطہ کئے ہوئے ہے لیکن ہم اگر اپنے پاس کے ہی ایک پسماندہ صوبہ بہار کے ہی کچھ غزل گو شعراء پر ایک سرسری نظر ڈالیں جب بھی یہ حقیقت روز روشن کی طرح سامنے آجاتی ہے۔ مشہور ادیب سہیل عظیم

آبادی اپنے ایک مضمون "بہار کے چند اردو شعراء" کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ :-

"رمز عظیم آبادی ہمارا مزدور شاعر ہے جو رکشا کھینچتا تھا لیکن مسلسل بیماریوں نے اس قابل بھی نہیں رکھا تھا مگر اس کے حوصلے پست نہیں ہوئے وہ سنہرے مستقبل کے خواب دیکھتا ہے اور کہتا ہے" :

ناتراشیدہ صنم خواب سے جاگ اٹھے ہیں
سنگ ہے منتظر تیشۂ فرہاد اے دوست

موصوف کا کہنا ہے کہ بہار کے نوجوان اور ہونہار شعراء اور ادیب ناتراشیدہ صنم کو تیشوں سے کاٹ کر مجسم دیکھنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں ۔ جہاں موصوف نے فنکاروں کی آنے والی نسلوں کے کام کی طرف اشارہ کیا ہے وہیں انھوں نے اس کی کڑی ماضی کے شعراء سے بھی ملائی ہے اپنے مضمون میں انھوں نے بطور خاص جمیل مظہری، یگانہ چنگیزی عظیم آبادی اور ان کے استاد شاد عظیم آبادی وغیرہ کی غزل گوئی پر تبصرہ کیا ہے اور ثبوت میں مذکورہ شعراء کے یہاں سے مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ اپنی اس بحث کا سلسلہ کہ سماجی و سیاسی حقائق کی پیش کش غزل کی روایت رہی ہے وہ موزوں تک سے بھی ملاتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں :

سلہ ماہنامہ نئی قدریں حیدرآباد صفحہ ۴۶

"رام نرائن موزوںؔ بہار کے گورنر تھے اور نواب سراج الدولہ کے معتمد خاص۔ فارسی و عربی وغیرہ کے بڑے عالم تھے۔ اردو میں اشعار کہتے تھے۔ نواب سراج الدولہ کے بیدردانہ قتل کی خبر سُن کر انھوں نے جو شعر کہا وہ آج بھی زبان زد عام ہے[1]۔"

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری (موزوںؔ)

ایسی صورت میں مجروحؔ سلطانپوری کے غزل میں سیاسی پہلو کاری کے دعوے کھوکھلے اور کھوکھلے محسوس ہوتے ہیں۔ اس میں بھی کلام نہیں کہ مجروحؔ کے یہاں غزل گوئی کا سیاسی رنگ بھی اچھا روپ لئے ہوئے ہے۔ لیکن ان کی غزل گوئی کا سیاسی انداز ایسا بھی رہا ہے جو ہمیں فیضؔ یا ساحرؔ کے یہاں نظر نہیں آتا۔ اور ان لوگوں کے یہاں کہیں بھی ایسی سنسنی پھیلانے والی باتیں نہیں ملیں۔

جس طرح سلاست و سادگی ساحرؔ کے کلام کا امتیازی وصف ہے۔ اسی طرح پُر فکر سیاست اور اس کی سائنٹفک بنیاد کی ترجمانی بھی ان کے کلام کی ایک دلاویز خصوصیت ہے۔ رجنی پام دت کا ایک بلیغ طنز یہ جملہ ذہن میں ابھرتا ہے اور جو نہایت صحیح و موزوں معلوم ہوتا

---

[1] نئی قدریں حیدرآباد صفحہ ۴۴

ہے کہ ہندوستان کی یہ عجیب و غریب نیرنگ کاری ہے کہ اس کی سرزمین جتنی ہی زیادہ زرخیز ہے اس کے عوام اتنے ہی زیادہ غریب اور مفلوک الحال ہیں[1]۔

ایسا کیوں ہے ؟ ۔ اس طرح کے بنیادی سوالات ساحر کے کلام میں بھی جلوہ گر ہیں اور ایسے سوالات کو صحیح اور موثر کر سکنا بھی ساحر کی شاعری کا ایک خاصا رول ہے ۔ عمل و ردِ عمل کے سلسلوں میں صحیح جوابات پھر آئیں گے ہی ۔ اصل میں بنیادی سوالات کو اٹھا دینا اور انھیں شعری روپ میں پیش کر دینا بھی ایک اہم کام ہے ۔ مثال :-

آؤ کہ آج غور کریں اس سوال پر
دیکھے تھے ہم نے جو وہ حسیں خواب کیا ہوئے
دولت بڑھی تو ملک میں افلاس کیوں بڑھا
خوشحالیٔ عوام کے اسباب کیا ہوئے ؟
جو اپنے ساتھ ساتھ چلے کوئے دار تک
وہ دوست ، وہ رفیق ، وہ احباب کیا ہوئے ؟

مجروحؔ نے بھی سیاسی رنگ کا اس طرح کا شعر کہا :-

---

[1] رجنی پام دت نیا ہندوستان

مری نگاہ میں ہے ارضِ ماسکو مجروح
وہ سرزمیں کہ ستارے جسے سلام کریں

لیکن بعد میں رفتہ رفتہ یہ رنگ مجروح کے یہاں کم ہوتا گیا۔ جبکہ فیض، مخدوم، وامق، جاں نثار اختر ایسے شعراء کے یہاں ہمیں یہ روش نہیں ملتی۔ مثالاً ساحر کی یہ روش ملاحظہ ہو۔ ذیل کے اشعار لینن سے منسوب ہیں اور چونکہ ان کا انداز یکسر غزل نما ہے اس لئے ہم چند شعر یہاں پیش کئے دے رہے ہیں جو لینن کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔

اخلاق پریشاں تھا، تہذیب ہراساں تھی
بدکار خصوروں سے بدنسل، خبابوں سے
عیار سیاست نے ڈھانپا تھا جرائم کو
اربابِ کلیسا کی حکمت کے نقابوں سے
انساں کے مقدر کو آزاد کیا تو نے
مذہب کے فریبوں سے، شاہی کے عذابوں سے

ساحر نے اپنی شاعری میں اس نکتے کو بھی اجاگر کیا ہے کہ ہمیں شاہ پرستی، اور ہیرو پرستی کے زاویہ ہائے نظر سے ہٹ کر تاریخ کو ایسے

نقطۂ نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے جہاں تاریخ ساز بڑے لوگ نہیں بلکہ عوام ہیں۔ سائنٹفک تاریخی شعور کی جھلکیاں ساحر کے کلام میں عام ہیں یہاں تک کہ غزلوں کے ساتھ ساتھ ان کے عام سہل اور مختصر غزلیہ گیتوں تک میں بھی آگئی ہیں چند مثالیں :

دل کے نازک جذبوں پر بھی راج ہے سونے چاندی کا
یہ دنیا کیا قیمت دے گی سادہ دل انسانوں کی

سنسار سے بھاگے پھرتے ہو بھگوان کو کیا تم پاؤ گے
اس لوک کو بھی اپنا نہ سکے اس لوک میں بھی پچھتاؤ گے
یہ پاپ ہے کیا یہ پنیہ ہے کیا ریتوں پہ دھرم کی مہریں ہیں
ہر یگ میں بدلتے دھرموں کو کیسے آدرش بناؤ گے

مذکورہ بالا قسم کے اشعار کے لب و لہجہ پر ہندی کے عام و سہل الفاظ و تراکیب غالب دکھائی دیتی ہے۔ لیکن پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے[1] کہ اردو غزل گوئی کے رنگ ڈھنگ پر بھی انھیں قدرت حاصل ہے جبھی وہ اس طرح کے کتنے ہی کامیاب اشعار کہہ سکے ہیں :۔

---

[1] غزل انسائکلوپیڈیا ڈاکٹر ذکی کاکوروی صفحہ ۵۳۴

ہر شے قریب آکے کشش اپنی کھو گئی
وہ بھی علاجِ شوق گریزاں نہ کر سکے

حقیقتیں ہیں سلامت تو خواب بہتیرے
ملول کیوں ہو جو کچھ خواب رائگاں نکلے

ہر ایک ہاتھ میں لے کر ہزار آئینے
حیات بند دریچوں سے بھی گزر آئی

مانا کہ اس زمیں کو نہ گلزار کر سکے
کچھ خار کم تو کر گئے گزرے جدھر سے ہم (ساحر)

اس سلسلے میں جب ہم فیض کی غزل گوئی پر دھیان دیتے ہیں تو ان کے یہاں ایسے جذبات و احساسات و خیالات زیادہ نکھرے اور سنورے ہوئے روپ میں نظر آتے ہیں :۔ مثال:

اب بھی خزاں کا راج ہے لیکن کہیں کہیں
گوشے چمن چمن میں غزلخواں ہوئے تو ہیں

ان میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و دل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں
ہے دشت اب بھی دشت مگر خونِ پا سے فیض
سیراب چند خارِ مغیلاں ہوئے تو ہیں

ساحر کا اندازِ فکر اور اندازِ بیان ترچھا (OBLIQUE) نہیں ہے بلکہ بیشتر یہ بیانیہ اور راست قسم کا ہے لیکن پھر بھی غزلیہ انداز کا بناؤ سنگار اور اس کا نکھار بھی قابلِ دید ہے :

پھر نہ کیجئے مری گستاخی نگاہی کا گلہ
دیکھئے آپ نے پھر پیار سے دیکھا مجھ کو

طرب زادوں پہ کیا گزری صنم خانوں پہ کیا گزری
دلِ زندہ ترے مرحوم ارمانوں پہ کیا گزری
زمیں نے خون اگلا آسماں نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دن بدلے تو انسانوں پہ کیا گزری

ڈرتا ہے زمانے کی نگاہوں سے بھلا کیوں
انصاف ترے ساتھ ہے، الزام اٹھا لے

کیا خاک وہ جینا ہے جو اپنے ہی لئے ہو
خود مٹ کے کسی اور کو مٹنے سے بچا لے

کنھیا لال کپور اردو مزاح نگاری میں ایک مانی جانی ہستی ہیں خاکہ نگاری میں انھیں بڑی مہارت حاصل تھی۔ چنانچہ ایک جگہ موصوف نے ساحر کا خاکہ یوں اڑایا ہے کہ وہ "عمر بھر مارکس کا فلسفہ جس حد تک سمجھ سکے نغموں میں قلم بند کرتے رہے ...... نمونۂ کلام! طوائف! مزدور!"

اس استحصالی سماج میں مزدور کے استحصال سے کون انکار کر سکتا ہے۔ علامہ اقبال نے ذیل کے شعر میں اس حقیقت پر کتنی اچھی روشنی ڈالی:

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ

اب رہی بات فیض کی تو ان کے کلام میں بھی ایسے ہی موضوعات کو اہمیت حاصل ہے۔ ثبوت کے لیے فیض کی یہ چند سطریں قابل توجہ ہیں۔

"لیکن ہم لوگ اس دور کی ایک جھلک بھی ٹھیک سے نہ دیکھ پائے تھے کہ صحبت یار آخر شد۔ پھر دیس پر عالمی کساد بازاری کے سایہ ڈھلنے شروع ہوئے۔ کالج کے بڑے بڑے بانکے تیس مار خاں تلاش معاش میں گلیوں کی

خاک پھانکنے لگے یہ وہ دن تھے جب یکایک بچوں کی ہنسی بجھ گئی اجڑے ہوئے کسان کھیت کھلیان چھوڑ کر شہروں میں مزدوری کرنے لگے اور اچھی خاصی بہو بیٹیاں بازاروں میں آ بیٹھیں۔ گھر کے باہر یہ حال تھا اور گھر کے اندر مرگ سوز محبت کا کہرام مچا تھا۔ یکایک یوں محسوس ہونے لگا کہ دل و دماغ پر سبھی راستے بند ہو گئے ہیں اور اب یہاں کوئی نہیں آئے گا"[1]

کیسے گلچیں کے لئے جھکتی ہے خود شاخ گلاب
کس طرح رات کا ایوان مہک جاتا ہے (فیض)

بہر حال کنھیا لال کپور نے جو چوٹ ساحر پر کی ہے وہ معنی خیز ضرور ہے۔ اس استحصال کرنے والے نظام میں عورت دوہرے استحصال کا (DOUBLE EXPLOITATION) شکار ہے، ساحر کی سماجی فکر میں نہایت درجہ اہم حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے کتنے ہی غزلیہ گانوں، گیتوں اور نظموں میں یہ موضوع جاری و ساری ہے کہ جب تک یہ نظام زرداری ختم نہ ہوگا اور جب تک عوامی تحریک کے تحت عورت و مرد سب کے سب شانہ بہ شانہ چل کے اشتراکی نظام نہیں لائیں گے اس وقت تک کیا عورت، کیا مرد کسی کو بھی انسانی درجہ نہیں مل سکتا۔ اس پدر شاہی نظام PATRIARC نے اور اس کے معاشی و سماجی ڈھانچے

۱۔ فیض از فیض — نسخہ ھائے دنا — صفحہ ۳۰۸

نے عورتوں کو جس بد حالی میں مبتلا کیا ہے۔ اس مسئلے کو ساحر نے اپنے شعروں میں فیض سے بھی زیادہ پیش کیا ہے۔ فلم انڈسٹری INDUSTRY جن ہاتھوں میں ہے اس کے پیش نظر ایسے گانے میں غنیمت ہیں۔

عورت نے جنم دیا مردوں کو مردوں نے اسے بازار دیا
جب جی چاہا مسلا کچلا، جب جی چاہا دھتکار دیا

کلاسیکی غزل کے انداز میں ذیل کے اشعار قابل ملاحظہ ہیں:

معمورۂ احساس میں ہے حشر سا برپا
انسان کی تذلیل گوارہ نہیں ہوتی
فطرت کی مشیت بھی بڑی چیز ہے لیکن
فطرت کبھی بے بس کا سہارا نہیں ہوتی

اب وہ کرم کریں کہ ستم، میں نشے میں ہوں
مجھ کو نہ کوئی ہوش نہ غم، میں نشے میں ہوں

ساحر کا مذکورۂ بالا شعر میر کی معرکہ آرا غزل کی یاد دلاتا ہے:-

یا مجھ کو ہاتھوں ہاتھ لو مانند جام مے
یا تھوڑی دور ساتھ چلو، میں نشے میں ہوں

یہیں پر غزل یا نظم کی بحث کے سلسلے میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی تنقید کی صداقت اور اس کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے جب وہ اپنی فکر کا نچوڑ مؤثر طور سے ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں :-

"غزل ہو یا نظم؟ کیونکہ میں تو اب کچھ اس خیال کا ہوتا جا رہا ہوں کہ میر کا تجربۂ شاعری کچھ ایسا تھا کہ ان کی غزل نظم سے اور نظم غزل سے ہم رشتہ معلوم ہوتی ہے[۱]"۔

کچھ ایسے ہی احساسات کے تحت فیض بھی میر کی غزل کی طرف ملتفت ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ اثر اس حد تک ہے کہ ~~[illegible]~~ میر کے مندرجہ ذیل شعر کو انھوں نے اپنے ایک شعری مجموعہ "سر وادیٔ سینا" کا سرنامہ بھی قرار دیا[۲] :-

موسم آیا تو نخل دار پہ میر
سرِ منصور ہی کا بار آیا

اشارۃً ذیل کے اشعار قابل توجہ ہیں۔ ساحر اپنے محسوسات کو ایک جگہ یوں بیان کرتے ہیں :

۱۔ نئی قدریں ۔ شاعر نمبر — ڈاکٹر سید عبداللہ — صفحہ ۸۰۵
۲۔ سر وادیٔ سینا — فیض احمد فیض

لو آج ہم نے توڑ دیا رشتۂ امید
لو اب کبھی گلہ نہ کریں گے کسی سے ہم

مماثلت کے لحاظ سے فیض کا یہ شعر بھی قابل غور ہے:

آؤ کہ آج ختم ہوئی داستانِ عشق
اب ختم عاشقی کے فسانے سنائیں ہم

خلوص فکر اور دل سے نکلتی بات کے سلسلے میں فیض اور ساحر کے کچھ اور اشعار کا بھی رنگ ہم دیکھتے ہیں:

یوں سجا چاند کہ جھلکا تیرے انداز کا رنگ
یوں فضا مہکی کہ بدلا مرے ہمراز کا رنگ
بے پیے ہوں کہ اگر لطف کرو آخر شب
شیشۂ مے میں ڈھلے صبح کے آغاز کا رنگ

چنگ و نے رنگ پہ تھے، اپنے لہو کے دم سے
دل نے لے بدلی تو مدھم ہوا ہر ساز کا رنگ
اک سخن اور کہ پھر رنگ تکلم تیرا
حرف سادہ کو عنایت کرے اعجاز کا رنگ[1] (فیض)

---

[1] سر وادیٔ سینا صفحہ ۳۲

کشکول فن اٹھا کے سوئے خسرواں نہ جا
اب دستِ اختیارِ جمِ وکَے ہیں کچھ نہیں[1] (ساحر)

اب اگر جاؤ پئے عرض و طلب ان کے حضور
دست و کشکول نہیں کاسہ سر لے کے چلو[2] (فیض)

ہر گام پر ہے مجمع عشاق منتظر!
مقتل کی راہ ملتی ہے کوئے حبیب سے[3] (ساحر)

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے[4] (فیض)

ہم کو ان سستی خوشیوں کا لوبھ نہ دو
ہم نے سوچ سمجھ کر غم اپنایا ہے

---

[1] ساحر لدھیانوی ایک مطالعہ صفحہ ۱۳۳

[2] سروادی سینا صفحہ ۳۰

[3] ساحر لدھیانوی ایک مطالعہ صفحہ ۱۳۱

[4] زنداں نامہ صفحہ ۷۵

جھوٹ تو قاتل ٹھہرا ، اس کا کیا کہنا
سچ نے بھی انساں کا خون بہایا ہے[1] (ساحر)

کنھیالال کپور نے فیض کے انداز کلام کی پیروڈی یوں پیش کی :-

"بول کبوتر بول کبوتر، بول کبوتر بول !"

ظاہر ہے کہ یہ مبنی ہے ایسے شعر پر کہ :

بول ، کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول ، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے[2] (فیض)

سچ اور حق کی پاس داری فیض کی غزل گوئی میں بھی جگہ بہ جگہ جاری و ساری ہے :-

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے
تو لوٹ آئے ترے سربلند ، کیا کرتے[3] (فیض)

ساحر کا بھی ہمیشہ یہی خیال رہا اور اس حقیقت کی اظہار نے بھی

---

1. ساحر لدھیانوی — ایک مطالعہ — صفحہ ۱۳۲
2. نسخہ ہائے وفا — صفحہ ۸۲
3. نسخہ ہائے وفا — صفحہ ۱۲۸

ترجمانی کی ہے کہ سچ کو یا حق کو دبایا نہیں جا سکتا:۔

فوج حق کو دبا نہیں سکتی
فوج چاہے کسی یزید کی ہو

تیکھا تنقیدی شعور، شدید طنز اور چھپا ہوا خاموش استہزا ساحر کے خاص اوصاف ہیں۔ ریاکاریوں کی پردہ پوشی ان سے نہیں ہو پاتی۔ جہاں کہیں انھوں نے اس طرح کی باتیں دیکھیں ان کا ردِ عمل اپنے کلام میں انھوں نے ضرور کیا ہے:

گاندھی ہوں کہ غالب ہوں انصاف کی نظروں میں
ہم دونوں کے قائل ہیں، دونوں کے پجاری ہیں

فن جو نادار تک نہیں پہنچا
ابھی معیار تک نہیں پہنچا
عدل گاہیں تو دور کی شے ہیں
قتل اخبار تک نہیں پہنچا (ساحر)

نہ مدعی نہ شہادت حساب پاک ہوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا رزقِ خاک ہوا (فیض)

اب ساحر کے کلاسیکی انداز غزل گوئی کے چند شعر پیش کرکے ہم اس تقابلی رنگ ڈھنگ کی باتیں سمیٹنا چاہیں گے:

ہمیں سے رنگ گلستاں ہمیں سے رنگ بہار
ہمیں کو رنگ گلستاں پہ اختیار نہیں

ہر شے قریب آ کے کشش اپنی کھو گئی
وہ بھی علاج شوق گریزاں نہ کر سکے

عرصۂ ہستی میں اب تیشہ نہ تون کا دور ہے
رسم چنگیزی اٹھی، توقیر داراں گئی

محمود سعیدی نے اپنے ایک طویل مضمون میں ساحر اور ان کی شاعری کے آخر آخر مضمول ہو جانے کا سبب یہ قرار دیا ہے۔

"وہ نظریہ جو زندگی بھر انھیں عزیز رہا تھا اپنا بھرم کھو رہا تھا اور جو افراد اور قومیں اس نظریے کی علمبردار تھیں، ان کی منافقت بھی ان پر عنایت ہو گئی تھی۔"[1]

یہاں ہمیں یہی کہنا ہے کہ موصوف کی سطور بالا میں ایک گمراہ کن رویہ کی تلقین کی گئی ہے۔ کیونکہ اصل حقیقت ہمارے خیال میں یہی ہے کہ جو وہ ساحر

---

[1] ساحر لدھیانوی ایک مطالعہ صفحہ ۳۶

کی شاعری ہو یا فیض کی ان کے یہاں جو تب و تاب نظر آتی ہے وہ مارکسزم لینن ازم کے شعور اور اس کے ہی بل بوتے پر ہے۔ ثبوت میں ساحر کی نظم 'لینن' ہی بہت کافی ہے۔ مارکسزم سے تادم آخر ساحر نے کبھی انحراف نہیں کیا اضمحلال کا سبب ہندوستانی سماج کے طبقاتی عناصر و افکار ہیں۔

بہر حال ساحر کو اپنی بہت ساری محرومیوں کے باوجود اپنی گونا گوں خصوصیات کی بنا پر اپنی زندگی میں ہی قبول عام کا شرف بھی حاصل ہو گیا جبکہ ان کا یہ کہنا بھی بجا تھا:

ع یہ دنیا کیا قیمت دے گی سادہ دل انسانوں کی

یا

نہ دوستی نہ مروت نہ دلبری نہ خلوص
کسی کا کوئی نہیں آج سب اکیلے ہیں (ساحر)

اس طرح کے خیال کو فیض نے بھی انتہائی کمال کے ساتھ طرح طرح سے پیش کیا ہے، اور یوں بھی اسے اظہار بخشا ہے:

اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر دو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

لیکن پھر جیسے فیض کے یہاں رجائیت حاوی ہو جاتی ہے اور ہمیشہ

حاوی رہتی ہے اسی طرح ساحر کے یہاں بھی رجائیت کا رنگ ملتا ہے جو ان کی شاعری کو زور اور کس بل عطا کرتا ہے۔

مشہور شاعر جاں نثار اختر کی یہ باتیں بالکل سچ ہیں:

"ساحر ایسے ناحق اور غیر مساوی نظام کا دشمن ہے اس کی پُر امید طبیعت اس اندھیرے کو چھٹتا ہوا محسوس کرتی ہے اور وہ چلّا اٹھتا ہے، کس کے روکے رُکا ہے سویرا' وہ عمل اور ردِ عمل کے فطری اصول سے واقف ہے۔ مثلاً:

رات جتنی ہی سنگین ہو گی
صبح اتنی ہی رنگین ہو گی

.... وغیرہ[1]

اور آخر میں موصوف نے اپنے مضمون کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا ہے۔ کہ ساحر نے

"خود کو دھوکا دیا نہ اپنے فن کو نہ عوام کو! اس نے وہ کیا جو بحیثیت ایک بیدار شاعر اس کا فرض تھا"

ساحر کو علم وشعور اور دانش و آگہی کے وہ مواقع نہ مل سکے جو فیض

---

[1] ساحر لدھیانوی ایک مطالعہ صفحہ ۸۵ - ۸۶

کہ ملے لیکن اس کمی اور محدودیت (LIMATATION) کے باوجود انھوں نے غزل گوئی کی دنیا میں بھی جو کام کیا ہے وہ قابل داد ہے۔

ع۔ "گفتگو پر مجھے عوام سے ہے"

اگر یہ بھی شاعری یا غزل گوئی کا معیار ہے تو ساحر کو یقیناً ہم ایک کامیاب غزل گو کہیں گے۔ فیض ساحر کے پیش رو ہیں فیض کا مطالعہ مشاہدہ ومجاہدہ اور ان کی بنا پر ان کے شعور وتجربات زیادہ گہرے اور وسیع ہیں اس لئے انھوں نے ساحر کو بھی بطور خاص متاثر کیا جسکی جھلکیاں ان کے کلام میں جگہ بہ جگہ نظر آتی ہے۔ جن میں سے کچھ کو ہم نے اوپر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

مجروح سلطانپوری

مجروح سلطانپوری کی شخصیت اور شاعری دونوں آج اردو شاعری کی دنیا میں اتنی ممتاز اور قد آور ہیں کہ شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان سے پوری طرح انصاف کرنا کوئی آسان کام نہیں رہ جاتا۔ پھر بھی اردو غزل گوئی کی ترقی وارتقا کے سلسلے میں کچھ نقوش ابھارنے کی بات لازمی سی محسوس ہوتی ہے۔

دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایانِ شوق
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا

دنیائے ادب میں مجروح کی ساری کمائی غزل ہے اور ہم جانتے ہیں

کہ اس صنف غزل پر کیا لے دے نہیں ہوتی ہے۔ اس پر اجتماعی اور انفرادی نوعیت کے تقریباً ایک صدی سے کیسے کیسے جان لیوا حملے ہو رہے ہیں پھر بھی یہ اردو شاعری کی جان بنی ہوئی ہے اور اس کی تمام اصناف میں آج سب سے زیادہ مقبول عام صنف ہے۔ لیکن ہیئت کے لحاظ سے یہ سب سے زیادہ کٹر بھی ہے۔ چنانچہ اس کی تشکیل (فارم) کا جہاں تک تعلق ہے۔ جیسی ابتدا میں تھی کم و بیش ویسی ہی دور جدید میں بھی نظر آتی ہے۔ بہ ظاہر کوئی نمایاں تبدیلی اس کی ہیئت میں نہیں ہوئی۔ البتہ مواد کے لحاظ سے اس میں تبدیلیاں ضرور ہوئیں۔

یہ ضرور ہے کہ حسن و عشق کا تصور غزل کا محور تھا مگر اس پر گردش کرنے میں وہ گرد و پیش کے ان حالات سے بھی بے خبر نہیں رہی جو دنیائے محبت کے باہر زندگی سے دوچار تھے۔

ہندوستان سایۂ گل پائے تخت تھا
جاہ و جلالِ عہدِ وصالِ بتاں نہ پوچھ

جن باتوں کا اوپر ذکر ہوا ہے ان کے ثبوت یوں تو ہر عہد میں ملتے ہیں مگر جدید اور جدید تر دور میں یہ عناصر زیادہ ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ اردو غزل کو اگر ہم تاریخی پس منظر میں دیکھیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو غزل کو ایک بڑا موڑ غالب کی غزل گوئی کے ماڈل میں حاصل ہوا

غالب یوں تو قدیم دور کے فنکار ہیں لیکن ہمارے متعدد ادیبوں اور نقادوں نے انھیں آج تک کے عہد کی اردو شاعری کا ماڈل مانا ہے جامعیت اور اختصار پسندی جو غزل کو خاص اہمیت عطا کرتی ہے اور جس کے بل پر ایک ایک مصرعے میں کئی کئی اشارتی باتیں و حقیقتیں آ جاتی ہیں غالب کے کلام میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ غالب ایسے شاعر کی فنی چابکدستی اس کے آرٹ و جذبات اور خیالات کی ایسی بلندی کے بعد غزل گوئی کوئی آسان بات نہیں رہ گئی۔ اقبالؔ نے بھی غزل کو ایسی نئی آب و تاب اور گہرے حکیمانہ شعور اور بصیرت سے مالا مال کیا کہ بقول پروفیسر آل احمد سرورؔ:-

"اردو غزل جہاں تک جا سکتی ہے اقبالؔ نے اسے پہنچا دیا اس کے آگے کی فضا میں پرواز سے غزل کے پر جلتے ہیں۔ یہاں نظم کے شہپروں سے پرواز مسلسل کی ضرورت ہے۔"[1]

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائدار ہو گا (اقبالؔ)

دورِ جدید نے عشق کے تصورات اور نظریات میں بھی خاصی تبدیلی پیدا کی ہے۔ مثالوں سے معاملہ زیادہ طولانی ہو جائے گا پھر بھی اس حقیقت

---

[1] پروفیسر آل احمد سرور   ادب اور نظریہ

کی ایک جھلک سامنے لانے کے لئے ہم اشارۃً ذیل میں کچھ اشعار پیش کرنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں:

ڈالی ہے بنا اس نے عجب طرزِ سخن کی
انداز تکلم سے عیاں ہاں بھی نہیں بھی

مانا کہ گماں جرم کا ہے میری وفا پر
ہے دل کی صداقت کا مگر مجھ کو یقین بھی

اب ان کو نہیں نام ونشان یاد کسی کا
بھولے ہوئے بیٹھے ہیں جمالؔ اپنے تئیں بھی[1] (مسعود اختر جمالؔ)

یہ اندھیر نگری بہت دور تک ہے لیٹروں کی بستی بہت دور تک ہے
گزرنا ادھر ہی سے ہے کارواں کو بغیر تصادم گزر ہو تو کیسے

توڑ دو سرحدِ ہر ملک جہاں تک ٹوٹے
اس قدر توڑ دو کہ دیوارِ گماں تک ٹوٹے

تاریخ لکھ رہی تھی جو شہرِ غزل کے بیچ
صدیاں سمٹ کے آگئیں ایک ایک پل کے بیچ

---

[1] شاہکار اٹھارواں نمبر : صفحہ ۱۲۹

مزا تو جب ہے کہ یاروں کی بات رہ جائے
زبانِ شعر پہ حرفِ حیات رہ جائے (وامق)

وامق کے اس آخری شعر کے سلسلے میں مخدوم کے درج ذیل شعر کی بھی بے ساختہ یاد آجاتی ہے جو ایک دوسری ہی طرح کی سوچ اور فکری رویّے کی تلقین کرتا ہے، اسی رویّے کی جسے مخدوم نے زیادہ واضح اور دو ٹوک انداز میں پیش کیا ہے :-

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو (مخدوم)

ہے محبت سے سروکار انھیں بھی حسرت
چشمِ جاناں میں یہ کرتے ہیں اشارے آنسو (حسرت)

سیاہیاتِ شبِ فرقت کی ہم نفس مت پوچھ
کسی کو یاد جو کیجئے تو یاد آ نہ سکے (مجروح)

غزل چونکہ عام طور سے مربوط سے زیادہ غیر مربوط اشعار کا نگار خانہ رہی اس لئے تفصیل کے ساتھ اور وضاحت کے لحاظ سے اس میں

سیاسی تحریکوں کا بیان نہیں ہو پا رہا تھا اسی لیے اشارے کنائے میں جو باتیں کہی گئیں وہ اکثر و بیشتر مبہم رہیں اور سماجی شعور کی کمی کے باعث ہلکی بھی۔ بڑے غزلگو شعراء اور غالب کی اچھی غزلوں میں ابہام اس لئے کم ہے کہ ان میں اندرونی ربط اور عمیق تاریخی نظر ملتی ہے۔ بڑے اساتذہ کے یہاں غالب سے پہلے غزل گردش کرتی ہے۔ بیشتر جذبات و احساسات کے محور پر۔ لیکن غالب کی ذات سے اس کی محوری نوعیت میں جذبات اور احساسات کے ساتھ ساتھ گہرے خیالات، واضح سماجی شعور و تاریخیت کی خصوصیات بھی شامل ہو جاتی ہے۔ مگر پھر تیزی سے اس میں زوال پسندی اور نوابانہ رنگ ڈھنگ داخل ہونے لگتے ہیں اور یوں یہ 'شیش محل' درہم برہم سا ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس مشکل وقت میں جو شخصیت سب سے زیادہ کھری، جری، بیباک اور جیالی نظر آتی ہے اور جو ہستی غزل کے اس آڑے وقت میں کام آتی ہے وہ مولانا حسرت موہانی کی ذات ہے:

تو نے حسرت کی عیاں تہذیب رسم عاشقی
تجھ سے پہلے اعتبار شان رسوائی نہ تھا

کہتا ہوں مرثیہ نہ قصیدہ، نہ مثنوی
حسرت غزل ہے صرف مری جانِ عاشقاں

عشق حسرت کو ہے غزل کے سوا
نہ قصیدہ، نہ مثنوی سے غرض

جہاں مذکورہ بالا فنکاروں نے اردو شاعری غزلگوئی کو نمایاں مقام اور وقار بخشا وہیں جگر مرادآبادی نے بھی اسے ایک مخصوص اہمیت عطا کی اور اسے جمہوری قدروں تک سے عوامی رنگ ڈھنگ میں منسلک کیا:

فکر جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزلخواں ہے آج کل
انسانیت کی جس سے عبادت ہے زندگی
انساں کے سائے سے بھی گریزاں ہے آجکل
جمہوریت کا نام ہے جمہوریت کہاں
فسطائیت، حقیقت عریاں ہے آج کل
ہے زخم کائنات جو ہندو ہے ان دنوں
ہے داغ زندگی جو مسلماں ہے آجکل
اس سے تو خودکشی ہی غنیمت ہے اے جگر
جو مصلحت کہ پیشۂ مرداں ہے آج کل

جگر کے یہاں ہمیں جو MATERALITY مادیت اور زمین پرستی مل جاتی ہے

یہ بھی اردو غزل کے لئے ناز و افتخار کی چیز ہے۔

یہی زمیں ترا مسکن، یہی ترا مدفن
اسی زمیں سے تو مہر و ماہ پیدا کر

جو طوفانوں میں پلتے جا رہے ہیں
وہی دنیا بدلتے جا رہے ہیں

نہ ہو جو عام مسرت، محال ہے اے دوست
کہ زندگی کو کسی حال میں قرار آئے

غالباً انھیں خصوصیات کی بناء پر جو ہمیں مذکورۂ بالا اشعار میں نظر آتی ہیں، مالک رام ایسے جیّد محقق کا یہ جملہ جو باوجود اس کے کہ تاثراتی ہے لیکن پھر بھی بہت معنی خیز نظر آتا ہے:

"اب یہ توقع کرنا کہ پھر کوئی جگر کا سا غزل گو شاعر پیدا ہوگا امید موہوم سے زیادہ نہیں۔"[1]

اردو غزل گوئی کے نکھار کے سلسلے میں ایسے نام بھی آگئے ہیں کہ بے ساختہ یہ کہنا

---

[1] نگارش سجاد ظہیر صفحہ ۲۵

پڑتا ہے کہ :

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے　　　　(غالب)

اب ہم اس بات کا بھی جائزہ لینا چاہتے ہیں کہ جو کام مذکورہ اساتذہ نے اپنے دور میں کیا اسی قبیل کا کام فیض اور مجروح نے بھی اپنے وقت میں کیا ہے۔ اب ان کے مابین فرق کیا ہے اس نکتے کی ہم آگے وضاحت کریں گے

فیض کے یہاں ہمیں ایک گہرا تاریخی شعور ملتا ہے وہ سماجی زندگی کو تاریخی تسلسل میں اور ایک مربوط شکل میں دیکھتے ہیں جبکہ مجروح کے یہاں سوچ کا یہ مربوط ڈھنگ نہیں ملتا اسی لیے ان کے یہاں تاریخی و نظریاتی شعور کی گہرائی میں کمی کا احساس کہیں کہیں ضرور کھلتا ہے۔ بہرحال جو کام حسرت نے اپنے عہد میں کیا اسی طرح کا کام مجروح نے بھی اپنے وقت میں کیا ہے۔ یہ بات اور ہے کہ وہ 'غزل' کے اپنے دیباچے میں "مطلع" عرض کرنے سے پہلے کے حقے میں حسرت کو نظر انداز کر گئے یہاں بھی فیض کی شخصیت کی بڑائی اور ان کی حق گوئی نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے مثال کے لئے " نذرِ حسرت" ایک طور سے حسرت اور انکے مخصوص انداز غزلگوئی کیلئے خراج تحسین ہے۔

"نذرِ حسرت"

مرجائیں گے ظالم کی حمایت نہ کریں گے
احرار کبھی ترکِ روایت نہ کریں گے

کیا کچھ نہ ملا ہے جو کبھی تجھ سے ملے تھے
اب تیرے نہ ملنے کی شکایت نہ کریں گے
شب بیت گئی ہے تو گزر جائے گا دن بھی
ہر لحظہ جو گزری وہ حکایت نہ کریں گے

یہ فقر دلِ زار کا عوضانہ بہت ہے
شاہی نہیں مانگیں گے ولایت نہ کریں گے
ہم شیخ نہ لیڈر نہ مصاحب نہ صحافی
جو خود نہیں کرتے وہ ہدایت نہ کریں گے

ان کی سیاسی شاعری اور سیاسی غزلیں مقدار میں کم سہی پھر بھی قابلِ ذکر ہیں۔ اسی بنا پر ہماری رائے یہی ہے کہ آج کی بھی کامیاب غزل کے صحیح تاریخی پس منظر میں حسرتؔ کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ ہمیں تو مجروحؔ کے ایسے اشعار بھی حسرتؔ جیسے پختہ کار فنکار کی یاد دلاتے ہیں۔

مجھے نہیں کسی اسلوبِ شاعری کی تلاش
تری نگاہ کا جادو مرے سخن میں رہے

آ نکل کے میداں میں دو رخی کے خانے سے
کام چل نہیں سکتا اب کسی بہانے سے

ہیں کہ ایک محنت کش ہیں کہ شہر کی دشمن
صبح نو عبارت ہے میرے مسکرانے سے

اب جنوں پہ وہ ساعت آ پڑی کہ اے مجروح
آج زخم سر بہتر دل پہ چوٹ کھانے سے

جبیں پر تاج زر پہلو میں زنداں بنک چھاتی پر
اٹھے گا بے کفن کب یہ جنازہ ہم بھی دیکھیں گے

اسی انداز کا حسرت کا بھی ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

دولت ہندوستاں پنجۂ اغیار میں
بے عدد و بے حساب دیکھئے کب تک رہے (حسرت)

ہاں یہ ضرور ہے کہ جہاں تک مجروح کے سیاسی اشعار میں غزل کا تعلق ہے انکا لب و لہجہ اب اور نیا اور زیادہ کارگر ہے۔ سیاسی غزل کا رنگ اور بھی شوخ و گلنار ہے۔ اس کے فنی نقوش اب پہلے سے زیادہ نکھرے ہوئے اور زیادہ واضح ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر محمد حسن" اپنے ایک وقیع مضمون" مجروح سلطانپوری سجیلا غزل گو" میں لکھتے ہیں۔

"مجروح سلطانپوری غزل کے قتیل ہیں۔ حق یہ ہے کہ دورِ حاضر میں ان جیسا سجیلا اور طرحدار غزل گو نایاب ہے۔ انھوں نے غزل کو سیاسی رمزیت ہی نہیں ترقی پسند حیثیت سے روشناس کیا، دو چار براہ راست قسم کے شعر بھی کہہ ڈالے اور ان کو لے کر ایسا ہنگامہ مچا کہ ان کی غزل کی طرحداری اور سجیلا پن اس شعور میں دب گیا۔ در اصل مجروح کے سامنے ایک نئی للکار تھی۔ جدید غزل جدید دور کے تقاضوں کو پورا کر سکتی ہے؟ مخالفین کا اصرار تھا کہ اول تو غزل کی ریزہ خیالی حائل ہوگی۔ دوسرے اس کی مخصوص لفظیات اور علامتوں پر جاگیردارانہ نظام کی جو چھاپ لگی ہے وہ اسے عصرِ حاضر کی انقلابی حیثیت کو اپنانے میں حارج ہوگی۔ تیسرے قافیے ردیف کی مجبوریاں راہ روکیں گی۔ مجروح نے ان سب دقتوں کو آنکھیں کھول کر تسلیم کیا، اور نباہ دیا اور اس طرح نبایا کہ غزل کی لفظیات کو نئی تہہ داری اور رمزیت ملی اور غزل کو نئی سجاوٹ اور وقار"۔[۱]

جلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

۱؎ غزل مجروح حسامی بک ڈپو حیدرآباد صفحہ 1

ہم کو جنوں کیا سکھلاتے ہو ہم تھے پریشاں تم سے زیادہ
چاک کئے ہیں ہم نے عزیزو چاک گریباں تم سے زیادہ

اب یہاں فیض کی غزل گوئی کے سلسلے میں ان کے چند شعر پیش کرتے ہوئے ان کی غزل کی کیفیتی اور نوعیتی تبدیلیوں کو بھی سامنے لانا چاہتے ہیں :

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن نہ تھی تری انجمن سے پہلے
سزا خطائے نظر سے پہلے عتاب جرم سخن سے پہلے
جو چل سکو تو چلو کہ راہ وفا بہت مختصر ہوئی ہے
مقام ہے اب کوئی نہ منزل فراز دار و رسن سے پہلے
کرے کوئی تیغ کا نظارا اب ان کو یہ بھی نہیں گوارا
بضد ہے قاتل کہ جان بسمل فگار ہو جسم تن سے پہلے
ادھر تقاضے ہیں مصلحت کے، ادھر تقاضائے دردِ دل کے
زباں سنبھالیں کہ دل سنبھالیں اسیر ذکر وطن سے پہلے

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

ادبی رنگ اور زبان دانی کے نکات پر غور کریں تو ایسے اشعار بھی بے ساختہ پردۂ ذہن پر آجاتے ہیں:

سچ ہے ہمیں کو آپ کے شکوے بجا نہ تھے
بے شک ستم جناب کے سب دوستانہ تھے

ستم سکھلائے گا رسمِ وفا ایسے نہیں ہوتا
صنم دکھلائیں گے راہِ خدا ایسے نہیں ہوتا

جہانِ دل میں کام آتی ہیں، تدبیریں نہ تعزیریں
یہاں پیمانِ تسلیم و رضا ایسے نہیں ہوتا

رواں ہے نبضِ دوراں، گردشوں میں آسماں سارے
جو تم کہتے ہو سب کچھ ہو چکا ایسے نہیں ہوتا

ایسے اشعار جو عوام کے دلوں کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں، بچوں سے لے کر بڑے بوڑھوں تک، ان پڑھ سے لے کر پڑھے لکھے لوگوں تک لاکھوں کروڑوں دلوں میں چشم زدن میں جادو بن کر چبھ جاتے ہیں، 'ادب' تہذیب کلچر و آرٹ کو زندگی کی سچی دھڑکن دیتے ہیں فیضؔ کے یہاں بہ آسانی دیکھے جا سکتے ہیں۔ مثلاً

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

فیض نے ایسا رویہ اختیار کیا ہے جو یقیناً اس نئی مادّی سیاسی قوت کو جنم دیتا ہے جو انقلاب کی ہراوّل اور اس کا پیش خیمہ بنتا ہے ۔

یہی خیال کم و بیش کوئی تین سو برس پہلے ہمیں ولی کی غزلوں میں بھی ملتا ہے ۔ لیکن ساتھ ہی ان میں ایک طرح کے نڈھال پن کی کیفیت بھی محسوس ہوتی ہے ۔ مثال :

باعثِ رسوائی عالم ولی
مفلسی ہے مفلسی ہے مفلسی

یا اس کے تقریباً سو برس بعد لکھنؤ کے دور کے شاعر مصحفی بھی جب یہ کہتے ہیں :

اب گل کی شاعری ہے نہ لالے کی شاعری
اس دور میں ہے تیغ کی بھالے کی شاعری (مصحفی)

تو اس میں جائز غصے اور برہمی کا بے ساختہ پن تو ضرور ملتا ہے جو اپنی جگہ یقیناً اہم بھی ہے ۔ لیکن پھر، پھر درویش بہ جانِ درویش، ایسی بے بسی کا بھی احساس ہوتا ہے کیونکہ رفتار زمانہ کو تاریخی جکڑن کے سبب ہمارا شاعر حسبِ دل خواہ پہنچان نہیں پایا ہے ۔ لیکن فیض اور مجروح تک آتے آتے انجمن بدلی ہوئی سی دکھائی دیتی ہے ۔ اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ

ہمارا شاعر آشوب زمانہ کے اسباب پہچاننے لگا ہے۔ چنانچہ انھیں غزل میں کامیابی کے ساتھ سمو سکنے پر قادر نظر آتا ہے۔ کم و بیش کی بات دوسری ہے۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی اب وہ یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ دشمن قوتیں در اصل سامراج، اجارہ داری، سرمایہ داری، سامنتی لعنتیں اور ان کی دین طرح طرح کی بے جا بندشیں اور اوہام پرستیاں ہیں۔ اس لئے وہ ان کی کاٹ کرنے والی اور انھیں جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکنے والی محنت کش قوتوں کے ساتھ مل کر میدان زندگی اور میدانِ فن دونوں ہی میں کمربستہ وصف آرا نظر آتا ہے۔ فیض بھی اپنے زمانہ طالب علمی میں دنیائے غزل میں چلے تو یہیں سے تھے کہ:

دنیا نے تری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے

لیکن جلد ہی وہ "ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم" کے خلاف اس منزل تک آ گئے کہ:

باغباں ہوش کہ برہم ہے مزاج گلشن
ہر کلی ہاتھ میں تلوار لئے پھرتی ہے

مگر فیض صرف غزل کے ہی ہو کر نہیں رہے بلکہ انھوں نے نظم (پابند نظم) خطوط، مضامین، تنقید، فیچر، رپورتاژ، ڈرامے تقریریں وغیرہ غرضکہ جو بھی وسیلۂ اظہار ہاتھ لگا اسے سماجی مقصد کے لئے بے دریغ استعمال کر ڈالا۔ ہاں البتہ مجروحؔ کو یہ وضع پسند نہ آئی اور وہ مثل حسرتؔ موہانی صرف غزل کے ہی ہو کر رہ گئے۔ کچھ عرصے قید و بند کی سختیاں اور صعوبتیں بھی اٹھائیں پھر بھی حسرتؔ کی طرح غزل کے ہی رسیا رہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ حسرتؔ کی غزلیں زیادہ تر عشقیہ ہیں اور مجروحؔ کی زیادہ تر سیاسی لیکن پھر بھی غم دوراں اور غم جاناں کی ملی جلی کیفیتوں کی عکاسی، سماجی دکھوں کی بنا پر زندگی کی محرومیوں کی جھلک، مجروحؔ کے ذیل کے شعر میں بھی نظر آجاتی ہے، غزل کے ایجاز و اختصار کے فن کے ساتھ

مطلوب نظر تب چہرہ تھا، مقصودِ حیات اب غم ہے ترا
اب تو بھی کہیں مل جائے تو میں، شاید نہ تجھے پہچان سکوں (مجروحؔ)

پوری طرح مجروحؔ کی غزلگوئی کے سلسلے میں یہ احساس ہوتا ہے کہ انھیں سمجھنے کے لئے ادبیاتِ ایران و عجم سے بھی واقفیت کی ضرورت ہے مجروحؔ کو اس وقت بھی فارسی سے خصوصی شغف تھا جو شاید آج بھی قائم ہے ان کے یہاں فارسی تراکیب اور خیالات کا رکوز اظہار کافی ملتا ہے۔ اور

عموماً ایک اچھے انداز میں بس ایک مثال :

بہت ہی کم ہے تو خالِ رُخِ بہاراں ہے
مری نوا کو ملی ہے وہ داغ پیرہنی
ملے جو وقت نوا سنجئ ہزاراں سے
ادھر بھی دیکھ تماشہ ہے میری کم سخنی (مجروح)

فیض تو حقیقی معنوں میں ادبیات ایران و عجم کے بڑے ماہر ہیں اس حد تک کہ انھوں نے "جیبِ عنبر دست" ایسی خوبصورت ترکیب کا بھی اختراع کیا ہے۔ وہ تو باقاعدہ عربی و فارسی ادبیات کے بھی منتہی ہیں اس لحاظ سے بھی کہ انھوں نے ان ادبیات میں بھی باقاعدہ ایم۔ اے کیا ہے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ زندگی بھر انکا عمیق مطالعہ کیا اور انھیں کلیجے سے لگائے رکھا ہے۔ بہرحال اس وقت ہم ان کی مذکورۂ بالا ترکیب کے اختراع کے سلسلے میں یہ شعر پیش کرتے ہوئے آگے بڑھنا چاہتے ہیں

یہ شعر حافظِ شیراز، اے صبا کہنا
ملے جو تجھ سے کہیں وہ جیبِ عنبر دست (فیض)

طوالت کے خیال سے یہاں ہم اور مثال دینا نہیں چاہتے جگہ بہ جگہ اور کثرت کے ساتھ فیض کے یہاں ادبیاتِ عرب ایران و عجم کے نقوش بدرجۂ

اتم تخلیقی حسن کے ساتھ بکھرے نظر آتے ہیں۔ ہم کہیں سے بھی اس کی ہلکی سے ہلکی مثال لیں تو ہمیں ان کا واضح ثبوت نظر آجائے گا۔

یادِ غزال چشماں، ذکر سمن عذاراں
جب چاہا کرلیا ہے کنج قفس بہاراں
آنکھوں میں دردمندی، ہونٹوں پہ عذرخواہی
جانانہ وار آئی شامِ فراقِ یاراں
ناموسِ جان و دل کی بازی لگی تھی ورنہ
آساں نہ تھی کچھ ایسی راہِ وفاشعاراں
شاید قریب پہنچی صبحِ وصال ہمدم
موجِ صبا لئے ہے خوشبوئے خوش کناراں
ہے اپنی کشتِ ویراں سرسبز، اس یقیں سے
آئیں گے اس طرف بھی اک روز ابر باراں
آئے گی فیض اک دن بادِ بہار لے کر
تسنیم مے فروشاں، پیغامِ مے گساراں

مجروح کا ایک شاعرانہ دل ہے جس سے ہم یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ انھوں نے اس زمانے میں بھی غزل کی پرزور وکالت کی جب کچھ رہبر دل نے

اسے نظر انداز کرنا چاہا تھا۔ مجروح کا کہنا یہ تھا کہ عصری مسائل کی ترجمانی غزل میں اب بھی ہو سکتی ہے۔ اسے خواہ مخواہ نظر انداز کرنے کے سبب ہم لوگ پیچھے ہو گئے ہیں۔ غرض یہ کہ مجروح کے نقطۂ نظر سے زیادہ تر لوگوں نے اتفاق کیا اور یوں مجروح بھی اپنے مخصوص انداز میں غزل کی نوک پلک سنوارتے رہے اور اس میں کچھ نیا رنگ و آہنگ پیدا کرتے رہے۔:

مرے عہد میں نہیں ہے یہ نشانِ سربلندی
یہ رنگے ہوئے عمامے، یہ جھکی جھکی کلاہیں

جو دیکھتے مری نظروں پہ بندشوں کے ستم
تو یہ نظارے مری بے بسی پہ رو دیتے

فریبِ اشک و تبسم نہ پوچھئے مجروح
شراب ایک ہے بدلے ہوئے ہیں پیمانے

مجروح مرے ارمانوں کا انجام شکستِ دل ہی سہی
جی کھول کے خود پر ہنس نہ سکوں، اتنا بھی مجھے غم کیا ہوگا

ایک اور بات جو قابلِ ذکر ہے کہ سیاسی و شہری آزادی اور

(CIVIL LIBERTY) کے سلسلے میں مجروح نے قید و بند کی سختیاں بھی جھیلیں لیکن اس کی نمائش انھوں نے اپنے اشعار میں زیادہ نہیں کی۔ مجروح کو پڑھتے ہوئے ہم پر تاثر بھی قائم رہتا ہے اور بے ساختہ ان کا یہ شعر بھی ذہن میں آتا ہے۔ جس میں یقیناً سچائی ہے کہ ہمارا موجودہ سماجی نظام زندگی جیل سے کچھ کم بھیانک نہیں :

زنجیر و دیوار ہی دیکھی تم نے تو مجروح مگر
کوچہ کوچہ دیکھ رہے ہیں عالم زنداں تم سے زیادہ

مجروح کی غزلوں میں معترض قسم کے روایت پرست لوگ کہیں کہیں فنی چوک بھی ڈھونڈھتے رہے ہیں اور اسے ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن مجروح نے ایسے اعتراضات کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنکھ موند کر روایت کی ڈگری پر چلنا مجروح کا مزاج نہیں رہا ہے۔

ہم روایات کے منکر نہیں لیکن مجروح
سب کی اور سب سے جدا اپنی ڈگر ہے کہ نہیں

روک سکتا ہمیں زندانِ بلا کیا مجروح
ہم تو آواز ہیں دیواروں سے چھن جاتے ہیں

جنونِ دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

جدوجہد کی جن کیفیتوں سے مجروح نے اپنی شاعری کا آغاز کیا اور جب تک ان کا یہ سفر جاری رہا اس میں طبقاتی جدوجہد کی شدت میں کہیں کہیں کمی کا احساس تو کھٹک سکتا ہے لیکن مجموعی حیثیت سے روحِ عصر کو اپنے کلام میں سمو سکنے میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں :

رواں ہے جاوداں مجروح جس میں روحِ ساعت ہو
کہا کس نے مرا نغمہ زمانے کے چلن تک ہے

مجروح کا کلام نظر میں رکھتے ہوئے ایک کھٹک کا احساس ہمیں ضرور ہوتا ہے جس کا اظہار آخر کار کر دینا ہم لازم سمجھتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ ترقی پسندی کی رو سے بھی اچھا آرٹ وہی ہے جو صداقت کے ساتھ حقیقت کی عکاسی کرے، جو ایمانداری سے دائمی سماجی و نیچرل سوالات زمان و مکان کے صحیح پس منظر میں اٹھائے اور انھیں حل کرنے کی سعی بھی کرے۔ اس کا ایک ایسا نظریہ بھی ہو جو روز روز نہ بدلتا رہے۔ اس لئے کہ واقعی نظریاتی سوچ کی کچھ ٹھوس بنیادیں ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں مجروح کے ’مجموعۂ غزل‘ کے تقریباً سبھی ایڈیشن میں ہمیں دو غزلیں جن کے عنوانات ”ہندوستان کا دروازہ عوامی چین

کی طرف کھلتے دیکھ کر" اور "چین کے پیمان شکنی کے نام" ہیں۔ ساتھ ساتھ دیکھ کر
غلط طرح کے ٹکراؤ، غلط تضاد، بے میل و بے جوڑ بات اور تاریخیت کی کم رسائی کا
احساس ہوتا ہے۔ فیض کے سارے کلام میں ایسے مسئلوں پر اس طرح کی باتیں کہیں
بھی نہیں ملیں گی۔ سبب یہ ہے کہ فیض کے یہاں شوونزم کی خامی یا مرض کہیں نہیں
دکھائی دیتا، جبکہ اچھے اچھے شاعر اس کا شکار ہوتے نظر آتے ہیں۔ یہ تو ایسے ہی
ہوا جیسے کہ ہر ایک ملک کا حکمراں طبقہ یہی کہتا ہے کہ دنیا میں صرف ایک ہی ملک
ہے اور وہ ہے ہمارا ملک۔ دنیا میں صرف ایک قوم ہے اور وہ ہے ہماری قوم،
دنیا میں صرف ایک طبقہ ہے اور وہ ہے صرف ہمارا طبقہ......... وغیرہ
غرضیکہ غیر مناسب جارحیت وطن دوستی نہیں ہے اور طبقہ عوام یعنی محنت
کشوں اور مظلوموں کی جمہوریت اور غاصبوں، ظالموں، سرمایہ داروں کی جار
حانہ وطن پرستی کا فرق ایک ناگزیر فرق ہے۔ کیسا ہی شدید بحران کیوں نہ
ہو بے سمتی کی ترغیب دینے اور بھڑکانے سے خاموشی یا معاملات کے نہ سمجھ سکنے
کا اعتراف کہیں بہتر ہے۔ اسی طرح ہندی عوام اور چینی عوام کے بھائی چارے
ہی کا تحفظ ادب اور کلچر کے معماروں کا فریضہ ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں
کہ ہمارے ترقی پسند شعراء نے ضمن مذکورہ بالا خاص طور سے پیش پیش رہے
ہیں اپنی غزل گوئی اور شاعری کے ذریعہ انسانیت کے پرچم کو بلند رکھنے کی ہمیشہ
کوشش کی ان شعراء کا تقابلی مطالعہ تفصیل طلب ہے لیکن بہ سبب طوالت
ہم اپنی بات اردو کے بے مثال ناقد پروفیسر محمد حسن کے اس اقتباس پر ختم کرتے ہیں۔

۔۔غزل کو سیاسی رمزیت دینے کا یہ کام یوں تو بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ اقبال سہیل اپنی غزلوں میں سیاسی رمزیت کا استعمال برملا کرتے آئے تھے۔ جگر مراد آبادی نے اپنے آخیر دور کی غزلوں میں سیاسی رمزیت کو واضح طور پر اپنایا۔ خود ترقی پسند شاعروں کی صف میں جذبی نے سیاسی رمزیت وایما کو برتا، البتہ مجروح اور فیض کے ہاں یہ رمزیت نئی بلندیوں تک پہنچی۔ دونوں کے ہاں اس کی نوعیت مختلف ہے۔ مجروح کے یہاں یہ لے لبی ٹی رندلوسے اور تلنگانہ تحریک کے دوران ابھری اور ۱۹۶۲ء کے ہند چین مناقشے تک تقریباً ختم ہو گئی (دو چار شعراء اس کے بعد میں تو ہیں) اس دوران مجروح کو جیل جانے کا تجربہ بھی ہوا اور سر پر ہوا ئے ظلم کے مسوجتن کے ساتھ چلنے کا بھی، مگر فیض کے ہاں یہ تجربہ (اور لہذا یہ لہجہ) پوری زندگی بن گیا۔ اس لئے مجروح اور فیض دونوں کے لہجے اور دونوں کی رمزیت کی نوعیت جداگانہ ہے۔ ایک تخصیص سے تعمیم کی طرف جاتا ہے اور دوسرا تعمیم سے تخصیص کی طرف ایک کے لہجے میں شکوہ ہے تو دوسرے کے یہاں نرمی اور دل بستگی۔ لہذا ان دونوں

میں تقدیم و تاخیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دونوں
کے لہجے اور دائرہ کمال جداگانہ ہیں۔ دونوں دو الگ
طرزِ فغاں کے موجد ہیں اور شاید خاتم بھی"۔[۱]

---

۱ پروفیسر محمد حسن مجروح سلطانپوری سجیلا غزل گو

باب ہشتم

اردو غزل میں فیض کی انفرادیت و مقام

فیض نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے مروجہ اسلوب کو ناکافی سمجھا اسی لیے قدیم اسلوب میں تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اپنا منفرد انداز بیان اختیار کیا جس میں بلند آہنگی، جوش بیان اور ندرت و تازگی کا ایک حسین امتزاج ہے ۔ یہ صرف ان کے کلام کی آرائش کا وسیلہ نہیں بلکہ ان کی فنی تخلیق اور فکر و تخیل کا جزو لاینفک ہے ۔ ان کے اسلوب کی قوت و توانائی ہمیں حیرت زدہ کر دیتی ہے ۔ پڑھنے سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تراکیب اور بندشیں ان کے خیالات اور معانی سے خود بخود ابھری ہیں ان کے اظہار میں کسی قسم کا تصنع نظر نہیں آتا ۔ چونکہ ان کا وجدان انسانوں کی جذباتی زندگی کی لہروں سے بہت نزدیک ہے اس لیے ان کی عالمگیریت میں روز افزوں ترقی ہوتی جا رہی ہے ۔ ان کے انسان دوستی کے پیام کی بدولت ان کے کلام میں جوش اور گرمی پیدا ہوئی جو اجتماعی زندگی میں حوصلہ مندی اور امید پروری کی ضامن ہے ۔ فیض کا یہ پیغام انسانی تقدیر کے لیے ایک نیا پیغام ہے جسے انھوں نے شعریت کا جامہ پہنا کر عالم انسانیت کے لیے بطور تحفہ پیش کیا ہے ۔

حقیقت میں شاعری میں موضوعات و خیالات کے ساتھ ساتھ انداز

بیان اور لب و لہجہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے جس میں شاعر کا تخلیقی احساس اور تجربہ سمٹ آتا ہے۔ اسی سے اس کے کلام میں مخصوص رنگ و آہنگ پیدا ہوتا ہے جس سے اس کی شناخت ہوتی ہے۔ شاعرانہ ہیئت، جدت و ندرت استعارہ اور کنایہ اور علامتی پیکروں کی رنگا رنگی اسی کی بدولت کلام میں جلوہ فگن ہوتی ہے۔ فیضؔ کی شاعری میں ان جملہ خصوصیات کو بہ آسانی دیکھا جا سکتا ہے۔ فیضؔ نے اپنے مقصد اور پیغام کو شاعری کے دھیمے سروں میں اکثر بیشتر ادا کیا ہے، لیکن کہیں کہیں انھیں بلند آہنگ جوشِ بیان کی بھی ضرورت پڑی جسے انھوں نے اپنے مخصوص آب و رنگ شاعری میں سمو کر اس انداز میں پیش کیا جس سے زندگی کے حقائق کا ادراک و احساس شدید تر ہو جاتا ہے۔

اگر شاعر اپنے تخیل سے زندگی کو نغمہ دلنواز اور معنوی تہ داری نہیں بخشتا تو وہ بے مصرف ہے۔ فیضؔ کی شاعری کا نصب العین یہی ہے کہ اس کے ذریعہ ایک نئی دنیا کی تخلیق کی جائے جو پس ماندہ طبقہ کے مردہ دلوں میں نئی زندگی کی روح پیدا کرے اسی لیے تو وہ کہتے ہیں۔

کرے نہ جگ میں الاؤ تو شعر کس مصرف
کرے نہ شہر میں جل تھل تو چشم نم کیا ہے

اسی لیے وہ ایسی دل خراش حقیقتوں کو بھی پیش کرتے ہیں کہ یہاں سے شہر کو دیکھو، تب شاید بنیادی حقیقتیں سامنے آجائیں اور دکھ جائیں۔

یہاں سے شہر کو دیکھو تو ساری خلقت میں
نہ کوئی صاحبِ تمکیں، نہ کوئی والئ ہوش
ہر اک مردِ جواں مجرمِ رسن بہ گلو
یہ ہر اک حسینۂ رعنا، کنیزِ حلقہ بگوش

فیض کے شعری اثرات کی فراوانی سے سارا عالم فیض یاب ہوتا نظر آتا ہے۔ وہ اپنے نفسِ گرم سے ان تاثرات اور معانی کو ظاہر کرتے ہیں جو ان کے دل میں مخفی ہیں۔

صبا نے پھر درِ زنداں پہ آ کے دی دستک
سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے

اہلِ قفس کی صبحِ چمن میں کھلے گی آنکھ
بادِ صبا سے وعدہ و پیماں ہوئے تو ہیں
ہے دشت اب بھی دشت، مگر خونِ پائے فیض
سیراب چند خارِ مغیلاں ہوئے تو ہیں

فیض کی غزلیں مختلف النوع خصوصیات کی حامل ہیں جن کا احاطہ ازبس دشوار ہے پھر بھی چند اہم خصوصیات پیشِ خدمت ہیں جن سے ان کی

انفرادیت اور غزل کا مقام متعین ہوتا ہے۔

فیض کی شاعری کی ابتداء روایتی غزل سے ہوتی ہے اور ان کے ابتدائی کلام میں روایتی حسن و عشق پایا جاتا ہے۔ یہ دور جلد ختم ہو گیا جس کی طرف خود انھوں نے اشارہ کیا ہے۔

اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجئے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

اس کے بعد ان کی شاعری نے ایک نیا رُخ اختیار کیا اور انھوں نے عشق اور محبت کا تصور انقلابی شان میں پیش کیا ہے یہ صرف کسی انسان کی محبت کا نام نہیں ہے بلکہ یہ انفرادی اور اجتماعی دونوں لحاظ سے ترقی اور ارتقاء کا محرک ہے۔ کچھ بھی ہو ان کی غزلوں میں عشق اور سوز و گداز کا یہ انداز زیادہ دنوں قائم نہ رہا اور انھوں نے جیسے ہی حقیقت پسندی کی دنیا میں سانس لی ان کا انداز بدل گیا اور انھوں نے نہایت جرأت مندی کے ساتھ اعلان کیا۔

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

لیکن یہیں پر فیض نے اکتفا نہیں کی بلکہ فیض نے غم روزگار کو چیلنج کیا اور نہایت کشادہ دلی سے اس کا استقبال کیا۔

غم جہاں ہو، غم یار ہو کہ تیر ستم
جو آئے، آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

فیض غم حیات اور غم روزگار کی ترجمانی اور تصویر کشی میں صرف جذبات سے نہ کھیل کر غور و فکر سے کام لیتے ہیں جسکی وجہ سے ان کے کلام میں حقیقت پسندی اور واقعیت پسندی بہت زیادہ نظر آتی ہے اور انھیں نے اُن کے کلام میں زندگی کے بہت سارے اسرار و رموز کو روشن کیا ہے۔ فیض اسی زندگی کے شیدائی ہیں جس میں گرمی بھی ہو، حرارت بھی ہو، حرکت بھی ہو اور توانائی بھی ہو لہٰذا وہ اسی طرح کی شاعری کے تمنائی ہیں جب ہم ان کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو حقیقتاً ان کی شاعری اسی نکتہ کی بازگشت نظر آتی ہے۔

اب بھی خزاں کا راج ہے لیکن کہیں کہیں
گوشے رہِ چمن میں غزلخواں ہوئے تو ہیں

فیض کی غزلوں میں عشق ایک جذبۂ عمل کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ جس طرح اقبالؔ نے عمل کو اپنی شاعری کا محور بنایا اسی طرح سے فیض نے بھی

اسے اپنے گلے سے لگایا۔ فیض ہر حال میں حرکت عمل کی ترغیب دیتے ہیں جس سے ایک نئے ماحول اور نئے سماج کی تشکیل ہو سکے۔

ہاں تلخئ ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہل ستم، مشقِ ستم کرتے رہیں گے
باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا
رنگِ لب و رخسارِ صنم کرتے رہیں گے

سرفروشی کے انداز بدلے گئے، دعوتِ قتل پر مقتل شہر میں
ڈال کر کوئی گردن میں طوق آگیا، لاد کر کوئی کاندھے پہ دار آگیا

فیض کے عشقیہ اشعار میں بھی سیاسی اور سماجی حالات نہایت خوبصورت انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کی شاعری دوسرے شعراء سے کافی حد تک مختلف نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری عشق اور سیاست کا حسین سنگم ہے جن کا موضوع تو بظاہر عشق ہوتا ہے لیکن حقیقت میں بات کچھ اور ہوتی ہے۔ دیکھئے کس خوبصورتی سے اس مضمون کو ادا کرتے ہیں۔

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن، نہ تھی تری انجمن سے پہلے
سزا، خطائے نظر سے پہلے، عتاب جرمِ سخن سے پہلے

نہ سوالِ وصل، نہ عرضِ غم، نہ حکایتیں نہ شکایتیں
ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے

بے حرص و ہوا، بے خوف و خطر، اس ہاتھ پہ سر، اس کف پہ جگر
یوں کوئے صنم میں وقتِ سفر نظارۂ بامِ ناز کیا

فیض نے شاعری میں افادیت کے اصولوں کو برقرار رکھنے کے لیے ہر طرح کی ذہنی الجھنیں اور پریشانیاں تو جھیلی ہیں لیکن انھوں نے اپنے کلام میں کبھی بھی بدسلیقگی اور بدہیئتی نہیں آنے دی۔ جس کی وجہ سے ان کی شاعری حسن اور حقیقت کے امتزاج کا ایک حسین اور دلکش مرقع نظر آتی ہے۔ جس میں دلکشی اور رعنائی بھی ہے اور حقیقت کی روح فرسا تلخی و ناکامی بھی۔ یہ سچ ہے کہ انھوں نے اپنی بیشتر موثر غزلیں ایامِ اسیری میں کہی ہیں۔ ظاہر ہے ان کا ذہن اور ان کے جذبات جن دشواریوں اور تلخیوں سے گزرتے رہے ہوں گے ان کے لئے غزل ایسی لطیف اور نازک صنف میں طبع آزمائی کرنا نہایت دشوار رہا ہوگا۔ لیکن ان کی غزلوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ذاتی تجربات کی رفتار بہت تیز و تند تھی اس لیے ان کا اظہار بھی بہت پراثر اور شدید رہا۔ یہ فیض کی ہی شخصیت ہے کہ انھوں نے اپنے ذاتی تاثرات اور جذبات کو آفاقی اصولوں میں ڈھال دیا۔ اگرچہ ان کے لہجے میں درشتی اور تندی نہیں

لیکن یہ سچ ہے کہ ان کے گفتار میں تابانی اور درخشانی ہے۔ جس کے سبب سے ان کے کلام میں ایک دلکش اور دلنواز معصومیت کا احساس ہوتا ہے۔

چمن پہ غارتِ گلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

فیض سماج میں مروجہ طبقاتی کشمکش اور معاشی ناہمواری کے شدید مخالف نظر آتے ہیں اور غالباً یہی سبب ہے جس کی بناء پر وہ مارکسی نظریات کی طرف مائل ہوئے اور اس جنگ سرمایہ و محنت میں شریک ہوئے۔ ان کی شاعری ان کی شخصیت کی آئینہ دار ہے۔ بقول میجر محمد اسحاق۔

"ان کی شاعری میں ایک صاحبِ دل کا جوش اور ولولہ ہے اس میں پوری قوم کا دل دھڑک رہا ہے ان کی شاعری میں وطن کی محبت بھی ہے اور قوم کے لیے تڑپ بھی ہے[۱]۔"

ان کی غزلیں اپنے دور کے شانہ بہ شانہ چلتی ہیں اور رفتارِ زمانہ کے نقوش بھی ان کی غزلوں میں جھلکتے نظر آتے ہیں۔ مندرجہ ذیل غزل جو اگست ۱۹۵۲ء کے موقع پر لکھی گئی اس کی طرزِ ادا اور اس کا لب و لہجہ اس نکتہ کی

---

[۱] نسخہ ھائے وفا صفحہ ۲۸۸

غماز ہیں۔

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں
گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں
ہے دشت اب بھی دشت، مگر خونِ پا سے فیض
سیراب چند خارِ مغیلاں ہوئے تو ہیں

ان کی غزلوں میں صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے رومانیت اور عہدِ حاضر کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ موجودہ طبقاتی نظام کی خرابیوں کو اپنی شاعری کا محور بنایا۔ اس کے علاوہ انھوں نے حب الوطنی کو اپنا خاص موضوع بنایا۔

ہر منزلِ غربت پہ گماں ہوتا ہے گھر کا
بہلایا ہے ہر گام بہت در بدری نے
تھے بزم میں سب دودِ سرِ بزم سے شاداں
بیکار جلایا ہمیں روشن نظری نے

ان کے یہاں ابتدائی رومانویت کے بعد انقلابی رومانیت کا دائمی رنگ ملتا ہے کیونکہ انھوں نے اپنی بہ ظاہر رومانوی شاعری میں بھی زیادہ تر ماحول کی تلخیوں کو قلمبند کیا ہے۔

لب پر ہے تلخیٔ غمِ ایّام ورنہ فیض
ہم تلخیٔ کلام پہ مائل ذرا نہ تھے

ان کی رومانوی شاعری صرف ظاہری عشق و محبت کی داستان تک محدود نہیں بلکہ اس میں بھی مروجہ ماحول کے درد و داغ، ٹیس و کسک اور رنج و غم کے شدید جذبات کا اظہار ملتا ہے۔

ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گزرنے والے
ناصحو، پند گرو، راہگزر تو دیکھو
وہ تو وہ ہے، تمھیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوب نظر تو دیکھو
وہ جو اب چاک گریباں بھی نہیں کرتے ہیں
دیکھنے والو کبھی ان کا جگر تو دیکھو

فیض کی غزلیں روایات سے بھی رابطہ رکھتی ہیں لیکن پھر ان میں سماجی اور اجتماعی حالات کی اثر آفریں تصویر کشی بھی ہوتی ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر نصرت چودھری لکھتی ہیں۔

"فیض کی غزل بھی روایات سے منسلک ہونے کے باوجود جدت، تازہ کاری اور انفرادیت کا احساس دلاتی ہے۔ فیض کی غزلوں کی تعداد مختصر سہی تاہم اس مختصر سے مجموعہ غزل نے اردو کی غزلیہ روایت کو ایک نئی جہت عطا کی۔

نظیر صدیقی کا یہ خیال مہمل نظر آتا ہے" فیض کے ہاتھوں اردو غزل

کسی نئی بلندی تک نہیں پہنچتی" فیضؔ نے غزل کو نئے معنوی حیات سے آشنا کیا۔ اقبالؔ نے غزل کو اس کی داخلیت سے برقرار رکھتے ہوئے اپنے جوشیلے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور اردو غزل کو ایک توانا لہجے سے آشنا کیا۔ اسی طرح فیضؔ نے غزل کو اپنے سیاسی، سماجی اور اجتماعی تصورات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ انھوں نے یہ مشکل کام بڑی فن کارانہ چابک دستی سے انجام دیا۔ انھوں نے غزل کی ہیئت کو خوب مانجھا اسے صیقل کیا۔ یہاں تک کہ ان کی غزل خالص سونے کی طرح دمکتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کا کلام مقدار کے لحاظ سے وافر نہیں۔ لیکن اس سے ان کی قدر و قیمت کم نہیں ہوتی اس لیے کہ ادب اور شاعری میں مقدار سے نہیں بلکہ کیفیت کے لحاظ سے فن کار کی قدر و قیمت متعین ہوتی ہے[1]"

غرضیکہ فیضؔ کی غزلوں کے روایتی مضامین میں بھی نیا پن محسوس ہوتا ہے ان کے یہاں مایوسی کے بجائے حوصلہ مندی اور امید پروری اور سوز و گداز، خوش خلقی اور زندہ دلی ملتی ہے۔ کسی بھی طرح کا مضمون ہو ان کی گرم جوشی، ترنگ اور استقامت میں کمی نہیں آتی۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں اپنی قوت ارادی پر پورا پورا اعتماد تھا جس کی وجہ سے ان کے کلام میں جمال و جلال کی آمیزش نکھری ہوئی شکل میں نظر آتی ہے اور ان کا کلام متحرک علامتوں اور پیکروں کی داستان معلوم ہوتا ہے۔ جنھیں انھوں نے طرح طرح سے پیش کیا ہے۔

۱۔ فیضؔ کی شاعری ایک مطالعہ ڈاکٹر نصرت چودھری صفحہ ۱۲۶

بہ موسمِ گل گرچہ طرب خیز بہت ہے
احوالِ گل و لالہ غم انگیز بہت ہے
خوش دعوتِ یاراں بھی ہے یلغارِ عدو بھی
کیا کیجئے دل کا جو کم آمیز بہت ہے

کیوں مشعل دل فیض چھپاؤ تہ داماں !
بجھ جائے گی یوں بھی کہ ہوا تیز بہت ہے

ہم جانتے ہیں کہ فیض کی تربیت جس ماحول میں ہوئی وہ ادب کا روایتی ماحول تھا جس میں انھیں عربی اور فارسی کی تعلیم دی گئی البتہ اس کے ساتھ ساتھ وہ انگریزی ادب اور جدید ترین نظریات سے بھی متعارف ہوئے۔ اسی وجہ سے ہمیں ان کے کلام میں قدیم اور جدید دونوں رنگ کی آمیزش نظر آتی ہے۔ وہ موجودہ حالات کو اپنی شاعری میں قدیم روایتی اسلوب میں نہایت حسن و خوبی سے ادا کرتے ہیں یہی ان کی شاعری کی مقبولیت کا راز ہے غرضکہ ان کے علم و فضل، مشاہدات، مطالعہ، سرگزشت، عمیق نظری، انسان دوستی اور ہمدردی نے ان کی شاعری کو وہ کیفیت عطا کی جس کی مثال ملنا دشوار ہے۔ غالبًا اسی وجہ سے انھوں نے کہا۔

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

یہ محض خود ستائی اور تعلی نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے۔
اس طرح اپنی خامشی گونجی
گویا ہر سمت سے جواب آئے

فیضؔ نے ادب کو زندگی سے قریب لانے کے لئے ایسے موضوعات کو اپنی شاعری میں سمویا جنھیں اب تک کی اردو شاعری اس عمق کے ساتھ پیش کرنے سے نا آشنا تھی انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ عوام کی زندگی کتنے ہی پیچیدہ مرحلوں کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی شاعری میں اشاریت اور رمزیت کی بھی کارفرمائی ملتی ہے لیکن یہ مسائل کی پیشکش کی راہ میں حائل نہیں ہوتیں بلکہ معاون ہوتی ہیں۔ ان کے اشعار غم انگیز ہونے کے باوجود امید کا دامن نہیں چھوڑتے اور اصلیت سے دور نہیں ہوتے۔ ان میں وہ بے جا پیچیدگی اور ابہام نہیں جو ہمیں ان کے دوسرے ہم عصر شعراء کے یہاں نظر آتے ہیں۔ اسی لیے فیضؔ کا طرزِ بیاں بسا اوقات ہمیں سادہ صاف اور سلجھا ہوا نظر آتا ہے۔ دیکھیے عوام کو حرکت و عمل کی ترغیب کن سادہ الفاظ میں دیتے ہیں۔

کب تک اسے سینچو گے تمنائے ثمر میں
یہ صبر کا پودا تو نہ پھولا نہ پھلا ہے
ملتا ہے خراج اس کو تری نانِ جویں سے
ہر بادشہِ وقت ترے در کا گدا ہے

ان کی شاعری میں غم تخلیقی محرک ہے، غموں کا مقابلہ کرنے میں بھی زندگی سے ان کی توقعات کبھی کم نہیں ہوئیں اور نہ اپنی ذات پر اعتماد میں کمی آئی۔ وہ اپنی شاعری کو انتعاشِ غم کی دین بتاتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں گہرائی اور گیرائی پائی جاتی ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ انھوں نے غم کی عکاسی مکمل طور پر کی ہے۔ ان کا یہ غم ذاتی بھی ہے اور کائناتی بھی۔ مختصر یہ کہ ان کی غزلیں اپنے دور اور اپنے سماج کی آئینہ دار ہیں۔ ذیل کے اشعار سے اندازہ کیجئے۔

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
اسبابِ غمِ عشق بہم کرتے رہیں گے
ویرانیٔ دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے

باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا
رنگِ لب و رخسارِ صنم کرتے رہیں گے

ان جذبات کو ادا کرنے میں کبھی کبھی ان کی لے حزنیہ ہو جاتی ہے۔ کچھ بھی ہو فیض کے طرزِ ادا میں بے پناہ سپردگی، والہانہ ربودگی اور اپنے آپ کو مطلوب و مقصود میں کھو دینے کا انداز اور ہمیشہ اسے حاصل کرنے کی امید نظر آتی ہے۔ ان کی آواز اور ایک معنی کی آواز اور لے معلوم ہوتی ہے۔ انقلابی کا ولولہ اور للکار نہیں۔ فیض نے متوازن آہستہ اور پُر سوز لب و لہجہ میں اپنے تجربات اور جذبات کو ادا کیا ہے۔ دیکھئے کس مدھم سُر میں کہتے ہیں۔

نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

ان کی لے اور موسیقی دھیمی اور افسردہ ضرور ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ان کی خاص خوبی یہ ہے کہ ان کی موسیقی خیال اور الفاظ کی ہم آہنگی سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ اپنی موسیقیت کا استعمال خیال اور معانی کے لحاظ سے کرتے ہیں اسی لیے ان کی موسیقی میں تنوع پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ قید خانے کی تاریک راتوں کو بھی محبوب کے تصور سے منور کر دیتے ہیں۔

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں ہر روز نسیمِ صبحِ وطن
یادوں سے معطر آتی ہے اشکوں سے منور جاتی ہے

بزمِ خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا ہجر کی رات ڈھل گئی

یہی امید اور رجا ہے جس نے انھیں قید خانے میں بھی زندگی کے آثار بخشے جس سے وہ عزم و ارادہ پر نہ صرف قائم رہے بلکہ اسے لوگوں تک بھی پہنچایا یہی عزم اور ارادے کی پختگی ان کی غزلوں میں نمایاں ہے۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری میں ایک رجائی نقطۂ نظر ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ کسی بھی طرح کی زندگی کی کشمکش ظلم و استبداد کی شدت انھیں مایوس نہیں ہونے دیتی کیونکہ ان سب سے نبرد مندی کے لیے ان کے پاس عزم، ارادہ، جوش اور ولولہ ہے۔ یہی صفات ہیں جو ان کی شاعری کو زندۂ جاوید بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوئی ہیں۔

یہ ہاتھ سلامت ہیں جب تک، اس خوں میں حرارت ہے جبتک
اس دل میں صداقت ہے جب تک، اس نطق میں طاقت ہے جبتک

یہ شام و سحر یہ شمس و قمر، یہ اختر و کوکب اپنے ہیں
یہ لوح و قلم، یہ طبل و علم، یہ مال و حشم سب اپنے ہیں

فیض امید، رجا اور زندگی کے دلدادہ ہیں۔ حیران و پریشان کر دینے والی ساعتوں میں بھی وہ جلد ہی سنبھل جاتے ہیں۔ قید میں رہنے کے باوجود وہ اس سے باہر آنے کے بعد کی باتیں سوچتے رہتے ہیں۔

یہ سچ ہے اگر جذبات میں صداقت ہو خیالات میں پائداری اور استقامت ہو تو بڑی سے بڑی رکاوٹ بھی منزل مقصود تک پہنچنے میں حائل نہیں ہو سکتی فیض کے کلام سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں عزائم پر بھروسہ رہا ہے۔ جس کی وجہ سے جیل کی تاریک فضائیں اور صعوبتیں بھی انھیں اپنے مشن سے دور نہیں کر سکیں اور وہ نہایت پر سکون انداز میں کہتے رہے

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

دیکھئے ان کا لب و لہجہ کتنا نرم اور ملائم ہے۔ انتہا ہے ان کے لب و لہجے کی نرمی اس وقت بھی قائم رہتی ہے جب وہ سرفروشوں کو جان کی بازی لگانے کے لیے للکارتے ہیں۔

مشکل ہیں اگر حالات وہاں دل بیچ آئیں جاں دے آئیں
دل والو کوچۂ جاناں میں کیا ایسے بھی حالات نہیں
جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

فیض کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت احساس انتظار ہے جسے دست طلب کی سیاہی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ انتظار کبھی قید

وبند کبھی جلا وطنی اور کبھی غریب الوطنی کے لمبے ادوار سے دوچار ہوا ہے لیکن فیض نے کبھی امید اور رجا کا دامن نہیں چھوڑا ان کی غزلوں میں ہمیشہ کیفیت انتظار موجزن نظر آتی ہے۔

روش روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم، بہار کا موسم
خوشا نظارۂ رخسار یار کی ساعت
خوشا قرار دل بے قرار کا موسم

حسرت دید میں گزراں ہیں زمانے کب سے
دشت امید میں گرداں ہیں دوانے کب سے

غرضکہ جلا وطنی کے دنوں میں بھی فیض نے اپنے عزم عشق کے ساتھ قوم اور وطن کی جفا کی جو نظیر پیش کی ہے وہ ہمیشہ آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ بنے گی۔ دیار یار سے محبت کی بات دکنی لہجے میں بھی یوں ظاہر ہوتی ہے۔

کچھ پہلے ان آنکھوں آگے کیا کیا نہ نظارہ گزرے تھا
کیا روشن ہو جاتی تھی گلی جب یار ہمارا گزرے تھا
تھے کتنے اچھے لوگ کہ جن کو اپنے غم سے فرصت تھی
سب پوچھیں تھے احوال جو کوئی درد کا مارا گزرے تھا

اب تو ہاتھ سجھائی نہ دیوے، لیکن اب سے پہلے تو
آنکھ اٹھتے ہی ایک نظر میں عالم سارا گزرے تھا

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں فیض کے کلام سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے سامنے ایک پیام ہے، ایک نصب العین ہے جسے وہ اپنے اشعار کے ذریعہ لوگوں کو دینا چاہتے ہیں اسی وجہ سے وہ شاید زبان کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دے سکے، اسے بت نہیں مان سکے جس کی پرستش کی جائے اس بناء پر لوگوں کو ان کی زبان میں کہیں کہیں خامیاں نظر آتی ہیں۔ اگرچہ اردو شاعری میں صحت زبان کو ایک اہمیت حاصل ہے۔ لیکن فیض نے مقصدیت کو اہم جانا اور زبان کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔ اسی وجہ سے کچھ ناقدین ان کی زبان میں خامیاں ڈھونڈھتے ہیں۔ یہ ان کی بہت بڑی بھول ہے۔ کیونکہ وہ مغز کو نہیں دیکھتے صرف ان کی نظر گوشت و پوست تک ہی محدود ہے۔ سچ یہ ہے کہ فیض کی خامیاں، ان کے پیغام کے سامنے ایسی ہی ہیں جیسے سورج کے سامنے آئینہ یا ٹمٹماتا چراغ۔

غرض کہنے کی یہ ہے کہ مقصدی شاعری کی پوری تاریخ میں وہ منفرد حیثیت کے حامل ہیں کیونکہ ان کا کینوس بہت وسیع ہے، قوالی کے انداز کی غزل سے لے کر بڑے سے بڑے واقعات عالم کو امکانی حد تک گرفت میں لانے والی شعر گوئی و غزل گوئی تک انھوں نے ماضی اور حال کو مستقبل سے

منسلک کرنے کے لئے بھی کچھ نئے تجربات کیے ان تجربوں میں نمایاں حیثیت ان کی تمثالیت کی ہے۔ اردو میں تمثالیت کا دائرہ بہت محدود ہے لیکن فیض کی تمثالیت میں وسعت اور جان پائی جاتی ہے۔ ان کی علامات گنجلک اور پُر تصنع نہیں ہوتے بلکہ وہ شعر میں نئی معنویت پیدا کرتی ہیں۔

گرمیٔ شوق نظارہ کا اثر تو دیکھو
گل کھلے جاتے ہیں وہ سایۂ در تو دیکھو

رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسمِ گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام
دوستو، اس چشمِ ولب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے، نہ میخانے کا نام
پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصوّر نے لیا اس بزم میں جانے کا نام

شامِ فراق، اب نہ پوچھ، آئی اور آکے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا، جاں تھی کہ پھر سنبھل گئی

بزمِ خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی

فیض کی شاعری میں دستِ صبا، سرو و صنوبر، موسمِ گل، گلشن، شام و سحر، رخسار، سحر، شفق، شمس و قمر اور فضا کا ذکر اکثر و بیشتر پایا جاتا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی شکل میں فطرت کے حسین اور دلکش مناظر اور پہلوؤں سے وابستہ رہے ان کی شخصیت فطرت کی رعنائیوں اور خوبصورتیوں کو جذب کر لیتی ہیں۔ اسی وجہ سے وہ فطرت کے بدلتے ہوئے رنگوں اور بدلتے ہوئے موسموں کے دلدادہ نظر آتے ہیں۔ غرضکہ فیض کو مناظرِ فطرت سے گہرا تعلق تھا۔

ماضی میں جو مزا مری شام و سحر میں تھا
اب وہ فقط تصورِ شام و سحر میں ہے

پھر لوٹا ہے خورشیدِ جہانتاب سفر سے
پھر نورِ سحر دست و گریباں ہے سحر سے

خوشا نظارۂ رخسارِ یار کی ساعت
خوشا قرارِ دلِ بے قرار کا موسم

صبا کی مست خرامی تہِ کمند نہیں
اسیرِ دام نہیں ہے بہار کا موسم

صبا نے پھر درِ زنداں پہ آ کے دی دستک
سحر قریب ہے، دل سے کہو نہ گھبرائے

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

یوں سجا چاند کہ جھلکا ترے انداز کا رنگ
یوں فضا مہکی کہ بدلا مرے ہمراز کا رنگ

اکثر و بیشتر نکات کی نشاندہی اور تفصیلی گفتگو ان کے شعری مجموعوں کے زیرِ بحث آ چکی ہے۔ اجمالاً یہاں فیض کی لغوی اور معنوی خوبیوں کا سرسری جائزہ لیا گیا تاکہ ان کی انفرادیت اور ان کا مقام غزل تعین کرنے میں کسی قسم کا ابہام نہ رہے۔ تفصیل کو ترک کر کے اب میں ان کے چند شعری نکات، اسلوب اور طرزِ ادا پر گفتگو کرنا چاہوں گا اس سلسلے میں بھی ضمنی طور پر زیادہ تر باتیں آ چکی ہیں۔ پھر بھی کچھ پہلوؤں کی نشاندہی لازمی ہے۔

فیض کے اسلوب و بیان کی خصوصیات تازگی ندرت اور توانائی ہے۔ ان کے یہاں گہرے خیالات کے باوجود تراکیب اور بندشوں میں نہایت سادگی اور روانی موجود ہے۔ شاعری میں ضبط و توازن لازمی ہوتا ہے تاکہ ہیئت کی تخلیقی وحدت رونما ہو جو بلاغت کی جان ہے۔ شعر کا سارا طلسم اسی پر منحصر ہے یہ لفظ اور معانی دونوں پر حاوی ہے۔ شعر میں لفظ اور معانی کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان دونوں سے بیک وقت متاثر ہوا جاتا ہے فیض معانی اور بیان دونوں میں مہارت رکھتے ہیں جس کا اظہار ان کی مختلف اوزان سے ہوتا ہے۔

فیض کی غزلوں کی زمین شگفتہ بحر مترنم اور لب و لہجہ نہایت نرم ہوتا ہے۔ ان کے تخیل کی شادابی اور طبیعت کی شیرینی نے ان کی شاعری کو بھی شاداب اور شیریں بنا دیا۔ ان کے یہاں زندگی کی تلخی ضرور پائی جاتی ہے لیکن تلخ گفتاری بالکل نہیں۔ مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فیض کی غزلیں ان کی بلندیٔ فکر، وسعت مطالعہ اور مشاہدہ کی آئینہ دار ہیں۔

فیض کی غزلوں میں طنزیہ وصف بھی نمایاں ہے انھوں نے طنزیہ اشعار نہایت خوبصورتی اور فنکاری سے نظم کیے ہیں کہتے ہیں۔

برس رہی ہے حریم ہوس میں دولت حسن
گدائے عشق کے کاسے میں اک نظر بھی نہیں

فقیہہ شہر سے مے کا جواز کیا پوچھیں
کہ چاندنی کو بھی حضرت حرام کہتے ہیں

کچھ محتسبوں کی خلوت میں، کچھ واعظ کے گھر جاتی ہے
ہم بادہ کشوں کے حصّے کی، اب جام میں کمتر جاتی ہے
بیداد گروں کی بستی ہے یاں داد کہاں خیرات کہاں
سر پھوڑتی پھرتی ہے ناداں فریاد جو در در جاتی ہے

فیض نے قدیم استعارات اور کنایات کو جدید انداز میں استعمال کر کے ان کے معنی میں تبدیلی پیدا کر دی ہے جس کی وجہ سے ان کے اسلوب بیان اور لہجے میں قدامت کے باوجود جدیدیت کا احساس ہوتا ہے۔

دست صیاد بھی عاجز، ہے کفِ گلچیں بھی
بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

جنوں کی یاد مناؤ کہ جشن کا دن ہے
صلیب و دار سجاؤ کہ جشن کا دن ہے

تو سنی گئی ہماری، یوں پھرے ہیں دن کہ پھر سے
وہی گوشۂ قفس ہے، وہی فصلِ گل کا ماتم

فیض نے تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال زندگی کی رفتار کے ساتھ کیا ہے۔ ان کی سب سے بڑی کامیابی اور خصوصیت ہے استعارات اور کنایات کی جادوگری، ان کی یہ خصوصیات انداز بیان میں اتنا ساتھ دیتی ہیں کہ خارجی اور داخلی احساس ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ مثلاً

ان کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں

کوئی پکارو کہ اک عمر ہونے آئی ہے
فلک کو قافلہ روز و شام ٹھہرائے

رنگ و خوشبو کے حسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے
تو لوٹ آئے ترے سربلند، کیا کرتے!

فیض نے تشبیہات سے زیادہ استعارات سے کام لیا ہے روایتی استعاروں اور پرانی فرسودہ تشبیہوں کی جگہ فیض کے کلام میں اظہار و خیال

کے نئے سانچے نئے انداز کے ساتھ جلوہ گر ہیں جس میں ایک خاص قسم کے شکوہ، جزالت، بلند آہنگی بھی پائی جاتی ہے۔ جس سے ان کی غزلوں اور نظموں میں ایک خاص قسم کی نغمگی پیدا ہو جاتی ہے۔

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے سحراؤں میں ہولے سے چلے باد نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

یہ جفائے غم کا چارہ وہ نجات دل کا عالم
ترا حسن دست عیسیٰ تری یاد روئے مریم

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شب سست موج کا ساحل

آخر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فیض نے اپنی غزلوں میں نظموں کے مقابلے میں داشگاف انداز اپنانے کے برعکس غزل کے کلاسیکی رنگ و آہنگ اور مخصوص طرزِ ادا کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے جس سے معنی میں تہ داری پیدا ہو گئی ہے اور یہ انداز غیر شعوری طور پر نمایاں ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ روز بروز نمایاں تر ہوتا گیا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ دستِ صبا کی غزلوں سے یہ بات شروع ہوتی ہے اور بعد کے کلام میں تو شدید انداز اختیار کر لی جاتی ہے۔ ان کی غزلوں میں بھی ان کی اولوالعزمی اور جگرداری ایک روشن اور تابناک مستقبل کو آواز دیتی ہے۔ عوام کو اس کی طرف بلاتی ہے قید و بند سے ان کی جو آواز ہم تک پہنچی ہے اس میں حسرت و یاس، سوز و درد کی کیفیات تو وہی ہیں جنھیں ان کی شاعری کے اساسی اور علامتی عناصر میں شمار کیا جا سکتا ہے لیکن ان میں فیض کا مجاہدانہ اور تہورانہ انداز نمایاں ہے۔ یہ سچ ہے کہ فکر و خیال میں جب تک خونِ جگر اور جذبۂ حقیقی کی آمیزش نہیں ہوتی شعر نہیں بن پاتا۔ یہ بات محض شاعری تک محدود نہیں بلکہ ہر فنِ لطیف کے لیے فن کار کو خونِ جگر کی آمیزش کرنی پڑتی ہے۔ فیض کے کلام میں ہم خونِ جگر کی آمیزش ہر جگہ پاتے ہیں۔ غزل کے دیگر اہم موضوعات میں وارداتِ عشق کا بیان، عشق میں سوز و گداز کا ذکر، معاملہ بندی، سرخوشی اور سرمستی کا اظہار، جوشِ جنوں کا بیان اور حالاتِ حاضرہ کا شعور و ادراک موجودہ سیاسی نظام پر تبصرہ اور تنقید ایسے موضوعات ہیں جنھیں فیض نے نہایت مہارت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

ان کے یہاں ہر چیز کی تصویر کشی حقیقت پسندی پر مبنی نظر آتی ہے۔ اپنے افکارِ عالیہ کو ادا کرنے کے لیے فیض نے بہت کچھ کیا انھوں نے مشرقی اور مغربی علوم کا عمیق مطالعہ کیا اور اردو شاعری کی ان روایتوں سے حتی المقدور استفادہ کیا جس کا خیر مقدم اردو ادب کے مختلف ادوار میں ہوتا رہا۔ غرضکہ فیض کی شاعری مغربیت اور مشرقیت کی اعلیٰ قدروں کا ایک حسین امتزاج ہے جس نے ان کی شاعری کو اتنی جلا بخشی۔ بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی۔

"فیض جیسا کہ سب جانتے ہیں اول سے آخر تک اشتراکی ہیں۔ لیکن غزل کا مزاج و مقام جیسا فیض نے پہچانا ہے ان کے دوسرے ساتھیوں نے نہیں پہچانا۔ فیض کی غزلوں کے مطالعہ سے اکثر یہ محسوس ہوا ہے کہ جیسے شعر کہتے وقت وہ ترقی پسندی اور اشتراکیت کی آداکش خم کاکل میں اتنے منہمک نہ ہوں جتنے اندیشہائے دور دراز میں غالب اور اقبال کا احترام پیش نظر رکھتے ہیں۔"[1]

صحیح ہے فیض نے کورانہ تقلید اور تجددانہ انداز سے دامن بچاکر اپنے کلام کو عظمت، بلندی اور جلا بخشی۔ انھوں نے روایتی دبستانوں کے محض ان صحت مند عناصر کو اپنے کلام میں جذب کیا ہے جو ان کے موضوع

---

[1] افکار کراچی ۱۹۶۵ء فیض نمبر صفحہ ۵۲۱

اور اسلوب دونوں سے مکمل طور پر مطابقت رکھتے ہیں۔ حقیقت میں شاعر کے لیے یہ مرحلہ بڑا دشوار گزار ہوتا ہے لیکن فیض اس مرحلے سے نہایت کامیابی کے ساتھ گزرے ہیں۔ انھیں مندرجہ بالا اوصاف کی بناء پر ان کی غزلیں جہاں موسوقیت کے اعلیٰ معیار پر پوری اترتی ہیں وہاں معانی کے اعتبار سے بھی لاثانی اور بے مثال ہیں ان کی غزلیں وسیع معانی اور عمیق مطالب کی حامل ہوتی ہیں غرضکہ ان کی غزلیں زبان و بیان اور معانی کے اعتبار سے ان کے معاصرین پر فوقیت رکھتی ہیں۔ ان میں غضب کی دلکشی اور روانی پائی جاتی ہے جن کے وجد آفریں ترنم اور کیف زا نغموں سے قاری بغیر متاثر ہوئے نہیں رہ سکتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا موسیقی کا بحرِ ذخّار ہے جو ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ انھیں خصوصیات کی بناء پر ان کی غزلیں دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی جاتی ہیں

حاصل کلام یہ کہ فیض کی غزلیں علوئے تخیل، پاکئ مضمون، صفائی تراکیب، خوبیٔ استعارات، موزونیٔ مطالب و معانی، برجستگی تلمیحات و تمثیلات نغمگی و آہنگ اور جوشِ بیان کے اعتبار سے تمام شاعرانہ کمالات کی حامل ہیں جن کی بناء پر فیض کو ایسی انفرادیت و آفاقیت نصیب ہوئی کہ وہ بجا طور پر شہرتِ عام و بقائے دوام کے حقدار رہیں گے۔

منابع و مآخذ

۱- ہم کہ ٹھہرے اجنبی	ڈاکٹر ایوب مرزا	راولپنڈی
۲- عمر گذشتہ کی کتاب	مرزا ظفر الحسن	حیدرآباد
۳- صلیبیں مرے دریچے میں	فیض احمد فیض	دہلی
۴- اردو میں ترقی پسند تحریک	ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی	علی گڑھ
۵- روشنائی	سجاد ظہیر	دہلی
۶- اردو غزل کی نشو و نما	ڈاکٹر رفیق حسین	الہ آباد
۷- غزل اور مطالعہ غزل	ڈاکٹر عبادت بریلوی	علی گڑھ
۸- ہماری شاعری	سید مسعود حسن رضوی	
۹- مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	الہ آباد
۱۰- اردو شاعری اور مسائل زمانہ	ڈاکٹر ظل حسنین	الہ آباد
۱۱- خونِ دل کی کشید	مرتبہ مرزا ظفر الحسن	کراچی
۱۲- اردو کی عشقیہ شاعری	فراق گورکھپوری	الہ آباد
۱۳- تصوراتِ اقبال	مولانا صلاح الدین احمد	علی گڑھ
۱۴- فیض ایک جائزہ	اشفاق حسین	دہلی
۱۵- جدید اردو شاعری	ڈاکٹر عبادت بریلوی	دہلی
۱۶- فیض احمد فیض	کے کے کھلر	دہلی
۱۷- اردو شاعری کا مزاج	ڈاکٹر وزیر آغا	لاہور
۱۸- نقشِ فریادی	فیض احمد فیض	ہندوستانی و پاکستانی ایڈیشن

۱۹۔	دستِ صبا	فیض احمد فیضؔ	ہندوستانی و پاکستانی ایڈیشن
۲۰	زنداں نامہ	فیض احمد فیضؔ	ہندوستانی و پاکستانی ایڈیشن
۲۱ ۔	دستِ تہِ سنگ	فیض احمد فیضؔ	ہندوستانی و پاکستانی ایڈیشن
۲۲۔	سروادیٔ سینا	فیض احمد فیضؔ	ہندوستانی و پاکستانی ایڈیشن
۲۳۔	شامِ شہرِ یاراں	فیض احمد فیضؔ	ہندوستانی و پاکستانی ایڈیشن
۲۴۔	مرے دل مرے مسافر	فیض احمد فیضؔ	ہندوستانی و پاکستانی ایڈیشن
۲۵۔	نسخہ ہائے وفا	فیض احمد فیضؔ	دہلی و لاہور
۲۶۔	زندگی و ادب	ڈاکٹر ظلّ حسنین	الہ آباد
۲۷۔	اشاریۂ کلام فیضؔ	ڈاکٹر معین الدین عقیل	دہلی
۲۸۔	فیضؔ کی شاعری ایک مطالعہ	ڈاکٹر نصرت چودھری	سری نگر کشمیر
۲۹۔	متاعِ لوح و قلم	فیض احمد فیضؔ	کراچی
۳۰۔	میزان	فیض احمد فیضؔ	اردو اکادمی مغربی بنگال
۳۱۔	نقدِ فیضؔ	مرتبہ نسیم عباسی	دہلی
۳۲۔	اقبال فن اور فلسفہ	نورالحسن نقوی	علی گڈھ
۳۳	کلیاتِ اقبالؔ	علامہ اقبالؔ	دہلی
۳۴	متاعِ سخن (انتخاب کلام شعراء)	ڈاکٹر عبدالحق	دہلی
۳۵	اقبالؔ کے ابتدائی افکار	ڈاکٹر عبدالحق	
۳۶	اردو غزل	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	علی گڈھ

۳۷۔	اردو غزل	مرتبہ ڈاکٹر کامل قریشی	اردو اکاڈمی دہلی
۳۸۔	اقبال شاعر اور فلسفی	سید وقار عظیم	علی گڑھ
۳۹۔	دیوانِ غالب	غالب	الہ آباد
۴۰	مجاز حیات اور شاعری	منظر سلیم	لکھنؤ
۴۱	جمہوری سوشلزم	اشوک مہتہ	جالندھر
۴۲	لانگ مارچ کا مقدمہ	تجمل حسین تجمل	بنگلہ دیش
۴۳	ادب کی تلاش	بلراج کومل	لکھنؤ
۴۴	غزل کے نئے جہات	پروفیسر سید محمد عقیل	
۴۵	مختصر تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر اعجاز حسین	
۴۶	ورق ورق	فیض احمد فیض	دہلی
۴۷	گلِ نغمہ	فراق گورکھپوری	الہ آباد
۴۸	مہ و سالِ آشنائی	فیض احمد فیض	کراچی
۴۹	کلیات آتش	آتش	الہ آباد
۵۰	شعلہ و شبنم	جوش ملیح آبادی	دہلی
۵۱	داغ دہلوی حیات اور کارنامے	ڈاکٹر کامل قریشی	اردو اکاڈمی دہلی
۵۲	آتشِ گل	جگر مرادآبادی	دہلی
۵۳	انتخاب کلام میر	بابائے اردو مولوی عبدالحق	دہلی
۵۴	انتخاب جذبی	جذبی	دہلی

۵۵ -	نئی دنیا کو سلام اور جمہور	سردار جعفری	دہلی
۵۶ -	ہوا کے دوش پر	غلام ربانی تاباں	دہلی
۵۷	افادی ادب	اختر انصاری	دہلی
۵۸	تاریخ زبان اردو	ڈاکٹر مسعود حسین	علی گڑھ
۵۹	ادبی تنقید	ڈاکٹر محمد حسن	لکھنؤ
۶۰	تنقیدی اشارے	آل احمد سرور	لکھنؤ
۶۱	جدید غزل	رشید احمد صدیقی	علی گڑھ
۶۲	اردو شاعری میں نرگسیت	ڈاکٹر سلام سندیلوی	لکھنؤ
۶۳	اقبال کے شعری اسالیب	ڈاکٹر عبدالحق	
۶۴	اقبال کی فکری سرگزشت	ڈاکٹر عبدالحق	
۶۵	دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر (عہد میر تک)	پروفیسر محمد حسن	اردو اکاڈمی دہلی
۶۶	ادبی سماجیات	ڈاکٹر محمد حسن	دہلی
۶۷	فیض احمد فیض عکس اور جہتیں	مرتبہ شاہد ماہلی	لاہور
۶۸	فیض کی شاعری کا نیا دور	عبدالرؤف ملک	لاہور
۶۹	انقلابی شاعر فیض احمد فیض	وصی احمد سندیلوی	لکھنؤ
۷۰	نظم جدید کی کروٹیں	ڈاکٹر وزیر آغا	لاہور
۷۱	فیض کی تخلیقی شخصیت	ڈاکٹر طاہر تونسوی	لاہور

۷۲	غزل انسائیکلو پیڈیا	ڈاکٹر ذکی کاکوروی	لکھنؤ
۷۳	ساحر لدھیانوی ایک مطالعہ	مخمور سعیدی	دہلی
۷۴	معنویت کی تلاش	ڈاکٹر عنوان چشتی	مظفر نگر
۷۵	غزل مجروح	مجروح سلطانپوری	حیدرآباد
۷۶	تلخیاں	ساحر لدھیانوی	دہلی
۷۷	لہو پکارتا ہے	سردار جعفری	دہلی
۷۸	ترقی پسند ادب	علی سردار جعفری	علی گڑھ
۷۹	ادب اور نظریہ	پروفیسر آل احمد سرور	
۸۰	فیضان فیض	ابوسعید قریشی	کراچی
۸۱	فیض شاعر اور سیاست	فتح محمد ملک	لاہور
۸۲	تنقیدی جائزے	احتشام حسین	الٰہ آباد
۸۳	فیض احمد فیض تنقیدی جائزہ	مرتبہ خلیق انجم	دہلی
۸۴	برٹش کالین بھارت	جے۔ پی۔ سنہا	میرٹھ
۸۵	اردو غزل کے پچاس سال	عبدالاحد خاں خلیل	لکھنؤ

رسائل

۱۔ افکار ۱۹۶۵ء فیض نمبر کراچی

۲۔ فن اور شخصیت ۱۹۸۱ء فیض نمبر بمبئی

۳۔ شبستاں فیض نمبر دہلی

۴۔ امنگ ۱۹۸۵ء فیض احمد فیض نمبر کراچی

۵۔ آجکل فروری ۱۹۶۱ء دہلی

۶۔ ماہنامہ نئی قدریں شاعر نمبر حیدرآباد

۷۔ اردو ادب ۱۹۸۵ء فیض نمبر دہلی

۸۔ کمیونسٹ جائزہ نومبر ۱۹۸۷ء دہلی

۹۔ کتاب نما خصوصی شمارہ علی سردار جعفری نمبر دہلی

۱۰۔ نیا دور مئی ۱۹۸۵ء لکھنؤ

اخبارات

۱۔	روزنامہ جنگ	۲۱ر نومبر ۱۹۸۴ء	کراچی
۲۔	حیات ہفت روزہ	۲۵ر نومبر ۱۹۸۴ء	دہلی
۳۔	حیات ہفت روزہ	۱۶ر دسمبر ۱۹۸۴ء	دہلی
۴۔	حیات ہفت روزہ	۶۔ جنوری ۱۹۸۴ء	دہلی
۵۔	ہماری زبان ہفت روزہ	۸ر دسمبر ۱۹۸۴ء	دہلی
۶۔	قومی آواز ہفت روزہ	۲۵ر نومبر ۱۹۸۴ء	دہلی
۷۔	قومی آواز ہفت روزہ	۲۲ر ستمبر ۱۹۸۵ء	دہلی
۸۔	حیات ہفت روزہ	۳۰ر دسمبر ۱۹۸۴ء	دہلی
۹۔	نئی دنیا ہفت روزہ	۴ر تا ۱۰ر دسمبر ۱۹۸۴ء	دہلی
۱۰۔	حیات ہفت روزہ	۱۰ر مارچ ۱۹۸۵ء	دہلی